

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

مقامی اور دور دورہ شہزادوں کی کہانیوں کا مجموعہ

Online Library For Pakistan

پاک سوسائٹی

DECEMBER 2015

پاک سوسائٹی
ماہنامہ

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماڈل: فریما
میک اپ: روز بیگم پاپار
فوٹو گرافی: موسیٰ رضا

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY

رداء الجسد

چیف ایڈیٹر

مسالک محمود

ایڈیٹرز
سعدی محمود جعفری
مآخذہ امریکہ، قراچہ جعفری
E-Mail: msajid@001.com
مآخذہ UAE، عمیر علی جعفری
Mail: saqrsh@emirates.net.ae
مآخذہ لندن، شبانہ آصف چوہان



READING
Section

سلسلے وار ناول

- تجھ سے مانگو میں تجھ کو شازیہ مصطفیٰ ۱۰
جو عشق میں بیٹی و عشق ہی جانے نائلہ طارق ۱۸۶
چل اڑ جا اب تیری باری عائشہ ذوالفقار ۱۰۸

افسانے

- دسمبر کا چاند نوشین طاہر ۸۰
دسمبر کی یہ آخری رات ماریہ یاسر ۱۸۳
دسمبر کا موسم مہرین کنول ۹۸
بچت گیتی آراء ۱۰۳
لہو کو ہمارے بھول مت جانا اسماء فاروق ۱۵۰
چیون پہیلی شمینہ فیاض ۱۶۰
پھر دل مل گئے عائشہ حمد ۱۶۸
نیلی آنکھوں والی گڑیا کائنات غزل ۱۷۶
سو دو زیاں کا حساب قرۃ العین سکندر ۱۸۰

مکمل ناول

- اس مٹی کا قرض آسید مظہر چوہدری ۲۸
تقدیر نہیں تابع منطق فریدہ فرید ۱۲۲

ناولٹ

- ایسا بھی ہوتا ہے تمہیں بانو ۶۰

ذریعہ سالانہ بذریعہ رجسٹری

720 روپے

34535726

دسمبر 2015ء

جلد نمبر 20 شمارہ نمبر 12

قیمت 60 روپے

انتباہ:-

ادارہ "ردا" ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل یا ادارہ ذرائع کی تکمیل اور سلسلے وار کسی بھی ناول کی اشاعت پر ادارہ چوہدری کی ایف آئی آر درج کرادے گا اس لئے پبلشر سے اجازت لینا ضروری ہے ادارہ "ردا" پبلیکیشن۔

READING
Section

مستقل سلسلے

۲۱۳	صالحہ محمود	۷	سندیے	صالحہ محمود	ردائے جنت
۲۲۲	ثریا اقبال	۱۹۸	کچن	صدف سعد	ردا کی ڈائری
۲۲۵	شہلا مشائق	۲۰۸	سنگھار	شہلا مشائق	ذرا پھر سے کہنا
۲۰۰	نورین ملک	۲۰۵	اشعار	نورین ملک	خوشبو
۲۱۹	ادارہ	۲۰۲	دوستوں کے نام پیغام	نورین ملک	اس ماہ میں



READING
Section



اللہ کی عطا کردہ سردراتیں زندگی میں حسن اور خمار بھرتی ہیں وہیں غریبوں کے تن ڈھانپنے کے لیے چند گز کپڑا بھی ضروری ہوتا ہے۔ بارش میں بھگتے ہوئے ہم سوچتے تھے تمام عمر بارش برستی رہے اور ہم بھگتے رہیں۔ وہیں شعور آگہی کے پہلے در پر ہوش آیا تو یکھا تین ہٹی کے نیچے کئی انسان پانی میں ڈوب کر مر گئے کھلی قبروں کو قبرستان میں دیکھ کر لرزا اٹھی تو لب بول اٹھے۔

یارب! رک جائے یہ بارش

قرب و جوار میں میری ماں بھی سوتی ہے

یقیناً زندگی کا حسن سردراتوں میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔ شاید ہم ایسا محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے شدید گرمیوں کے بعد ایک دو ماہ کے لیے سردی میسر آئے تو ہم خوش ہو گئے۔ خوش ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ کی اور بہت نعمتیں ہیں۔ یوں تو اللہ کے عطا کردہ دن اور رات کیا شجر و شاخ گل سبھی سر بچود ہوتے ہیں۔ اس کائنات میں رب نے طلسم کا ایک ہجوم پھیلا رکھا ہے۔ سمندر، دریا اور تالاب، شجر و شاخ، بوٹے، ستارے بھرے آسمانوں پر جگمگاتے چاند تارے کہیں کوئی کجی نہیں۔ بس کجی ہے تو ہمارے دلوں میں کہ ہم اپنے رب کے بتائے ہوئے رستے سے بھٹک گئے ہیں اور بھٹکنے والا انسان نابینا ہے۔ نابینا وہی شخص ہے جو اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دیانت اور امانت ہماری نمایاں خصوصیت ہونی چاہیے۔ ایک سچا مسلمان اتنا قابل اعتماد ہو کہ دشمن بھی اس کی سچائی ایمانداری پر رشک کرے۔ اللہ کی نعمتوں کا شکر بجالانا اتنا ہی ضروری ہے جتنا زندہ رہنے کے لیے سانس لینا، اللہ کے بتائے ہوئے رستے پر چلنا ہماری زندگی کے لیے بے حد اہم ہے۔ میں ایک بات پھر ذاتی طور پر بتاتی چلوں۔ کینہ، حرص، حسد، بغض، عداوت گھروں کے اندر آپس کی چھیڑ چھاڑ، طنز، ساس، نندوں کے آپس میں اختلافات، حادثات کے سبب بنتے ہیں اور بڑھتی ہوئی عمر کی خواتین کے لیے جسمانی طور پر کوئی مہلک مرض شدت اختیار کر لیتا ہے۔ دل کو صاف رکھیے ذہن کشادہ رکھیے۔ آپ کا جسم پرسکون رہے گا۔ ہر وقت آپس کی رنجش ذہن اور دل کو متاثر کرتی ہے۔

دسمبر بھری مجلسیں اور شامیں لکھنے کے لیے بہت موزوں ہیں۔ لہذا آپ سب اچھے اچھے موضوعات پر لکھیں۔ رداسال آخر نمبر ہے۔ یقیناً ایک دن سال نو نمبر بھی آئے گا۔ اس حوالے سے آپ سب نئے سال کا استقبال کریں۔ اچھا سوچیں اچھا ہوگا۔ نئے لکھنے والے رداسے اپنا رابطہ رکھیں رداسب کا ہے۔

آپی

حکومت اور فیصلوں کا بیان

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں تمہیں 5 باتوں کا حکم دیتا ہوں۔ (1) جماعت کو لازم پکڑنا۔ (2) امیر کی بات سنا (3) امیر کی اطاعت کرنا (4) ہجرت کرنا (5) جہاد فی سبیل اللہ کرنا۔ بلاشبہ جو آدمی جماعت سے ایک بالشت کے برابر دور ہو اس نے اسلام کا حکم ماننے سے انکار کیا مگر یہ کہ وہ جماعت میں واپس آجائے اور جس آدمی نے جاہلیت کا نعرہ بلند کیا، اس کا شمار دوزخیوں میں ہوگا۔ اگرچہ وہ روزے رکھے، نمازیں ادا کرے اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے۔“ (ترمذی۔ عن حارث اشعری)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب کسی مخلوق (امیر/حاکم) کے حکم سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو رہی ہو تو اس کی اطاعت نہ کی جائے۔“ (شرح السنہ۔ عن نواس بن سمعان)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص کسی 10 آدمیوں کا بھی امیر مقرر کیا گیا تو اسے قیامت کے دن گلے میں زنجیر ڈال کر لایا جائے گا۔ پھر یا تو اس کا عدل اسے زنجیروں سے نجات دلائے گا یا اس کا ظلم اسے تباہ و برباد کر دے گا۔“ (دارمی۔ عن ابی ہریرہ)

(وضاحت: یعنی امیر کو عدل و انصاف سے

کام کرنا چاہیے اپنی امارت میں کسی پر ظلم نہ ہونے دے اور نہ ہی خود کسی پر ظلم کرے)۔

میرے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کرتے ہوئے فرمایا: ”میں تمہیں بے وقوفوں کی امارت سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں دیتا ہوں۔“ میں نے پوچھا۔ ”وہ کیا ہے؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میرے بعد امراء ہوں گے جو لوگ ان کے پاس گئے اور ان کی جھوٹی باتوں کو بھی سچا کہا اور ان کے ظلم کرنے میں ان کا ہاتھ بٹایا اور ان کے ظلم کے باوجود ان کی مدد کی تو وہ مجھ سے نہیں ہیں اور میں ان سے نہیں ہوں اور نہ ہی وہ میرے حوض کوثر پر آئیں گے اور جو لوگ ان کے پاس نہیں گئے اور ان کی جھوٹی باتوں کو بھی سچا کہا اور ان کے ظلم کرنے میں ان کا ہاتھ بٹایا اور ان کے ظلم کے باوجود ان کی مدد کی تو وہ مجھ سے نہیں ہیں اور میں ان سے نہیں ہوں اور نہ ہی وہ میرے حوض کوثر پر آئیں گے اور جو لوگ ان کے پاس نہیں گئے اور نہ ان کی جھوٹی باتوں کو سچا کہا اور نہ ان کے ظلم پر ان کی مدد کی، پس ایسے لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں اور یہ لوگ میرے حوض کوثر پر آئیں گے۔“ (ترمذی، نسائی۔ عن کعب بن عجرہ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”افضل جہاد اس آدمی کا ہے جو ظالم بادشاہ کے

سامنے سچی بات کہے۔“ (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ۔ عن ابی سعید خدری)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”جب اللہ تعالیٰ کسی حاکم کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو سچ بولنے والا وزیر عطا کرتے ہیں۔ اگر حاکم بھولتا ہے تو وہ یاد کرا دیتا ہے اور اگر اسے یاد ہوتا ہے تو وہ اس کی مدد کرتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ نہیں فرماتے تو اس کے لیے برا وزیر مہیا فرماتے ہیں اگر وہ بھولتا ہے تو اسے یاد نہیں دلاتا اور اگر اسے یاد ہوتا ہے تو بھی اس کی مدد نہیں کرتا۔“ (ابوداؤد، نسائی، عن عائشہ)

میں نے معاویہ سے کہا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس آدمی کو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے معاملات میں سے کسی کام پر حاکم بنا دیتا ہے اور وہ لوگوں کی حاجات، شکایات اور ان کے مسائل حل نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ اس کی ضرورتوں، اس کی شکایات اور اس کے مسائل کو حل نہیں فرماتے۔“ چنانچہ معاویہ نے (یہ حدیث سننے کے بعد) ایک آدمی کو لوگوں کی ضرورتوں اور شکایات سننے پر مقرر کر دیا۔

(ابوداؤد، ترمذی۔ عن عمرو بن مرہ)
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
”جس آدمی کو لوگوں کا حاکم مقرر کیا جائے پھر وہ مظلوم اور ضرورت مند انسان کے لیے اپنا دروازہ بند کر لے تو اللہ رب العزت اپنی رحمت کے دروازے اس کے لیے اس دن بند کر دیں گے جس دن اللہ کی رحمت کی اسے شدید ضرورت ہو گی۔“ (بیہقی۔ عن ابی الشماخ الازوی)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”قاضی 3 قسم کے ہیں۔ ایک قاضی جنت میں ہو گا جب کہ دو قاضی دوزخ میں ہوں گے۔ وہ قاضی جنت میں ہو گا جس نے حق و صداقت کو معلوم کیا اس کے مطابق فیصلہ کیا اور وہ قاضی جس نے حق و صداقت کو معلوم کیا لیکن فیصلہ کرنے میں ظلم کیا وہ دوزخ میں ہو گا اور جس قاضی نے لوگوں کے درمیان جانچ پڑتال کے بغیر فیصلہ کیا وہ بھی دوزخ میں ہو گا۔“
(ابوداؤد، ابن ماجہ عن بریدہ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
”جس آدمی کو ہم کوئی ذمہ داری سونپیں اور اس کا وظیفہ مقرر کر دیں تو اس (وظیفہ) کے علاوہ جو مال وہ لے گا وہ خیانت ہوگی۔“

(ابوداؤد۔ عن بریدہ)
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
”جس آدمی کو ہم نے کہیں عامل (ملازم) بنایا۔ اگر اس کے پاس بیوی نہیں ہے تو وہ شادی کر کے بیوی حاصل کرے اور اگر اس کے پاس خادم نہیں ہے تو وہ خادم حاصل کرے اگر اس کا گھر نہیں ہے تو وہ گھر حاصل کرے اور جو آدمی اس کے علاوہ کچھ اور لے گا تو وہ خیانت کرنے والا ہے۔“
(ابوداؤد۔ عن مستورد بن شداد)

(وضاحت: اسلامی حکومت کے ملازم کے لیے سہولت ہے کہ وہ بیت المال سے حق مہر اور دیگر ضروری اخراجات مثلاً رہائشی مکان اور خادم کے اخراجات وغیرہ لے سکتا ہے۔)
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے اور لینے والے پر لعنت کی ہے۔

(ابوداؤد، ابن ماجہ۔ عن عبداللہ بن عمرو)

☆.....

شازیہ مصطفیٰ عمران

سلسلہ وارناول

قسط نمبر 23

چہرے سے مائلنگ میں چہرہ گرو

حباب جیسے خیالات اور سوچوں سے واپس آگئی۔
”کب سے آیا ہوں، کھانا وغیرہ نہیں ملے گا۔“ ضمیر ان آفس سے کچھ دیر سے آیا تھا۔ گھر کے تمام



READING
Section

افراد ہی کھانا کھا چکے تھے۔ وہ کچن سے فارغ ہو کے اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔
 ”اوہ سوری میری آنکھ لگ گئی۔ کھانا میں ابھی لاتی ہوں۔“ وہ جھٹ کھڑی ہو گئی۔
 ”ایسا کرتا ہوں وہیں ڈائننگ روم میں آرہا ہوں۔ وہیں کھاؤں گا تم نے کھایا کھانا؟“ اس نے پوچھا۔
 ”جی۔“ اس نے سر ہلایا اور وہ نکل گئی۔ ضمیر ان کی نگاہوں میں دیکھنے کی اس میں ہمت ہی نہیں
 ہو رہی تھی یا پھر اسے اپنی ہی غلطیاں نظر آرہی تھیں۔

”تم اب کیا بنا رہے ہو؟“ حباب نے منزل کو فرائی پین میں کچھ فرائی کرتے دیکھا۔
 ”کچھ نہیں کباب پڑے تھے انہیں انڈوں کے ساتھ مکس کر کے سینڈوچ بنا رہا ہوں۔“ اس نے بتایا۔
 ”ارے آلو قیمہ بنا تو لیا ہے۔“ وہ سالن کی پتیلی چولہے پر رکھنے لگی۔
 ”بھابی میرا موڈ یہ بھی کھانے کا تھا۔“ وہ بولا۔
 اتنے میں رضوانہ بھی آ گئیں۔ وہ عشاء کی نماز پڑھ کے اٹھیں تھیں۔



READING
Section

”مزل! حد ہوتی ہے کھانا پینا کر لیا اب یہ کون سی کھانے کی تک ہے۔ پورا کچن پھیلا دیا ہے۔“ وہ اسے ڈانٹنے لگیں۔

”امی! آپ جائیں میں سب سمیٹ لوں گا۔“ وہ رضوانہ کو شانوں سے پکڑ کے کچن سے باہر لایا۔

”تم تو میری بہو کا ناک میں دم کر دیتے ہو۔ کب سے کچن میں لگی تھی۔ تم نے پھر پھیلا دیا۔“

”اپنی بہو کے لیے دوسری ہیلپر بہو لے آئیے۔“

”شرم نہیں آتی اپنے بھائی کی دوسری شادی کروائے گا۔“ ضمیر ان نے اس کو گدی سے پکڑا۔

”ضروری ہے میں آپ کی بات کر رہا ہوں۔ میں تو آدم بھائی کی شادی کی بات کر رہا ہوں۔“ اس

نے گدی چھڑائی۔ حباب اور رضوانہ ہنسنے لگی تھیں۔

”آدم کے لیے تو کوئی ایسی لڑکی ڈھونڈنی پڑے گی جو چپ رہے۔“

”امی! ان کے ساتھ، چپ رہنے والی کا گزارہ نہیں ہوگا، کیونکہ آدم بھائی جتنے مین بیخ والے ہیں ان

کی طرح ہی کوئی لائے۔“

”امی! آدم کے لیے نوین کیسی رہے گی؟“ حباب نے اچانک ہی بول دیا۔

”کیا نوین، بھابی آپ آدم بھائی کے سامنے بول بھی نہیں دیتے گا۔“ وہ اپنے فرائی کیے کباب اور

انڈے ڈانگ میبل پر رکھ چکا تھا۔

”ویسے حباب نے بات ٹھیک کی ہے۔“ رضوانہ کو جیسے سمجھ آ گئی۔

”آدم بھائی تو سرگھر پر اٹھالیں گے وہ پھپھو کی کسی بیٹی کو برداشت نہیں کرتے ہیں۔“ مزل آدم

کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔

”امی! میں نے بس ایسے ہی کہہ دیا تھا۔ آپ نوین کو چھوڑیں کوئی دوسری ہی لڑکی دیکھیں۔“ حباب

بھی ڈر ہی گئی۔

”نہیں حباب! تم نے میرے دماغ میں ڈال دی ہے، اس طرح راشدہ کا بھی موڈ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”دیکھا امی کو ابھی بھی اپنے سرال والوں کی ہی پڑی ہے۔“ مزل نے کہا۔

”زیادہ بڑوں کی طرح نہیں بولا کرو تم سے پوچھ کے نہیں رشتے کروں گی۔“ انہوں نے اسے سرزنش کی۔

”ارے امی! آپ کو آدم سے تو پوچھ کے کرنا پڑے گا اور آپ جانتی ہیں آدم کے مزاج کو پھپھو سے

ویسے ہی وہ خوش نہیں ہوتا اور ان کی کسی بیٹی سے شادی کرے سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ ضمیر ان بھی آدم

کے مزاج سے واقف تھا۔

”اچھا، اچھا بس کرو جو مجھے کرنا ہوگا میں کروں گی۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کے ان دونوں کی ہی بات کو

رد کر دیا۔

حباب تو لب کھلنے لگی۔ اسے اپنی عقل پر ماتم کرنے کو دل چاہ رہا تھا کیسے اس نے یہ بات کر دی۔

”بھابی! آپ کو ابھی ابھی بولنا تھا۔“

”مجھے کیا پتا تھا۔“ وہ شرمندہ بھی ہو رہی تھی۔

جب کہ ضمیر ان نارمل انداز میں چیئر گھسیٹ کے بیٹھا حباب کھانا لگانے لگی۔

”تم لوگ کان کھول کے سن لو میں جو فیصلہ کر چکا ہوں۔ وہی ہوگا۔“ انہوں نے راشدہ کو درشت اور قطعیت بھرے لہجے میں گویا بتایا۔

”بیٹی کی مرضی کے بغیر تو رشتہ نہیں کر سکتے۔“ وہ ان سے لڑبٹھیں۔

”دیکھو! تم نے اب تک جو کیا میں کچھ نہیں بولا۔ حتیٰ کہ تم نے اپنے بھائی کا گھر خراب کرنے میں بھی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ میں جب بھی نہیں بولا اور تم نے اپنی بیٹی کو بالکل ہی ناکارہ کر دیا ہے۔ تم نے یہ تک نہیں سوچا لڑکیوں کی عزت کتنی نازک ہوتی ہے مگر تم کچھ سوچتی تو یہ حرکتیں تو نہیں کرتیں کہ تمہاری بیٹی۔“ وہ انہیں سخت سست سارے تھے۔

”ضروریہ نوین نے آپ سے بکواس کی ہوگی۔“ راشدہ، سرفراز صاحب کے ایسے غضب ناک انداز سے ڈرتو گئی تھیں مگر پھر بھی ان پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”نوین تم لوگوں کی طرح بے وقوف نہیں ہے کہ ہر بات مجھے بتائے اور میں کیا دیکھ نہیں رہا تھا۔ راشدہ تم نے میری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے، میں نے تم پر کبھی روک ٹوک نہیں کی تو تم سر پر چڑھتی گئیں۔ جیسی خود سر ہو ایسی ہی نوشین کو بھی بنا دیا۔“ نوشین اپنے کمرے کے باہر کھڑی سب سن رہی تھی وہ تو راشدہ کی تیز آواز پر لاونج سے اٹھ کے باہر آگئی تھی۔

”راشدہ! تم کیسی ماں ہو، بیٹیوں کو اچھی تربیت اور اچھی باتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم نے سوائے نوشین کو بگاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اپنی بھابی سے بدلے کے چکر میں اپنی ہی بیٹی کی تم نے غصے اور نفرت میں شخصیت خراب کر دی۔“ سرفراز صاحب ان کی غلطیاں گنوارے تھے۔

”راشدہ! تم کیسی ماں ہو اپنی بیٹی کو تباہ کر رہی ہو تمہیں اس سے ذرا پیار نہیں۔“

”آپ مجھ پر غلط الزام تراشیاں کر رہے ہیں۔“ راشدہ کے پاس تو صفائی میں وضاحت دینے کے لیے الفاظ ہی نہیں تھے۔

”میں الزام تراشیاں نہیں کر رہا، تمہیں بتا رہا ہوں تم کیا کیا کرتی آرہی ہو اور اب میں تمہیں اپنی بیٹی کی زندگی برباد کرنے نہیں دوں گا۔ نوشین کے لیے بہت اچھا رشتہ ہے یہ میں ہاتھ سے جانے نہیں دوں گا۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں گویا ہوئے۔

”نوشین مانے گی ہی نہیں۔“ راشدہ کو جیسے پورا پورا یقین تھا۔

”نوشین کو میں سمجھاؤں گا کیونکہ تم نے ابھی تک ماں بن کے اسے اچھا اور برا سمجھایا ہی نہیں۔“ وہ اتنے طنزیہ اور غصہ ہو رہے تھے راشدہ اچھل ہی گئیں۔

نوشین کی تو جیسے دل و دماغ کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ آج سے پہلے اس نے ابو کا ایسا انداز نہیں دیکھا تھا۔ اسے ابو کی باتیں خاصی دل کو لگی تھیں ابو کو اس کی کتنی فکر تھی اور امی نے آج تک کبھی اسے اچھا برا سمجھایا ہی نہیں، بس نفرت غصہ اور بدلہ ہی ذہن میں رہا۔ ضمیر ان کو حاصل کرنا اس کی ضد بن چکا تھا۔ اسے ضمیر ان سے محبت تو نہیں ہوئی اس کے بس شروع سے راشدہ نے یہ دماغ میں بٹھایا ضمیر ان سے اس کی شادی ہوگی۔ نوشین نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ ضمیر ان سے ایسا کوئی رسپانس دیتا ہی نہیں ہے وہ پھر یک طرفہ بھی کوئی محبت ہوئی جب کہ نوشین نے خود کو کھنگالا اسے بھی کون سا ضمیر ان سے محبت تھی وہ تو بس بے

دقوفی میں فضول حرکتیں کرتی جا رہی تھی۔ راشدہ کو شروع سے رضوانہ سے خار تھا۔ اس لیے کہ ان کے چار بیٹے تھے اور وہ جلن اور حسد میں مبتلا تھیں۔ کیونکہ ان کی تین بیٹیاں تھیں۔ انہیں بیٹے کی کمی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ شروع سے انہوں نے اپنی بیٹیوں کی پیدائش پر کبھی خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا جب کہ سرفراز صاحب نے انہیں کبھی بیٹے نہ ہونے کا کبھی طعنہ تک نہیں دیا تھا۔ ان کے ساتھ نرمی کا بھی سلوک رکھتے تھے۔ کبھی روک ٹوک نہیں کی جو اب میں راشدہ نے اپنا غصہ اپنی بیٹیوں پر ہی نکالا تھا۔ نوشین کو آج بہت رونا آ رہا تھا۔

ابو نے ٹھیک کہا تھا اس کی شخصیت ہی امی نے خراب کر دی تھی۔ وہ کیوں ایسی بے وقوف بن گئی اور اپنی بہنوں کو دشمن سمجھنے لگی۔ کرن اور نوین اسے کتنا سمجھاتی رہیں کہ وہ غلط کر رہی ہے۔

”آہ..... میں نے اپنی شخصیت جو خراب کی ہے ہمیشہ کیوں امی کے کہنے پر چلتی گئی۔“ وہ تکیے میں منہ چھپا کے پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی اسے آج سب سے شرمندگی ہو رہی تھی۔

☆.....☆

بیشم تیزی سے اندر آیا تھا۔ وہ عصر کی نماز پڑھ کے بیچ سورہ پڑھ رہی تھی۔ بیشم اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی تھی جب کہ وہ اپنے کپڑے وارڈروب سے نکالنے لگا۔ کن آنکھوں سے خوشنما کو بھی دیکھے جا رہا تھا۔

”اسے یوں اچانک سے چلنے کا کہوں گا تو بہت غصہ کرے گی۔“ بیشم کو اسے فیس کرنا بھی بہت مشکل لگ رہا تھا۔ کئی دنوں سے دونوں میں کوئی بات چیت بھی نہیں ہو رہی تھی۔

”جب یہ پتا چلے گا رونا کے رشتے کی میں پہلے ہی بات کر آیا ہوں اور چیخے گی۔“ اس نے اپنا اسکائی بلیو قمیض شلوار نکالا پریس بھی کروانا تھا۔ کام والی پہلے ہی چلی جاتی تھی، کپڑے پریس کروائے تو کس سے، جو ہم سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، رہی ماہ رخ وہ ٹھیک طرح کرتی نہیں ہے وہ بالوں میں ہاتھوں کی انگلیاں پھنسائے سوچ میں گم تھا۔

خوشنما بیچ سورہ پڑھ کے فارغ ہو گئی تھی۔

”کپڑے پریس کرنے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”آں ہاں۔“ اس نے چونک کے سر اٹھایا۔

”اگر تکلیف نہیں ہو تو کر دو۔“ وہ صوفے سے کھڑا ہو گیا۔

خوشنما نے بیڈ سے اس کا قمیض شلوار اٹھایا اور جانے لگی۔

”خوشنما ایک منٹ رکنا۔“ اس نے یکدم ہی رکار لیا۔

وہ رک گئی۔ بیشم کا پرسوچ اور پریشان چہرہ دیکھنے لگی۔

”جی۔“ وہ اس کی جانب متوجہ ہو گئی تھی۔

وہ خوشنما کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

وہ دو قدم پیچھے ہو گئی۔ دل کی دھڑکن تیز ہوئی تھی۔ جب سے اس نے بیشم سے بات چیت بند کی تھی۔ پتا نہیں احساسات ہی بدل گئے تھے۔ راتوں کو وہ گھبرا کے اٹھ جاتی تھی۔ اسے ایسا لگا بیشم اس کے بہت قریب آ جاتا ہے مگر جب آنکھ کھول کے دیکھتی تو بیشم بے خبر کروٹ لیے سو رہا ہوتا تھا۔

رداڈ انجسٹ [14] دسمبر 2015ء

READING
Section

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

”اشعر کی امی رشنا کا رشتہ لے کے جا رہی ہیں۔ تمہیں بھی ساتھ چلنا ہوگا۔“ وہ رک رک کے گویا ہوا۔
 ”سارے معاملات طے کر لیے مجھے اب بتا رہے ہیں۔“ وہ تو کب سے تیار بیٹھی تھی کہ وہ کوئی بات نکالے اور وہ پیشم پر برس پڑے۔

”دیکھو! تم نے حالات ہی ایسے کر دیئے ہیں، میں سب طرف سے پریشان ہوں۔ کیا کروں۔ نانا جان کی بات مانو یا اشعر کا معاملہ سیٹ کرواؤں، تم سے یہ سارے حالات چھپے تو نہیں ہیں۔“ وہ بری طرح منتشر ہو رہا تھا۔ خوشنما پرزل ہو گئی کیونکہ پیشم کو اس طرح پریشان کبھی نہیں دیکھا تھا۔
 ”ابھی آپ رشنا کی بات کریں۔“

”اشعر کو رشنا پسند آئی ہے، وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا کہ پہلے تمہارے گھر والوں سے بات کر لوں تو ہی بات آگے بڑھاؤں گا تمہارے امی ابو نے مشکل سے رضامندی دی ہے۔“ وہ بتانے لگا۔

”تم سے کیسے بات کرتا تم نے میری عزت تو دو کوڑی کی کر کے رکھ دی ہے۔ کس منہ سے بات کروں تمہارا خطا وار ہوں تم پتا نہیں مجھ سے چاہتی کیا ہوں۔“ وہ بہت مضطرب اور رنجور ہو رہا تھا۔
 ”کچھ دیر، میں نکلنا ہے۔ اشعر کی امی انتظار کر رہی ہوں گی۔“ اس نے پھر بات ہی پلٹ دی اور واش روم میں گھس گیا۔

خوشنما کو اس پر ترس آنے لگا۔ اس نے واقعی حد کر دی تھی اب تو اس کی سزا ختم کر دے کتنی تو وہ عزت و اہمیت دیتا ہے اس گھر میں بھی کیسے نزہت مامی سے لڑ گیا تھا اس کی خاطر اگر وہ اب اسے یہاں لایا تھا تو اسے عزت و اہمیت بھی دے رہا تھا اور کیا چاہیے تھا اسے اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا تھا۔ خوشنما اتنی تو سنگدل نہیں تھی کہ اسے یوں تڑپتا دیکھتی رہے۔

”بس کر دو خوشنما! اور کتنا جھکاؤ گی اسے اپنی غلطیاں مان تو رہا ہے تم سے کتنی معافیاں مانگ چکا ہے اتنی بھی سنگدل نہیں بنو معاف کر دو اوپر والا بھی تو معاف کر دیتا ہے پھر ہم بندے کیا چیز ہیں۔“ اندر سے کوئی پیشم کی حمایت کر رہا تھا۔
 ”ہاں اب بس کر دو بہت ہو گیا۔“ وہ خود سے ہمکلام تھی۔

”کپڑے جلدی پر لیں کر دو جلدی جانا ہے۔“ وہ واش روم سے نکلا تو خوشنما کو ایسے ہی کھڑے دیکھا۔
 ”جی جی اچھا۔“ وہ گڑ بڑا گئی تیزی سے قدم اٹھاتی کمرے سے نکل گئی پیشم نے اس کی ہمکلامی سن لی تھی مگر اسے سمجھ نہیں آیا تھا وہ کسے کہہ رہی تھی۔

☆.....☆

حسنی اس کے کمرے میں آنے سے پہلے ہی سونے کی تیاری کر لیتی تھی۔ شہر یار دو دن سے اس کی یہ حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا۔ ابھی بھی وہ چادر تان کے لیٹی ہوئی تھی مگر اسے ایسا کیوں لگ رہا تھا وہ جاگ رہی تھی۔

”حسنی! تم جاگ رہی ہونا؟“ وہ اس کے سر پر کھڑا پوچھ رہا تھا۔
 مگر وہ تو ساکت و جامد ہو کے لیٹی رہی کیونکہ شہر یار نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔ وہ جاگ رہی ہے۔
 ”حسنی اٹھ جاؤ۔“ وہ تیز لہجے میں گویا ہوا۔

”مجھے نیند آرہی ہے۔“ وہ بمشکل آواز کو نکال کے بولی تھی۔

”نیند آرہی ہے یہ تو مجھے بھی نظر آرہا ہے مگر مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ اس نے حسنیٰ کی چادر گھسیٹ کے اتار دی۔

اور وہ سرخ سرخ روئی روئی آنکھوں میں ناگواری لیے شہر یار کو سنجیدہ دیکھ رہی تھی۔

”تمہاری یہ کیا حرکت ہے روز تم میرے آنے سے پہلے سونے کا ڈرامہ کر کے لیٹ جاتی ہو۔“ وہ خاصا برہم ہو رہا تھا۔

حسنیٰ نے لب بھینچ کے منہ دوسری طرف ہی کر لیا۔

”جب مجھے نیند آئے گی تو ہی سوتی ہوں مجھے ڈرامے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ڈرامے تو آپ نے میرے ساتھ کئے ہوئے ہیں۔“ آخر کب تک برداشت کرتی وہ روہا نسی ہو گئی۔

شہر یار حیرانگی سے اس کی بات پر غور کرنے لگا۔ اس کا چہرہ بہت مرجھایا ہوا بھی ہو رہا تھا۔

”پل پل میری تضحیک کرتے ہیں، ہر ایک کے سامنے میری عزت دو کوڑی کی کر دیتے ہیں۔ میرا اتنا بڑا گناہ تھا آپ کو رنجیکٹ کرنے کا، آپ پل پل میری ذات کو تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں۔ پھرے وجود کو

تقیدی الفاظ میں سب کے سامنے بولتے ہیں۔ میرا اتنا بڑا گناہ تھا کہ آپ نے میری عزت نفس کو مجرد کیا ہے اور ابھی بھی کر رہے ہیں آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟“ وہ پھٹ پڑی تھی۔

”میں، ہاتھ جوڑ کے آپ سے معافی مانگتی ہوں اپنے وہ سارے الفاظ واپس لیتی ہوں جو میں نے آپ کو کہے تھے مگر پلیز مجھے بار بار جھڑکنا بند کر دیں۔“ وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کے اندر کی سسکیوں کو روکنے لگی۔

”مجھے تو کبھی کوئی محبت سچی ملی ہی نہیں۔ پیدا ہوتے ہی ماں نے پھپھو کی گود میں ڈال دیا۔ نہ مجھے سگی ماں کی محبت ملی اور نہ پالنے والی ماں کی محبت سب اپنے ہی مطلب کے ہوتے ہیں۔ میری ذات اتنی غیر

اہم ہے جس کا دل چاہا اپنی مرضی چلاتا میری تو کوئی مرضی ہی نہیں رہی کبھی کسی نے مجھ سے پوچھا ہی نہیں میری ماں نے ڈانٹ ڈپٹ کے سوا کچھ نہیں دیا اور منہ بولی ماں نے سوائے اپنا سہارا بنائے رکھا اور آپ

نے بھی مجھے بے وقعت کر دیا۔ حسنیٰ تو آپ کے کسی کے پاس بھی ہی نہیں وہ بس حکم سننے کے لیے دنیا میں آئی ہے۔“ وہ اپنے اندر کی محرومیاں آج زبان پر لے آئی تھی۔

شہر یار کوشدت سے ندامت و شرمندگی ہو رہی تھی۔ اسے نہیں پتا تھا حسنیٰ اتنی نازک احساسات کی مالک ہے وہ تو اسے ہمیشہ لا ابالی اور لا پرواہ سمجھتا رہا تھا۔ اسی لیے ہی وہ اسے ہر وقت ڈی گریڈ کرنے کے

چکر میں لگا رہتا تھا۔ جب سے شادی ہوئی تھی وہ اسی کے کہنے پر تو چل رہی تھی۔ اس کی تو مرضی واقعی کہیں بھی نہیں تھی۔

”مجھے زندگی میں سب کچھ ملا زندگی کی ساری آسائشیں مگر مجھے محبت کہیں بھی نہیں ملی۔“ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”مجھ سے جتنی بھی غلطیاں ہوئی ہیں، معاف کر دیجیے گا۔ اگر معافی کے قابل سمجھتے ہوں تو؟“ لہجہ طنزیہ اور روکھا بھی ہو گیا تھا۔

”زندگی بغیر محبت اور اپنائیت کے ٹھیک نہیں گزرتی جب میں آپ کو پسند نہیں تھی، موٹی بھدی لگتی تھی۔“

کیوں کی شادی۔ نہیں۔ آپ کو مجھ سے بدلہ جو لینا تھا کیونکہ آپ کی سوچ یہ تھی میں مغرور اور بددماغ ہوں۔ مجھے آپ ہی سبق سیکھا سکتے ہیں۔ کوئی اور نہیں۔“ شہر یار لُب بھینچ کے رہ گیا حسنیٰ نے لمحوں میں اسے فرش پر پٹخ دیا تھا۔ وہ کتنا کچھ سوچتی تھی۔ وہ تو اسے سمجھتا ہی نہیں تھا۔

”آپ پلیز لائٹ آف کر دیں مجھے سونا ہے۔“ وہ پھر لیٹ گئی تھی۔

شہر یار کے پاس الفاظ ہی نہیں تھے کہ وہ کچھ بولتا مگر اسے آج یہ ادراک ہو گیا تھا حسنیٰ بہت بدگمان ہے اسے محبت اور پیار کی ضرورت ہے ورنہ وہ ایسے ہی اس سے دور ہوتی جائے گی اور وہ اپنی محبت کو ایسے بکھرنے نہیں دینا چاہتا تھا۔

☆.....☆

نوشین کو ایسا لگ رہا تھا اس کا نیا جنم ہوا ہو وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے سچے دل سے اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی تھی۔ نوین اور کرن اس کے ایسے بدلتے روپ پر خیران تھیں البتہ راشدہ کو جیسے چسکی لگ گئی تھی۔ تینوں ہی کچن میں کھسی ہوئی تھیں۔

”نوشین بیٹا! آپ کچھ کر رہی ہیں؟“ سرفراز صاحب نے کچن میں دیکھا وہ کھانا لگانے کی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔ ”ابو! کھانا لگانے لگی ہوں۔“ اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے بیٹا! آپ لوگ کھانا لگائیں پھر مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“ انہوں نے اسے بغور دیکھنے کے بعد کہا۔ جی اچھا ابو!“ اس نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔ ابو اسی رشتے کی بات کریں گے۔“ کرن نے اس کے کان میں کہا۔

”کون سے؟“ وہ جیسے انجان بنی۔

”زیادہ بنومت۔“ وہ ہنسی تھی۔ تینوں نے کھانا لگایا اور راشدہ کو نوین اور کرن زبردستی لے کے آئی تھیں۔

”آج تو پھر بھی ہمیں رات کے کھانے میں دیر ہوگئی ہے۔“ کرن نے کہا۔

راشدہ خاموش تھیں سرفراز گا ہے بگا ہے انہیں دیکھے جا رہے تھے کھانے سے فارغ ہو کے وہ نوشین کو بلا کے گئے تھے۔

نوشین سر جھکائے خاموش سی ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ راشدہ کا ابھی بھی منہ بنا ہوا تھا۔

”دیکھو بیٹا! میں لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھوں گا۔ میرا دوست اپنی فیملی کے ساتھ امریکہ سے پاکستان آیا ہے اور اس اتوار کو وہ اپنی بیگم اور بیٹے کے ساتھ آئیں گے۔ میں چاہتا ہوں تمہارا رشتہ یہاں ہو جائے باقی اللہ کی مرضی۔“

”ابو جیسے آپ کی مرضی۔“ اس نے سعادت مندی سے رضا مندی دی۔ سرفراز صاحب حیران ہی رہ گئے۔ البتہ راشدہ کے تو پٹنگے ہی لگ گئے۔

”ارے ایسے کیسے مان رہی ہو۔“

”راشدہ! تم چپ رہو تمہارا کام ختم تم نے جو کرنا تھا کر لیا۔ اب مجھے کرنے دو جو مجھے کرنا ہے۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کے درشت لہجے میں انہیں سرزنش ہی کی تھی۔

”امی! اب مجھے سمجھ آ گیا ہے۔ میں اس راستے پر چل رہی تھی جس پر کوئی منزل ہی نہیں تھی اور جسے میں اپنی منزل سمجھ رہی تھی۔ وہ اوپر والے نے پہلے سے ہی کسی کی منزل بنا دیا تھا۔ میں تو خود غلط راستے پر

جا رہی تھی۔“ نوشین اتنی گہری سوچ کے ساتھ بہت دھیمے لہجے میں بول رہی تھی۔
 سرفراز صاحب کو اس کی ایسی بات کرنے پر بہت خوشی اور سکون ملا تھا۔ راشدہ تو دانت پیس رہی تھیں۔
 ”ابو! آپ نے جو بھی میرے لیے فیصلہ کیا ہے میں دل سے اس پر راضی ہوں۔“
 ”جیتتی رہو، میری بیٹی آج تم نے مجھے خوش کر دیا اور احساس دلا دیا تم میری بیٹی ہو۔“ سرفراز صاحب
 نے اس کی پیشانی چوم لی۔

”میری دعا ہے میری بیٹی کے لیے سدا خوش رہو۔“
 ”میری مرضی کے بغیر آپ یہ رشتہ کریں گے۔“ راشدہ ابھی بھی اپنی انا کے بت کو لیے بیٹھی تھیں۔
 انہیں ایسا لگ رہا تھا اگر وہ ہار مان گئیں تو سب ان پر نہیں گے اور سب سے زیادہ ان کی بھانجی رضوانہ اور
 وہ رضوانہ کو خوش نہیں رہنے دینا چاہتی تھیں۔

”راشدہ! کب تک اکیلی لڑتی رہو گی مان لو جو کچھ تم کرتی رہی ہو۔ وہ سب غلط تھا اگر اپنی غلطی مان لو
 گی تو تمہاری شان میں کمی نہیں آجائے گی، غلطی مان لینے سے انسان اور بڑا ہو جاتا ہے۔“
 ”امی! ابو بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں اپنی نفرت اور غصے کو دور پھینکیں۔ کیونکہ نفرت اور غصے نے ہمیں
 سب سے دور کر دیا تھا سب کی نظروں میں ہم کتنے چھوٹے ہو گئے تھے۔“ نوشین انہیں سمجھانے لگی۔ کیونکہ
 اسے اپنی غلطیوں پر بہت شرمندگی تھی کتنوں سے وہ لڑچکی تھی اور اس نے سوچ لیا تھا اپنی آئندہ زندگی شروع
 کرنے سے پہلے سب سے معافیاں مانگے گی۔ سب سے پہلے جناب سے کیونکہ اس کی ازدواجی زندگی کو
 وہی تو خراب کر رہی تھی۔

”نوشین! تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ راشدہ تو جلے پیر کی بلی کی طرح ہو رہی تھیں۔
 ”امی پلیز! بس بہت ہو گیا۔“ راشدہ نے اس کے اٹھے ہاتھ کو دیکھا۔
 ”امی! کبھی آپ نے ہم بیٹیوں کو پیار و محبت سے کچھ سمجھایا ہی نہیں اور ابو سے کبھی قریب ہونے ہی
 نہیں دیا۔“ راشدہ حیرانگی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ نوشین کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔
 ”امی! آپ نے اپنے ساتھ تو کیا کیا میرے ساتھ بھی ظلم کیا۔“ وہ رو رہی تھی۔
 ”ابو! قصور آپ کا بھی ہے آپ نے ہم سب کو اتنی ڈھیل کیوں دی۔“ وہ واضح الفاظ میں یہ تو نہیں کہہ
 سکتی تھی کہ امی کو ڈھیل کیوں دی ورنہ راشدہ تو ہنگامہ ہی کر دیتیں۔
 ”اچھا چلو چھوڑو ان باتوں کو ہم سب لوگ کل عتیق بھائی کے گھر چلیں گے۔“
 ”کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ راشدہ پھٹ پڑیں۔

”راشدہ! بس کرو اپنی اکڑ اور بت کو توڑ دو ورنہ تم خود اندر سے ٹوٹی چلی جاؤ گی۔ کیونکہ اس میں صرف
 تمہارا ہی نقصان ہوگا میں اس دفعہ تمہاری ایک نہیں سنوں گا اپنی مرضی سے سب کروں گا بے عزتی تمہاری
 ہوگی۔“ سرفراز صاحب اتنے سنجیدہ تھے ان کے لب و لہجے سب درست تھا۔
 نوشین کھڑی ہو گئی تھی کیونکہ وہ چاہتی تھی ابو امی کو اچھی طرح سمجھا دیں تاکہ وہ بعد میں کوئی ایسی بات
 نہیں کریں۔

”سوائے تم نے ہنگامے کرنے کے کچھ نہیں کیے ہیں۔“

”ہاں میں ہی بری ہوں۔“ وہ رو ہانسی ہو گئیں۔

”برا بھی تم نے اپنے آپ کو خود کیا، سدھر جاؤ ورنہ بہت برا ہوگا۔“ وہ بہت برہم ہو رہے تھے اور راشدہ سہم سی گئیں۔ آگے سے ان سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔
نوین اور کرن باہر کھڑی سب سن رہی تھیں جو ابو کو پہلے کرنا چاہیے تھا وہ آج کیا تھا۔

☆.....☆

”امی! اس دفعہ راشدہ پھپھو سچ مچ کا ہی برامان گئی ہیں۔ جب سے ابو یہاں آئے ہیں وہ ایک دفعہ بھی نہیں آئیں۔“ طلحہ کو تشویش کے ساتھ حیرانگی بھی تھی۔
”راشدہ کو اللہ کرے عقل آجائے بچیوں کے ساتھ پتا نہیں کیا کر رہی ہے نوشین تو بالکل ہی اپ سیٹ ہو گئی ہے۔“

”آپ کو تو ابھی بھی ان کے ساتھ ہمدردی ہے۔“ منزل کو برا لگا۔
”بچیاں بری نہیں ہیں۔ بس راشدہ کی ضد اور انا کی وجہ سے وہ سب مجبور ہوتی ہیں۔“ سب ناشتے سے فارغ ہو کے لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ سنڈے کو سب ہی ساتھ ناشتہ کرتے تھے عتیق احمد ٹی وی پر نیوز چینل لگائے بیٹھے تھے۔

”نوین اور کرن تو پھر بھی راشدہ کی باتوں میں نہیں آتی ہیں مگر نوشین اس کے کہنے پر چلتی ہے۔“ عتیق احمد نے کہا۔

”ابو! آپ کو برا نہیں لگ رہا، امی آپ کی بہن اور بھانجیوں کے بارے میں بات کر رہی ہیں۔“ منزل نے پوچھا۔

”کوئی غلط بات نہیں کر رہی ہے ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔“ انہوں نے تائید کی۔

”امی! آج دوپہر میں کیا پکانا ہے۔“ حباب کچن سمیٹ کے آگئی تھی۔

”انہیں بس کھانا پکانے کی پڑی رہتی ہے۔“ طلحہ نے کہا۔

”بھوک کا شور بھی تم ہی سب سے زیادہ مچاتے ہو۔“ اس نے طلحہ کے سر پر چیت لگائی۔

”ارے بیٹا! ایسا کرو چکن پلاؤ بنا لو، رات کو پھر دیکھتے ہیں کیا پکائیں۔“ رضوانہ نے اس وقت کا تو

مسئلہ نمٹایا۔

”پلیز بہن کی چٹنی ضرور بنائیے گا، پلاؤ کے ساتھ۔“

”دیکھا آرڈر بھی اسی کے چلتے ہیں یہ کھانا ہے وہ کھانا ہے۔“ ضمیر ان نے ہنس کے کہا۔

”زبان کو چٹخارہ چاہیے۔“

”ارے رضوانہ! کیوں بچوں کو بولتی ہو یہی کھانے کے دن ہیں۔“ عتیق احمد نے طلحہ سے لاڈ

دکھائے۔

”دیکھا ابو کو میرا کتنا خیال ہے۔“

”چل اٹھ یہاں سے کب سے پڑا ہوا لوٹ رہا ہے۔“ رضوانہ نے اس کی پشت پر دھپ لگائی۔

”میں آج آدم سے نوین کے لیے بات کروں گی۔“

”امی کیوں آپ گھر میں بے سکونی کروائیں گی آدم بالکل نہیں مانے گا۔“ ضمیر ان نے کہا۔ حباب کو

تو گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ اس نے تو مذاق میں یہ بات کی تھی رضوانہ تو اس بات کو لے کے ہی بیٹھ گئی تھیں۔

”دیکھ لو تم کیونکہ تم آدم کے مزاج سے واقف ہو۔“ عتیق احمد گویا ہوئے۔
 ”میں چاہتی ہوں کہ نوین اس گھر میں بہو بن کے آئے کیونکہ وہ اچھی لڑکی ہے بات کو سمجھتی ہے اور پھر
 راشدہ کا بھی موڈ ٹھیک ہو جائے گا۔“
 ”تم راشدہ کو نہیں دیکھو آدم راضی ہوا تو کرنا کوئی زبردستی نہیں کرنا، میرے بیٹے کے ساتھ۔“ انہوں
 نے گویا رضوانہ کو سمجھایا۔

تھوڑی دیر میں آدم بھی اٹھ کے آ گیا تھا۔ سنڈے کی وجہ سے اسے ذرا دیر تک سونے کا موقع مل جاتا
 تھا۔ ورنہ تو وہ صبح ہی میڈیکل اسٹور چلا جاتا تھا۔ کچھ دنوں سے عتیق احمد بھی ساتھ جانے لگے تھے۔
 ”میرا بیٹا! اٹھ گیا۔“ رضوانہ نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔
 ”آدم بھائی! امی کو آپ سے کچھ مطلب ہے اس لیے اتنا پیار کر رہی ہیں۔“ طلحہ نے لقمہ دیا۔
 ”بد تمیز ماں کے پیار کو بھی مطلب کہہ رہا ہے۔“ انہوں نے اسلکے دھپ لگائی۔
 ”مجھے کچھ سن گن لگ تو گئی ہے۔“ وہ کہنی ٹکا کے بڑے صوفے پر عتیق احمد کے قریب ہی بیٹھا۔
 حباب تو تیزی سے نکل گئی۔ کیونکہ وہ ویسے ہی ڈری ہوئی تھی طلحہ اور منزل کو بھی ضمیر ان نے اشارے
 سے جانے کو کہا۔

”کیسی سن گن؟“ رضوانہ نے اسے بغور دیکھا۔
 ”امی! میں نے کل رات بھابی کی اور آپ کی گفتگو کچن میں سنی تھی۔“
 ”کیا تم وہاں کب تھے؟“ وہ تو حیران رہ گئیں۔
 ”میں موبائل کا چارجر طلحہ سے لینے اس کے کمرے میں جا رہا تھا۔ آپ سب کے کچھ شور کی آوازیں
 تھیں سن لیا۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

”امی! پھر تو آپ کا مسئلہ ہی آسان ہو گیا۔ آدم کو شروع سے بات بتانے کی ضرورت نہیں۔“ ضمیر ان
 نے کہا۔
 ”رضوانہ! میں اپنے بیٹے پر کوئی زبردستی نہیں چاہتا راشدہ کی جو حرکتیں رہی ہیں اس کے بعد میرے
 بیٹے کیسے قبول کریں گے۔“ عتیق احمد نے کہا۔

”ابو! آج تک ہم بیٹوں نے امی کی کوئی بات بھی رد نہیں کی ہے۔“ وہ اٹھ کے بیٹھا۔
 ”اس بات پر تو مجھے بھی فخر ہے تم چاروں کی تربیت رضوانہ نے بہت اچھی کی ہے۔“ وہ شرمندہ تھے۔
 کیونکہ جب ان کے بچے چھوٹے تھے وہ رضوانہ کا ساتھ تک دینے کے لیے نہیں تھے۔ کس مشکلوں سے بچوں
 کو پالا ان کے ماں باپ کے گھر کے حصے میں سے ان کے بھائی نے حصہ دیا تھا۔ سر چھپانے کی جگہ مل گئی تھی
 اور پھر اس گھر کو انہوں نے بیٹوں کی کمائی سے بنایا تھا۔

”آدم! تمہیں نوین پسند ہو تو اس رشتے پر رضا مندی دینا، کوئی زبردستی اپنی ماں کی وجہ سے یہ فیصلہ نہیں
 کرنا کہ اپنی ماں کا ہمیشہ کہنا مانا ہے۔“ اس بار بھی ایسا ہی کرو گے اور میں نہیں چاہتا میری وجہ سے پھر کوئی
 غلط بات ہو جائے۔“

”ارے ابو! آپ ایسی بات کیوں کر رہے ہیں۔“ آدم نے انہیں ریلیکس کیا کیونکہ اس نے نوٹ کیا
 تھا جب سے وہ یہاں آئے تھے ان سب سے شرمندہ ہی رہتے تھے۔

”پھر بیٹا! اپنے دل سے فیصلہ کرنا۔“ انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔
 ”تو پھر سنیے امی وہ لڑکی فیشن بہت کرتی ہے اور میک اپ۔“ وہ سر کھجانے لگا۔
 ”کیا.....؟“ وہ تو حیران رہ گئیں۔ کیونکہ آدم سے اتنی جلدی رضا مندی، یقین نہیں آیا۔
 ”ارے فیشن میک اپ تو نوٹین کرتی ہے نوین اور کرن نہیں کرتی ہیں۔“ ضمیران نے جھٹ
 وضاحت دی۔

”لیکن پتا نہیں مجھے ایسا لگتا ہے وہ بھی کرتی ہے۔“ وہ منمنایا۔
 نوین سے اس کی دو ایک بار تکرار اور بحث ہو گئی تھی۔ اس نے پھر آنا بھی کم کر دیا تھا لیکن جب سے
 عتیق احمد نے بتایا تھا نوین نے ہی انہیں سمجھا کے پہاں بھیجا تھا تو اسے ایک لمحے کو نوین کا خیال آنے لگا
 تھا۔ وہ اس سے یقیناً ڈرتی تھی۔ بات بھی کم کرتی تھی۔ وہ اسے بھی نوٹین کی طرح ہی سمجھتا تھا مگر وہ بہت
 مختلف تھی۔

”اب تم میک اپ کو ایشو بنا کے انکار نہیں کرنا۔“ ضمیران نے مسکرا کے کہا۔
 ”خیر میں ایسا تو بالکل نہیں کرنے والا ہوں آپ لوگ یہ سوچ لیں پھپھو راضی ہو جائیں گی رشتہ کرنے پر۔“
 ”راشدہ اگر راضی نہیں ہوئی تو کیا ہوا ہم زبردستی منائیں گے۔“ رضوانہ، آدم کی نیم رضا مندی پا
 کے جیسے خوش ہو گئیں۔

اتنے میں منزل حباب کو بلا کے لے آیا وہ ان سب کے سامنے جھینپ رہی تھی کیونکہ یہ بات بھی تو اسی
 کی نکالی ہوئی تھی۔

”مبارک ہو بھابی! آپ کی دیورانی آنے والی ہے اور آپ کی تجویز کردہ۔“ منزل نے شوخی سے کہا۔
 ”حباب نے نوین کا نام لے کے جیسے میری مشکل ہی آسان کر دی ہے۔“ رضوانہ نے اسے پیار
 بھری نگاہوں سے دیکھا۔

طلحہ نے تو بھنگڑا ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ آدم نے کشن اٹھا کے مارا۔
 ”ابھی وہاں سے کوئی جواب نہیں ہے اس لیے زیادہ خوش نہیں ہو۔“
 ”آدم بھائی جواب ہاں میں ہی آئے گا۔“ اسے جیسے مکمل یقین ہی تھا۔
 عتیق احمد اپنے چاروں بیٹوں کو بڑے فخر سے دیکھ رہے تھے۔

☆.....☆

رمانا اور اشعر کا رشتہ طے ہو گیا تھا۔ حالانکہ اشعر اس سے پہلے بھی اپنی خواہش ظاہر کر چکا تھا۔ اسے
 موقع ہی نہیں ملا تھا۔ گھر جا کے امی اور ابو سے بات کرنے کا کیونکہ اسی دوران فاران کا مسئلہ کھڑا ہو چکا
 تھا۔ گھر کی فضا ابھی تک مکر رہی تھی مگر زندگی کچھ معمول پر آ گئی تھی۔ نزہت مامی کچن میں بھی نظر آنے لگی
 تھیں۔

خوشنما کی کوشش ہوتی تھی اس کا اور ان کا سامنا نہیں ہو۔ کیونکہ جب وہ نخوت سے منہ بناتی تھیں اسے
 اپنی تضحیک ہی لگتی تھی۔

اس وقت بھی وہ روٹیاں بنا کے کچن سے نکل رہی تھی کہ ان سے ٹکراؤ ہو گیا۔ جھٹ سلام کر دیا۔
 ”وعلیکم السلام!“ بڑی نرمی سے جواب دیا تھا۔ خوشنما تو حیرت و انبساط میں ڈوب گئی۔ آج پہلی دفعہ

نزہت ماما نے اس کے سلام کا جواب دیا تھا وہ بھی اتنی نرمی سے۔
وہ شاید چائے وغیرہ بنانے آئی تھیں اس کی اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ پوچھ لے اور کچھ بنا دے۔ وہ کچن سے نکل گئی۔

”شاہدہ ماما میں نے روٹیاں بنا دی ہیں۔“ سنڈے تھا سب ہی اپنی اپنی مرضی سے جب موڈ ہوتا تھا کھانا کھاتا تھا۔

پیشم لگتا تھا نانا جان کے روم میں تھا۔ اس نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی انا کی وجہ سے اس سے مخاطب بھی نہیں ہوئی تھی۔ مگر جب یہ سوچتی پیشم نے اس کے ساتھ اب تک اچھا ہی کیا تھا اس کے کڑوے کیلے جملوں کے جواب میں کبھی بھی برا بھلا نہیں کہا تھا جب کہ وہی اسے سناتی ہی رہتی تھی۔ رونا کارشتہ بھی اشعر سے لگوادیا تھا ابو اور امی کی رات دن کی فکر رونا اور ایمین کی شادی تھی۔ وہ دوسرے فرض سے بھی سبکدوش ہونے جا رہے تھے اور یہ خوشنما کے لیے خوش کن بات ہی تھی۔

وہ نہانے کی تیاری کرنے لگی۔ ظہر کی نماز بھی پڑھنی تھی۔ اتنے میں وہ ایزی سے قمیض شلوار میں ملبوس بڑی گہری سوچ کے ساتھ اندر آیا تھا۔

اس نے پیشم کو دیکھا جو اسے ہی بغور دیکھ رہا تھا۔ گھبرا کے اس نے نگاہیں اپنے بالوں میں برش چلانے پر مرکوز کر دیں۔

اپنے دل میں میرے لیے احساس ہے جب ہی نانا جان سے یہ بات بھی کر لی۔ اسے بڑی خوشی ہو رہی تھی خوشنما اس کے لیے نرم گوشہ رکھتی ہے جب ہی تو اس نے یہ نکاح والا معاملہ نانا جان کو بتا دیا ورنہ وہ کتنا پریشان تھا۔

”تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں نانا جان کے علم میں ساری بات آچکی ہے۔“
”کون سی بات؟“ وہ ڈرینگ ٹیبل کے مرر سے اس کا کھلتا ہوا چہرہ دیکھ چکی تھی۔
”یہی کہ میں نے کوئی نکاح نہیں کیا اور جس لڑکی کو میں گھر لایا تھا وہ تم تھیں۔“
”سچ تو بتانا تھا نانا جان بہت پریشان تھے آپ کی طرف سے اس لیے میں نے سچ بتا دیا۔“ وہ نگاہ چرانے لگی۔

”اس کا مطلب تم بھی میرے لیے نرم جذبات رکھتی ہو۔“ وہ مبہم مسکراہٹ لیے اسے معنی خیزی سے دیکھتے ہوئے قریب آ گیا۔

”میں نے ایسا کب کہا؟“ وہ گڑبڑا گئی اور کھلے بالوں کو لپیٹ کے جوڑا بنا لیا۔
”خوشنما تم اب مجھ سے جھوٹ بول رہی ہو۔“ وہ سمجھ گیا تھا۔ ساری لڑکیاں انا کے چکر میں اپنا نقصان ہی کرتی ہیں اور خوشنما کو وہ ایسا کرنے نہیں دے گا اس سے اقرار تو سن کے ہی رہے گا۔
”میں کیوں جھوٹ بولوں گی آپ نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے وہ سب کیا کم تھا جو میں بھول کے آپ کے لیے ایسا سوچنے لگوں گی۔“ خوشنما کے ہاتھوں سے تو پسینہ ہی پھوٹنے لگا تھا۔ پیشم اس کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔

”سنو جھوٹ کو چھپانا بہت مشکل ہوتا ہے اور پھر جب میں تم سے اتنی محبت کرنے لگا ہوں مجھے یقین ہے میرے سچے جذبے ہی تمہیں میرے پاس لائیں گے۔“

”مجت اور جذبے۔“ وہ تمسخر اڑانے لگی۔

”یہ مجت اور جذبے اس وقت کہاں چلے گئے تھے۔“

”یار تم وہ بات دہرانا بند نہیں کرو گی لوگ تو برے دنوں کو بھول جانا پسند کرتے ہیں اور تم انہیں یاد ہی کرتی رہتی ہو یہ یاد کیوں نہیں رکھتی ہو میں تمہیں کتنا چاہنے لگا ہوں۔ مجت کرنے لگا ہوں تمہیں وارفتگی سے محسوس کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے خوشنما کو شانوں سے تھاما وہ گھبرانے لگی۔ وہ اتنی جلدی تو نہیں کھلنا چاہتی تھی۔

”کیا کر رہے ہیں چھوڑیں۔“

”تم کب سمجھو گی مجھے۔“ اس نے شانے چھوڑ دیئے۔ خوشنما اپنے کپڑے اٹھا کے واش روم میں گھس گئی۔

”دیکھتا ہوں تم مجھ سے کب تک بچو گی اقرار تمہیں کرنا ہی پڑے گا اور یہ میں کروا کے ہی رہوں گا۔ اس نے بھی جیسے مصمم ارادہ باندھ لیا تھا وہ خوشنما کو تمام تر جذبوں سمیت جیت ہی لے گا۔

☆.....☆

اس کے سامان کی وہ پیکنگ کر رہی تھی۔ ایک ایک چیز کی لسٹ بنائی تھی۔ سارے کپڑے پریس کر کے رکھے تھے۔ وہ بہت خاموش سی ہو گئی تھی۔ شہر یار نے بھی بلاوجہ روک ٹوک ختم ہی کر دی تھی۔ وہ حیران بھی تھی شہر یار تو ایک منٹ بھی اسے سنائے بغیر نہیں رہتا تھا۔

”اور کچھ چیز رہ گئی ہو تو وہ بھی مجھے بتادیں میں آپ کے سوٹ کیس میں رکھ دوں گی۔“ اس نے ٹاول تہہ کر کے اس کے بیگ میں رکھے۔

”آں ہاں بتادوں گا۔“ وہ بیڈ کی بیک کراؤن سے ٹیک لگائے لیٹا تھا۔

حسنی کا سنی کاٹن کے ایبمر ایڈری کے ملبے سے سوٹ میں الجھے بکھرے بالوں کے ساتھ بیٹھی تھی اس نے خود پر بھی توجہ دینا چھوڑ دی تھی دونوں کی شادی کو تین ماہ کا عرصہ ہی بمشکل گزر رہا تھا۔

”اچھا میں کچن میں جا رہی ہوں ماما کے لیے روٹیاں بنانی ہیں۔“

”حسنی کیا تم ابھی تک ناراض ہو۔“ وہ رک رک کے پوچھنے لگا۔ وہ حسنی کے چہرے کے رنگ بھی دیکھ رہا تھا جو پھیکے پڑ رہے تھے۔

”بھابی بنا دیں گی۔“ وہ اس کا راستہ روک کے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”بنا تو دیں گی مگر پھر آپ کی امی کی باتیں سننے کا مجھ میں دم نہیں شادی سے پہلے اپنی امی کی باتیں سنتی تھی اور شادی کے آپ کی امی کی میں تو جیسے باتیں ہی سننے کے لیے پیدا ہوئی ہوں۔“ وہ بہت افسردہ ہو رہی تھی۔

شہر یار نے جزبہ ہو کے لب بھینچے وہ طنزیہ بھی ہوتی جا رہی تھی حسنی تو ایسی نہیں تھی یا پھر وہ اسے سمجھتا تھا کہ وہ ہر بات کو سیریس نہ لینے والی ہو مگر وہ تو ہر بات کو اتنا گہرائی سے محسوس کرنے لگی تھی۔ اس کے ہونٹوں کی ہنسی بھی جیسے کہیں گم ہو گئی تھی۔

”میں اماں کو سمجھا دوں گا۔“

”کیا کیا سمجھائیں گے۔ کمرے میں پردے نہ لگنے کا، طعنہ دیتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ ہم نے تو اس لیے

نہیں لگائے تھے کہ تم جہیز میں لاؤ گی۔“
”اف یہ اماں بھی پتہ نہیں کیسی باتیں کرنے لگی ہیں۔“ وہ شرمندگی سے اپنی عرق آلود پیشانی صاف کرنے لگا۔

”وہ ایسی باتیں ہمیشہ سے کرتی آرہی ہیں۔ ابھی کوئی نئی نہیں کرتی ہیں۔“ اس نے طنز کرنے کے ساتھ شہریار کو شرمندہ کیا۔

”حسنی تم اتنی روکھی کیوں ہو رہی ہو۔“

”جب زندگی ہی روکھی ہو گئی ہو تو طبیعت اور مزاج میں اس کا اثر آ جاتا ہے۔“ وہ سائینڈ سے ہو کے جانے لگی۔

”اوہو تم تو آرٹسٹ ہونے کے ساتھ فلاسفر بھی بن گئی ہو۔“ مسکرا کے اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

”انسان کوئی اوپر سے فلاسفر بن کے نہیں آتا یہ سب حالات اور واقعات بناتے ہیں۔“ وہ شہریار کو دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

”اور یہ آرٹسٹ تمہیں کن حالات و واقعات نے بتایا۔“ وہ اسے باتوں میں لگا کے اس کا موڈ ٹھیک کرنا چاہ رہا تھا۔

”وہ سب میرے بے فکری کے شوق تھے مجھے ماحول ہی ایسا دیا گیا کہ اپنی مرضی سے کچھ بھی کروں۔“
”اچھا اپنی مرضی سے اس دن تو کہہ رہی تھیں تمہاری کوئی مرضی نہیں تھی۔ سب نے اپنی مرضی سے چلایا ہے۔“

”سینے پر بازو پلٹ کے وہ جیسے اسے لا جواب ہی کرنا چاہ رہا تھا۔

”میری مرضی میرے شوق کے لیے تھی اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کے لیے نہیں میری زندگی پر سب نے اپنی مرضی مسلط کی ہے۔“

”ارے واہ تمہارے پاس تو ہر طرح کا جواب ہے۔“ وہ ہنسا۔

”پلیز مجھے جانے دیں۔“

”جا تو میں رہا ہوں تم مجھے ایسے ہی جانے دو گی۔“ اس نے حسنی کا ہاتھ تھام لیا آنکھوں میں معنی خیزی تھی۔

”آپ اپنی مرضی سے آئے ہیں اور اپنی مرضی سے جا رہے ہیں۔ میں کون ہوتی ہوں اختیارات رکھنے والی۔“ آنکھوں میں نمی در آئی ان تین ماہ کے عرصے میں اسے شہریار سے سچ مچ کی محبت ہو گئی تھی۔

اسے اس کی عادت ہو گئی تھی۔ وہ حیران تھی کہ شہریار اس کے لیے اتنا اہم ہو گیا تھا کہ اس کے بغیر رہنے کا سوچ کے ہی آنکھیں ڈبڈبانا لگی تھیں۔ حالانکہ وہ بے عزت کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

پھر بھی وہ اس کے دل کے قریب ہو گیا تھا۔

”سارے اختیارات تو اب تم ہی رکھتی ہو۔“ اس نے شانوں سے پکڑ کے اسے اپنے سامنے کیا۔

حسنی نے بے یقینی سے اس کی آنکھوں میں دیکھا کہیں یہ مذاق تو نہیں یا خواب وہ اسے کئی لمحے تک دیکھتی رہی۔

”ایسے کپادیکھ رہی ہو۔“ اس نے بیڈ پر بٹھایا، حسنی کو حقیقت سمجھنے میں دیر لگ رہی تھی۔ کہیں یہ شہریار کا دوسرا روپ تو نہیں ہے، عزت کرنے کا وہ سارے طریقوں سے اس کا مسخراڑا چکا تھا۔

”ارے کیا ہوا؟“ شہریار نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

”تمہارے ہاتھ بہت نرم ملائم ہیں۔ پینٹنگ سیکھنے کے ساتھ کیا ہاتھوں کو نرم ملائم بنانے کا بھی کورس کر رہی تھیں۔“

”جی نہیں۔“ وہ جھینپ گئی اور اپنے ہاتھ کھینچ لیے۔

”یہ بھی کوئی طنز ہے یا مذاق۔“ وہ جیسے کسی خوش گمانی میں نہیں رہنا چاہتی تھی۔ یہاں تو اسے سب کتنا خوب صورت کہتے تھے۔ اس کی فرینڈز اور ماما سے تو دیکھتے نہیں کھکتی تھیں۔ باقاعدگی سے پارلر ضرور بھیجتی تھیں تاکہ خوب صورت ہی نظر آئے۔ سارا زمانہ اس کی تعریفیں کرتا تھا اور اسے بھی تو کتنا عروہ ہو گیا تھا اس کے لیے لڑکوں کی کمی ہے مگر جب شہریار اسے بے دردی سے سنا تا تھا اس کا دل ہی خراب ہو جاتا تھا۔ ہر وقت موٹی ہونے کا طعنہ دیتا تھا اور وہ بھی کانٹس رہنے لگی تھی۔

”میں کوئی مذاق اور طنز نہیں کر رہا بلکہ سچ کہہ رہا ہوں یہ الگ بات ہے کہ مجھے عادت نہیں ہر وقت تعریفیں کرنے کی اور میں کہتا ہوں انسان کی صورت سے زیادہ وہ سیرت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔“ وہ ساتھ ہی اس پر یہ واضح کرنا چاہتا تھا وہ خوب صورتی کے پیچھے بھاگنے والوں میں سے نہیں ہے۔ وہ حقیقت پسند اور بردبار طبیعت کا تھا۔ حسنیٰ سے اسے بچپن سے ہی کچھ لگاؤ تھا اور پھر بڑے ہونے کے ساتھ محبت کا جذبہ بھی پروان چڑھا مگر جب حسنیٰ نے اس کا رشتہ رد کیا شہریار کو بہت غصہ آیا تھا مگر اسے بھی ضدھی وہ اپنے آپ کو بہت اعلیٰ بنا کے دکھائے گا اس کی جاب کینیڈا میں لگی تو نسرین کی نگاہ شہریار پر ہی ٹک گئی وہ حسنیٰ کو حاصل کرنے کے لیے خود کو اس مقام تک لایا تھا۔

”میں نے تو کبھی یہ بھی نہیں سوچا کہ میں خوب صورت ہوں لیکن آپ موٹی موٹی کہتے تھے مجھے بہت غصہ آتا تھا۔“

”اگر تم خوب صورتی سے زیادہ اپنی سیرت اور عادت پر دھیان دیتیں تو تمہیں یہ دن دیکھنا نہیں پڑتا خود کو گھر کے کاموں میں لگاتیں تو موٹی بھی نہیں ہوتیں۔“

”میری امی کرواتی تو تھیں سل تک پر چٹنی پسوائی انہوں نے میمانے تو مجھے بل کر پانی نہیں پینے دیا۔“

”پھپھو کو تمہاری فکر تھی اسی لیے وہ تم سے کام کرواتی تھیں تاکہ تمہیں عادت ہو۔“

”یہ کیسی فکر تھی کہ بیٹی پراتنے کام لادو۔“ وہ بولی۔

”پھپھو کو تمہاری شادی کی فکر تھی جب کہ تمہاری ماما تو کبھی کہتی ہی نہیں ہوں گی کہ تمہاری شادی ہو۔“

شہریار اس کے ذہن و دل پر لگی بدگمانی کی دھند صاف کرنے میں لگ گیا۔

”ہاں یہ آپ نے ٹھیک کہا۔“

”اگر تمہاری ماما بھی کام کرواتیں تو تم ایسی نہیں ہوتیں بلکہ بڑھ بڑھ کے کام کرتیں۔“

”میں کبھی شادی کے متعلق سوچتی ہی نہیں تھی۔ سب کچھ تو مل جاتا تھا۔“

”حسنیٰ زندگی ان آسائشوں کے سہارے پر ہی نہیں گزارتی جاتی ہے کہیں نہ کہیں زندگی کے حصے میں

ہمیں کسی کی ضرورت ضرور پڑتی ہے۔“ اس نے پھر حسنیٰ کا ہاتھ پکڑا۔

”تم بڑی ہو گئی ہو اور شادی شدہ بھی کوئی تم پر زبردستی اپنی مرضی نہیں مسلط کرے گا۔ پھپھو نے جو بہتر

سمجھا وہ کیا اور ایک ماں، بیٹی کو چاہتی ہے کہ گھر کے کام کاج میں طاق ہو۔“

”میری امی نے کون سا میرے لیے کچھ کیا اپنے گھومنے پھرنے کی پرواہ کی اور مجھے ماما کی گود میں کیوں دیا۔“ اسے یہی احساس تو مارتا تھا۔

”پھپھو کو صرف تمہاری پھپھو کا خیال کیا تھا کہ وہ اکیلی ہیں پھر انہوں نے خود تمہیں مانگا تھا۔ پھپھو کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ تم ان سے بالکل ہی متنفر ہو جاؤ گی۔“

”یہ آپ ایسے کیسے کہہ سکتے ہیں۔“ وہ حیرانگی سے پوچھنے لگی۔
”پھپھو نے اس دن خود اماں سے کہا تھا جب وہ تمہیں گھر لے جانا چاہ رہی تھیں۔ تم تو غصے میں اٹھ کر چلی گئی تھیں۔“

”ہوں۔“ وہ اتنا ہی بول سکی۔

”حسنی آنٹی دادی جان بلا رہی ہیں۔“ زین کی آواز آئی۔

”اف مجھے روٹی بنانی ہے۔“ وہ تیزی سے اٹھ کر جانے لگی۔

شہریار اپنی بات ادھوری رہ جانے پر ہتھیلی پر مکار کے رہ گیا۔

☆.....☆

حباب نے آج بڑے دل سے کمرے کی صفائی کی اور خود بھی نہادھو کے اچھا سا سوٹ پہنا آج وہ اور رضوانہ آدم کا رشتہ لے کے راشدہ پھپھو کے ہاں جا رہی تھیں اور وہ اس لیے بھی خوش تھی کہ ضمیر ان سے معافی مانگ لے گی اپنے سر دروپیے کی۔ حسنی نے اسے سمجھایا تھا اور اس کی سمجھ بھی آ گیا تھا ضمیر ان تو اس سے بہت محبت اور پیار کرتا تھا جو اب میں وہ اسے اگور ہی کرتی آرہی تھی۔ بلیو جڈیڈا سٹائلش سوٹ میں وہ اپنے دراز بالوں کی چوٹی بنائے لائٹ میک اپ میں بہت دلکش اور حسین ترین لگ رہی تھی۔ عتیق احمد مٹھائی وغیرہ منزل کے ساتھ خود جا کے لائے تھے۔

ضمیر ان بھی تیار ہو کے آ گیا تھا۔ فنان کلر کے نمبض شلوار میں تک سک سے تیار ڈیٹنگ لگ رہا تھا۔

”آپ لوگ اتنی تیاریاں کر کے جا تو رہے ہیں وہاں کے حالات کا تو پتا کر لیتے کیونکہ راشدہ پھپھو، کافی عرصے سے آئی نہیں ہیں۔“ طلحہ نے ان سب کی تیاری دیکھنے کے بعد کہا۔

”جاتے وقت کوئی فضول بات نہیں کرو اچھا سوچ کے جا رہے ہیں۔ اچھا ہی ہوگا۔“ رضوانہ اسکن کلر کے نیٹ کے کپڑوں میں بہت سویر اور پروقار لگ رہی تھیں۔

”امی میں تو ایک بات کہہ رہا ہوں۔“ وہ جربز ہو کے صوفے پر ہی نیم دراز ہو گیا۔

حباب ایک لمحے کو ٹھٹھک کے سوچ میں پڑ گئی وہ ضمیر ان سے مخاطب ہوئی۔

”سنئے طلحہ ویسے ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ ضمیر ان نے بغور اسے دیکھا آج کیسے استحقاق سے وہ اس سے مخاطب ہوئی تھی۔ کچھ دنوں سے اس کی حرکات و سکنات بھی نوٹ کر رہا تھا وہ اس سے روکھی گفتگو نہیں کر رہی تھی بلکہ اس کی ہر چیز اور بات کا خیال کر رہی تھی۔

”آپ کی امی ابھی تک نہیں آئیں۔“ رضوانہ کو اپنی ساس کا بھی خیال تھا۔ رات ہی تو وہ عتیق احمد سے کہہ رہی تھیں انہیں ضرور لے کے جانا ہوگا۔

”میں نے انہیں نہیں کہا تھا جانے کو اور نہ ہی رشتے کے بارے میں۔“

”مگر کیوں۔“ رضوانہ نے حیرانگی سے انہیں دیکھا۔

”وہ راشدہ کو پہلے سے بتا دیتیں اس لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ وہاں یہ بات پہلے نہیں پہنچی چاہیے تھی۔“ عتیق احمد خاصے سنجیدہ تھے۔

ضمیر ان اور حباب کچھ بولنا ہی چاہتے تھے۔ عتیق احمد کے ہاتھ کے اشارے نے انہیں چپ رہنے کو کہا۔

”کوئی بھی بحث نہیں ہوگی میں جو بہتر سمجھ رہا ہوں وہ کر رہا ہوں جب تک راشدہ یہ رشتہ قبول نہیں کر لیتی میں امی کو خود سے نہیں بتاؤں گا۔ کیونکہ امی راشدہ کو مجبور بھی کر سکتی ہیں اور میں راشدہ کے دماغ کو اچھی طرح جانتا ہوں، کیا کیا سوچ سکتی ہے۔“

”ارے آپ بھی کیا باتیں لے کے بیٹھ گئے۔“

”رضوانہ تم میری بات کاٹنے کی کوشش مت کرو ہر جگہ تمہاری نہیں چل سکتی مانتا ہوں مجھ سے زیادہ بچوں پر حق تمہارا ہے مگر میں ہر بات کا ازالہ کرنے کے لیے صحیح اور غلط میں فرق ضرور رکھوں گا کوئی فیصلہ وہ بھی بچوں کے معاملے میں غلط نہیں ہونے دوں گا۔“ وہ لب بھینچ کے رہ گئیں۔ آدم نے بھی ان کی بات سنی تھی۔ عتیق احمد ایک ذمے دار باپ کی طرح ہر بات کا خیال کر رہے تھے اور اسے یہ خوشی ہوئی تھی۔ وہ ان سب کو بہت عزیز رکھتے تھے۔

”اب جلدی نکلو بہت دیر ہو گئی ہے۔“ عتیق احمد نے پھر ان سب کو چلنے کا کہا۔

ابھی وہ سب جانے کے لیے نکل ہی رہے تھے۔

سرفراز صاحب کو دیکھ کر سب متحیر زدہ رہ گئے۔ راشدہ اور ان کی تینوں بیٹیاں بھی تھیں راشدہ کا اتنی تیاریاں دیکھ کر ماتھا ٹھنکا تھا۔

نوشین کرن اور نوین ان سب سے سلام دعا کرنے لگیں ان سب کو نوشین کے اتنے بدلے روپ پر حیرانگی ہو رہی تھی۔

”آپ سب لوگ لگتا ہے کہیں جا رہے تھے۔“

سرفراز صاحب نے مشائی کے بڑے بڑے دو ڈوبے گولڈن ریپنگ میں پیک دیکھے۔

”مامی لگتا ہے کسی خاص مقصد کے لیے جا رہی ہیں آپ لوگ؟“ نوین نے حباب کو بھی اتنا تک سک سے تیار دیکھا۔

”ہاں۔“ وہ مسکرائی تھیں۔

”پھوپھا جان! آج آپ کو اتنے عرصے بعد اپنے گھر میں دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔“ ضمیر ان کو واقعی ان کی آمد پر بہت خوشی ہو رہی تھی۔

”میں یہاں آنا چاہتا تھا مگر اس شرمندگی میں نہیں آتا تھا راشدہ نے جانے کیا کیا کہہ کے عتیق بھائی کو آپ سب کی طرف سے بدظن کر کے گھر روکا ہوا تھا میں کتنا راشدہ کو سمجھاتا تھا مگر انہیں تو جیسے یہ ضد سوار تھی کہ رضوانہ بھابی کو خوش نہیں رہنے دے گی کیونکہ انہیں جانے کیوں آپ سب سے اتنا بیر تھا۔“ راشدہ لب بھینچے سر جھکائے جانے غصہ میں تھیں یا شرمندگی میں تھیں۔

(جاری ہے)

اس کی مٹی کا ترن

”السلام علیکم بی جان کیسی ہیں آپ؟“ فون کے دوسری جانب سلینہ تھی۔
”ارے..... وعلیکم السلام کیسی ہو میری جان اور بڑے دن بعد فون کیا خیریت تو تھی نا؟“ بی جان نے
سلام کا جواب دیتے ہوئے شائستگی سے پوچھا۔
”جی بی جان! سب خیریت تھی۔ بس وہ حماد کے چھوٹے چچا اپنی فیملی کے ساتھ امریکہ سے آئے ہوئے
تھے، بس ان کی مصروفیت تھی۔“ سلینہ نے خیریت کی بابت بتایا۔
”ہوں چلے گئے کیا؟“ بی جان نے پوچھا۔
”نہیں اب اسلام آباد اپنے گھر چلے گئے ہیں۔“
”بچے ٹھیک ہیں؟“



READING
SECTION

”جی بی جان! سب ٹھیک ٹھاک ہیں آپ بتائیں عدیل کا کوئی فون آیا۔“ سلینہ نے بھائی کے بارے میں دریافت کیا۔

”ہاں کل آیا تھا میرے بچے کا فون۔ اللہ سے لمبی زندگی دے میں اس کی خوشیاں دیکھوں۔“

بی جان کے لہجے میں شفقت اور نرمی کی مٹھاس دبی تھی۔ دوسری جانب سلینہ نے آئین کہا اور مسکرا دی۔

”اچھا بی جان! جس کام کی وجہ سے میں نے فون کیا وہ تو میں بھول ہی گئی۔“ سلینہ کو کچھ یاد آیا تھا۔

”ہاں بولو۔“ بی جان ہمہ تن گوش ہوئیں۔

”بی جان! عدیل کے بارے میں کیا سوچا ہے آپ نے۔“

”کیا مطلب؟“ بی جان نا سمجھی کے عالم میں گویا ہوئیں۔

”ارے مطلب یہ بی جان کہ کب اس کو رشتہ ازدواج میں باندھنا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔

”سلینہ تمہاری گھما پھرا کر بات کرنے والی عادت ابھی تک گئی نہیں۔ سیدھی طرح نہیں بتا سکتی تھیں۔“

مکمل ناول



بی جان نے اسے ڈپنا اور پھر بولیں۔

”میری تو یہ دلی خواہش ہے کہ عدیل کے سر پر سہرا سجا دیکھوں لیکن وہ مانے تو ناں۔“ بی جان نے افسردگی سے اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

”بی جان! اس کی منگنی کو دو سال ہونے کو آرہے ہیں، کل میں، شمینہ آنٹی کے ہاں گئی تو انہوں نے باتوں ہی باتوں میں اس قصے کی جانب اشارہ کیا تو میں کچھ نہ کہہ سکی۔ بی جان بیٹیوں کے ماں باپ کی سو مجبوریاں ہوتی ہیں وہ کب تک اسے گھر بٹھائیں، آخر لوگ تو باتیں بناتے ہیں کہ پتا نہیں کیا وجہ ہے جوڑ کی ابھی تک گھر بٹھائی ہوئی ہے۔“ سلینہ نے تفصیلاً بات کی تھی اور اس کی یہ باتیں سن کر بی جان بھی سوچ میں پڑ گئی تھیں۔

”اچھا..... اب فون کیا تو میں سنجیدگی سے بات کروں گی۔“ اماں بی نے جوابا کہا تھا۔

”گھر کب تک آرہا ہے؟“ سلینہ نے پوچھا۔

”کہہ رہا تھا کہ شاید ہفتے تک چکر لگائے۔“ بی جان نے بتایا۔

”اچھا بی جان! شاید زینب اٹھ گئی ہے اب فون رکھتی ہوں۔“ سلینہ نے اجازت چاہی تھی اور بی جان نے اللہ حافظ کہہ کر فون کرڈل پر رکھ دیا۔

☆.....☆

”ماہا بیٹا! آج تین چار ڈشز ساتھ اور بنا لینا۔“ شمینہ بیگم نے کچن میں آتے ہی ماہا سے کہا تھا۔

”کیوں امی جان مہمان آرہے ہیں کیا؟“ اس نے جوابا پوچھا۔

”ہاں سلینہ آرہی ہے اور ساتھ شاید اس کی ساس وغیرہ۔“ شمینہ نے ٹماٹر سٹارپر سے نکال کر ٹوکری میں رکھتے ہوئے کہا اور دو ٹماٹر علیحدہ نکال کر کاٹنے لگیں۔

”امی کوئی خاص بات ہے؟“ وہ جھجکتے ہوئے بولی تھی۔

”پتا نہیں۔ اب یہ تو ان کے آنے پر ہی پتا چلے گا۔“ شمینہ بیگم کاٹے ہوئے ٹماٹر پلیٹ سے ڈھک کر فریج

میں رکھنے کے لیے مڑ گئیں جب کہ ماہا کچھ سوچ کر آپ ہی آپ مسکرانے لگی۔

سوئی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد

قدم قدم آباد تجھے قدم قدم آباد تجھے

ٹی وی پر کوئی قومی میوزیکل پروگرام چل رہا تھا اور بی جان، شبو (نوکرانی) کے ساتھ بیٹھیں دن کے گولوں

سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں کہ اچانک شبو اکتا کر بولی۔

”بی جان! یہ کیا لگا رکھا ہے کوئی ڈرامہ لگائیں ناں اشار پلس لگا دیں انڈیا کے بڑے اچھے ڈرامے لگتے

ہیں۔“ ابھی شبو کی بات ادھوری ہی تھی کہ بی جان نے اس کی کمر پر زور کا دھموکا جڑا۔ شبو اس پر بلبلا کر رہ گئی۔

”اری کم بخت کیڑے پڑیں موئے انڈیا کو، ستیاناس ہو دو، جو فحاشی کا بازار گرم کیے ہوئے ہیں اور تیرے

جیسے لوگ ڈوب مریں جو فحاشی کے پروگرام دیکھتے ہیں چلو بھر پانی میں ڈوب مر کم بخت ماری، ارے یہ وہی

ہیں جن کو مسلمان ایک آنکھ نہیں بھاتے، پاکستان کو تباہ کرنے کی سازشیں کر رہے ہیں دہشت گردی پھیلا

رہے ہیں لیکن ہم مسلمان بس انڈیا کے ڈرامے گانے فلمیں دیکھ دیکھ کر آنکھیں بند کر بیٹھے ہیں۔ ارے ذرا

اپنے کشمیر کی مثال لو، ارے ہمارے پاکستان کا جگر کا ٹکڑا ان مردودوں کے پاس ہے، ارے وہاں لاکھوں مسلمان روز شہید ہو رہے ہیں۔ عورتوں کی عزت لنتی ہیں۔ بچے اسکولوں میں نہیں جاسکتے۔ یہ سب ہمیں نظر نہیں آتا۔ میں ان کم بختوں کے ڈرامے دیکھ لوں۔“

بی جان کو جلال آگیا تھا وہ کبھی کبھی غصہ ہوتی تھیں لیکن جب ہوتیں تو پھر کسی کی نہیں سنتیں اور اپنے پاکستان سے تو انہیں حد سے زیادہ پیار تھا۔ لگاؤ تھا۔ اس کے خلاف تو وہ ایک لفظ نہیں سن سکتیں تھیں اور دوسری بات وہ ایک جانباز سپاہی کی بیوی تھیں تو کیسے پاکستان سے پیار نہ ہوتا، جنہوں نے سپاہی فضل کے ساتھ شادی کی۔ پہلی رات یہی کہا تھا کہ وہ پاکستان کی خاطر ہر دکھ تکلیف برداشت کریں گی۔ پھر انہوں نے یہ عہد خوب نبھایا۔ شوہر کو پاکستان کی خاطر قربان کر دیا۔ یہ بڑا دکھ انہوں نے ہنس کے برداشت کیا تھا۔ پر دوسرا دکھ انہوں نے اپنا آبائی گھر اپنے تین سالہ عدیل اور پانچ سالہ سلینہ کے ساتھ چھوڑا تو انہوں نے اف تک نہ کیا وہ خوش تھیں کہ وہ اپنے پاکستان کی خاطر یہ سب برداشت کر رہی ہیں اور اب وہ شہو کی بات سن کر ہتھے سے اکھڑ گئیں کیونکہ شہو نے ان کے مزاج کے خلاف جو بات کی تھی۔

☆.....☆

”ارے ماہا! کہاں ہو، دو دن سے یونی نہیں آرہی۔ زرینہ بھی تمہارا پوچھ رہی تھی۔“ وہ واش روم سے باہر نکلی ہی تھی کہ فون کی بیل نے اسے متوجہ کیا۔ اس نے لپک کر جلدی سے فون اٹھایا ہی تھا کہ نازنین کی چیختی آواز سن کر وہ مسکرا کر رہ گئی۔

”میں مصروف تھی تمہیں پتا تو ہے۔“ وہ شرمائی شرمائی سی بولی تھی۔

”ارے واہ تو موصوف کی وجہ سے چھٹیاں ہو رہی ہیں۔“ نازنین چٹکے چھوڑنے لگی تھی۔

”اب تمہاری اوٹ پٹانگ باتیں یونیورسٹی آکر سنو گی۔ فی الحال۔ I am busy۔“ اس نے جان چھڑائی۔

”اچھا، اچھا اب زیادہ مس ورلڈ بننے کی ضرورت نہیں۔ پتا ہے کیپٹن عدیل فضل کی زوجہ محترمہ بننے جا رہی ہو۔“ وہ ابھی بھی شرارت کے موڈ میں تھی۔

”بد تمیز کہیں کی۔“ ماہا نے جواباً کہا۔

”ارے اب تو ہم بد تمیز ہی لگیں گے ناں تمیز والے جو مل گئے ہیں۔“ وہ اب کہاں باز آنے والی تھی۔ شرارت پر شرارت کیے جا رہی تھی۔

”تو بہ ہے تم سے اللہ حافظ۔“ اس نے فوراً فون کاٹ دیا اور باہر کی جانب چل دی۔

☆.....☆

”ارے یار عدیل! گھر کب جا رہا ہے تو؟“ سلیمان نے واش روم سے آتے عدیل سے پوچھا تھا۔

”بس یار! پروگرام بنا رہا ہوں لیکن ٹائم ہی نہیں نکل رہا بی جان بس ناراض ہو رہی ہیں لیکن یار تمہیں تو پتا ہے ناسوات کے حالات کیا ہیں۔ میجر شیردل بار بار بلا رہے ہیں اور شاید حالات زیادہ سنگین ہونے پر آپریشن کرنا پڑے تجھے پتا ہے میجر عرفان کتنے سخت ہیں اور آج کل ان ہی کی ڈیوٹی ہے۔“ اس نے گیلا تولیہ اسٹینڈ پر لٹکایا اور اسٹڈی ٹیبل پر آ بیٹھا۔

”ارے یار! تیری تو منگیتر بھی ہے ناں؟“ سلیمان نے پوچھا۔

”ہاں یار! بس زیادہ ٹینشن تو اس بات کی ہے وہ میری اور ماہا کی شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن میں ابھی اس کے لیے تیار نہیں ہوں یار۔“ سلیمان اس کا بچپن کا دوست تھا۔ اس لیے وہ اس سے ہر دل کی بات کہہ لیا کرتا تھا۔

”لیکن عدیل! یہ بھی تو غلط ہے نا کہ کسی کو انتظار کی سولی پر لٹکایا جائے۔“ سلیمان نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

”بس یار! یہی تو سوچ رہا ہوں، کیا کروں۔“

”تو ماہا بھابی سے بات کر پھر آگے کا معاملہ سوچنا۔“ سلیمان نے اسے معقول مشورہ دیا اور عدیل محض سر ہلا کر رہ گیا۔

☆.....☆

”ماہا آپنی! نیچے مہمان آئے ہیں۔ امی کہہ رہی ہیں جلدی نیچے آئیں۔“ زویا نے آتے ہی امی کا بلاوا دیا اور جھٹ باہر نکل گئی۔ وہ کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھی، کپڑے ٹھیک ہی تھے، بس منہ ہاتھ دھونا تھا۔ وہ جھٹ سے واش روم میں کھس گئی اور دو منٹ بعد وہ نیچے کچن میں تھی۔ کچن میں بو اور زویا مختلف چیزیں پلیٹوں میں بھر رہی تھیں۔ اسے آتے دیکھ کر بو اسکرادیں جب کہ زویا نے وکٹری کا نشان بنایا۔ وہ اس کی شرارت سمجھ کر ہنس دی۔

”چلیں ماہا آپنی! چیزیں تیار ہیں ٹرالی باہر لے جائیں۔“ زویا نے پلیٹیں رکھتے ہوئے کہا تھا۔

”زویا! کون..... کون آیا ہے؟“ اس نے باہر جاتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کی نند صاحبہ تشریف لائی ہیں۔“ زویا مسکراتے ہوئے بولی اور کچن سے باہر نکل گئی جب کہ اس نے بھی زویا کی تقلید میں باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

☆.....☆

سوات کے حالات کافی خراب ہو رہے تھے۔ فوجی جوانوں کی تعیناتی سوات میں موجود کیمپوں میں کی جا رہی تھی۔ میجر فرقان، میجر شیردل، کیپٹن عدیل کی ڈیوٹی بھی آج کل وہیں تھی۔ اس افراتفری میں وہ گھر فون بھی نہ کر سکا کہ اپنے نہ آنے کی اطلاع کر دے۔ پتا تھا بی جان اور سلینہ ناراض ہوں گی لیکن وہ کوشش بھی نہ کر سکا اب سوچ رہا تھا کہ اگلے ہفتے کا کوئی پکا پروگرام بنائے لیکن جیسے حالات تھے ناممکن تھا اور اسے گھر سے زیادہ یہاں کی فکر تھی۔ اس لیے وہ سب کام پس پشت ڈالے آپریشن کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

”اری، شبو کسی وقت تو تیزی سے ہاتھ چلا لیا کر، تجھے چائے بنانے بھیجا تھا۔ پائے پکانے نہیں اری کم بخت سو گئی کیا۔“ بی جان نے لاؤنج مہس بیٹھے ہی شبو صاحبہ کو اوپچی ہانک لگائی تھی۔

”آئی بی جان۔“ شبو زور سے بولی۔

”ارے جہاں آراء تیری شبو تو بڑی ست اور کاہل ہے۔“ بی جان کی خاص سہیلی فریدہ آپا آئیں ہوئی تھیں۔ فریدہ آپا اور بی جان کی دوستی کافی پرانی تھی۔ فریدہ آپا کے شوہر کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔ تینوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ ایک بیٹی امریکہ اور دوسری دبئی میں مقیم تھی۔ فریدہ آپا بیٹے اور بہو کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ بیٹا ابھی تک بے اولاد تھا۔ بس فریدہ آپا کو یہی غم کھائے جا رہا تھا کہ بیٹے کی گودا بھی تک سونی ہے۔ وہ کب دادی بنے گی اور بی جان انہیں سمجھاتی تھیں کہ اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ وہ

اپنے بندوں کو مایوس نہیں کرتا، بس اچھی امیدیں رکھنی چاہئیں۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے لیکن فریدہ آپا جب بھی آتیں یہ موضوع ضرور گوش گزار کرتیں۔

”ارے اوشبو تیرا ستیا ناس کہاں مر گئی۔“ بی جان نے دوبارہ ہانک لگائی تھی لیکن اس دفعہ مس شبو کو رحم آگیا تھا وہ چائے سمیت تشریف لے آئی تھی۔

”تو بہ ہے شبو، بڑی کاہل ہے تو۔“ فریدہ آپا نے اس کی شان میں قصیدہ کہا۔

”ارے فریدہ بی! آپ بھی ناں ہر وقت شبو کاہل، شبو کاہل لگائے رکھتی ہیں۔ جب بھی آتی ہیں کبھی تو محبت بھرا جملہ کہہ دیا کریں جیسے شبو ڈارلنگ، سوسو میٹ، اینڈ کیوٹ اف شرم آگئی۔“ وہ آنکھیں مٹکا مٹکا کر بولی پھر سے لالولال ہو گئی۔

”ہائے تو بہ تیری یہ شبو تو نری ایکڑ ہے۔“ فریدہ آپا اس کے یہ چونچلے دیکھ کر بوکھلا گئیں جب کہ بی جان نے اسے خونخوار نظروں سے گھورا تھا لیکن جب وہ متوجہ کہاں تھی لیکن بی جان کا کمر پر جوتا لگنے پر ہڑبڑا کر اچھل پڑی تھی۔

”تیری شرم میں ابھی نکالتی ہوں۔“ بی جان نے دوسرا جوتا اتارتے ہوئے کہا لیکن وہ تیزی سے بھاگ گئی۔

☆.....☆

یہ کون سی ہیں
جن کے ہاتھوں سے اشرفیاں چھن چھن چھن
دھرتی کے پیہم پیاسے
کشکول کو بھرنی جاتی ہیں

آج صبح ہی اطلاع ملی تھی کہ سوات کے آپریشن میں موجود دو فوجی کمپنیوں کو دھماکے سے اڑا دیا گیا تھا جس کے نتیجے میں سولہ فوجی جوان شہید ہو چکے تھے۔ یہ افسوس ناک خبر سن کر ہر آنکھ اشکبار تھی۔ بی جان نے جب یہ خبر سنی تو دہل کر رہ گئیں۔ انہوں نے فوراً سے پیسٹر عدیل کو فون ملایا تھا لیکن ہر بار رابطہ منقطع ہو جاتا تھا۔ بی جان کو پریشانی نے آگھیرا تھا۔ انہوں نے فوراً سلینہ کو کال ملائی۔

”سلینہ میرا بچہ۔“ بی جان نے روتے ہوئے کہا تھا۔

”ارے بی جان! صبر کریں پلیز۔“ سلینہ ان کے رونے سے گھبرا گئی تھی۔

”سلینہ میرا عدیل فون نہیں اٹھا رہا۔“ بی جان خوف و خدشے سے لرز رہی تھیں۔

”ارے بی جان میری اور کامران کی عدیل سے بات ہوئی ہے وہ خیریت سے ہے۔ جو سانحہ ہوا ہے

اس میں مصروف ہے اور ابھی آپ کو فون بھی کرے گا۔ مت روئیے آپ۔“ سلینہ نے انہیں تسلی دی تھی بی جان یہ سن کر مطمئن ہو گئی تھیں۔

”ارے ماہا، جلدی سے سلینہ کو فون تو ملاؤ ابھی ابھی نیوز چینل سے دہشت ناک خبر سن کر میرا تو دل گھبرا گیا ہے۔“ شمینہ بیگم نے اس کے کمرے میں آتے ہی پریشانی سے کہا تھا۔ وہ یہ سن کر ساکت رہ گئی تھی۔

”امی جان! خیریت تو ہے، کہیں.....“ کسی خدشے کے تحت الفاظ بھی ٹوٹ ٹوٹ کر منہ سے نکل رہے

تھے
READING
Section

”اللہ خیر ہی کرے فون کرو جلدی۔“ شمیمہ بیگم نے دوبارہ کہا اور تیزی سے باہر نکل گئیں۔
 وہ تذبذب سے کھڑی تھی کہ فون کرے یا نہیں، جھجک بھی آڑے آرہی تھی لیکن بہر حال فون تو کرنا تھا۔
 اس نے فون بک سے سلینہ کا نمبر نکالا اور پھر لیس کا بٹن دبا دیا۔ تیسری بیل پر ہی فون اٹھا لیا گیا تھا۔
 ”ہیلو، جی کون؟“ دوسری جھلنب سلینہ مخاطب تھی۔
 ”السلام علیکم سلینہ آئی۔“ وہ جھکتی ہوئی بولی۔
 ”وعلیکم السلام، ماہا تم کیسی ہو؟“
 ”میں ٹھیک، آپ کیسی ہیں۔“ وہ بولی۔
 ”میں بھی ٹھیک۔“

”وہ امی آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔“
 ”او کے دو۔“ سلینہ نے کہا اور وہ فون ہولڈ کرتی امی کے کمرے کی جانب چل دی۔
 ”عدیل بس اب تم جلدی سے گھر آ جاؤ، مجھے کچھ نہیں سننا۔“ بی جان، عدیل پر غصہ ہو رہی تھیں۔
 ”بی جان! تجھے آپ یہاں کی کنڈیشن ایسی نہیں ہے کہ میں آنسکوں۔“ اس کا لہجہ نرم اور فکر سے لبریز تھا۔
 ”تو ٹھیک ہے تم دو دن کی چھٹی لے لو تو نکاح کر کے واپس چلے جانا۔“ بی جان نے دھماکا کیا۔
 ”بی جان! اتنی جلدی کیسے؟“ وہ لڑکھڑا گیا تھا۔
 ”اتنی جلدی.....! ارے واہ عدیل دو سال کی منگنی کو تم جلدی کہہ رہے ہو، بیٹا ہر ذمہ داری میں تناسب رکھنا چاہیے۔ مجھے تم سے زیادہ اپنے ملک کی فکر ہے لیکن دنیا داری اور رشتوں کو بھی دیکھنا چاہیے۔ وہ لڑکی والے ہیں اور تم جانتے ہو لڑکی کے ماں باپ کی کیا کیا مجبوریاں ہوتی ہیں۔ بس میں اور کچھ نہیں کہوں گی تم سمجھدار ہو۔“

”لیکن بی جان.....“ بی جان نے فوراً فون کاٹ دیا تھا۔

☆.....☆

”ہاں سلینہ! میں تو پریشان ہو گئی تھی، چلو شکر ہے تسلی ہو گئی۔“ وہ شمیمہ کو فون پکڑا کر وہیں پاس ہی بیٹھ گئی تھیں اور اب ان کی گفتگو سن رہی تھی۔
 ”سلینہ! ایک بات کہوں؟“ شمیمہ نے اس کی جانب دیکھا تو وہ گھبرا گئی۔
 ”جی آئی کہیے۔“ دوسری جانب سلینہ بولی۔

”سلینہ میں اب چاہتی ہوں ماہا کے فرض سے جلد سبکدوش ہو جاؤں، پھر مجھے زویا کی طرف بھی دھیان دینا ہے۔ وہ بھی عمر کے ایک حصے کو پہنچ رہی ہے۔ میں چاہتی ہوں جلد سے جلد دونوں کے فرض سے فارغ ہو جاؤں میں۔“

”جی آئی! میں بھی یہی چاہتی ہوں اور بی جان کی بھی یہی خواہش ہے کہ ماہا جلد از جلد ہمارے گھر آجائے اور بی جان اور میری عدیل سے بات ہوئی ہے بس وہ جیسے ہی گھر آئے گا نکاح کر لیں گے۔“ سلینہ نے ان کی بات کے جواب میں کہا۔ ادھر ماہا سے بیٹھنا دو بھر ہو رہا تھا۔ وہ شرم سے پانی پانی ہو گئی تھی۔ شمیمہ بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر مسکرا دیں۔
 ”اچھا سلینہ اللہ حافظ۔“ شمیمہ نے فون بند کر دیا۔

”امی سب ٹھیک ہے ناں۔“

”ہاں بیٹا! سب ٹھیک ہے بس تم جلدی سے زمین کو فون کرو۔“ انہوں نے فون سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

”کیوں امی۔“ ماہانے نا کبھی کے عالم میں پوچھا۔

”تمہارا ویڈنگ ڈریس، وہی ڈیزائن کر لے گی اس لیے پاگل۔“ شمینہ نے اسے چپت لگائی وہ یہ سن کر شرمائی۔

☆.....☆

پھر دونوں طرف شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے تھے۔ دوسری طرف عدیل حد سے زیادہ مصروف ہو گیا تھا کیونکہ آرمی چیف نے ان سب کی تعیناتی متاثرہ علاقوں میں لگادی تھی۔ ایسے میں اسے سلیمان کی بات بھی بھول چکی تھی نہ وہ سلینہ کو فون کر سکا تھا اور نہ ماہا کا نمبر لے سکا تھا۔ وہ کافی مصروف تھا کیونکہ وہ چاہتا تھا جانے سے پہلے وہ اپنے ذمے لگے تمام کام نمٹالے۔ کیونکہ بی جان نے اور سلینہ نے فون پر بتا دیا تھا کہ وہ نکاح کی ڈیٹ فکس کر چکی ہیں۔ بس اس کے آنے کے دو دن بعد نکاح کر دیا جائے گا۔ وہ دو ہفتے کی چھٹیاں پہلے ہی لے چکا تھا اس لیے اسے اس طرف کی پریشانی نہیں تھی۔ پریشانی تو بس صرف ایک بات کی تھی لیکن وہ اس پریشانی کو بیان کرنے کی اپنے اندر ہمت نہیں رکھتا تھا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے گھر والے اس کی وجہ سے پریشان ہو جائیں۔ اس لیے وہ خاموش ہو جاتا تھا کیونکہ اس کی نظر میں خاموشی ہی بہترین ذریعہ تھا۔ خاموشی سب راز چھپاتی ہے گہرائی کے غلاف میں لپیٹ لیتی ہے۔ گہرائی کے اندر تک۔

☆.....☆

سلینہ اور شمینہ دونوں کے بازاروں کے چکر بار بار لگ رہے تھے۔ بی جان نے جہیز لینے سے منع کر دیا تھا لیکن شمینہ بیگم چاہتی تھیں کہ وہ بیٹی کو خالی ہاتھ نہ بھیجیں جو ان کی استطاعت ہے اس کے مطابق ہر چیز دیں سلینہ بھی بری کی تیاریوں میں مگن تھی۔ ویسے تو یہ فنکشن عدیل کے کہنے پر چھوٹے پیمانے پر رکھا گیا تھا۔ صرف قریبی اور چیدہ چیدہ رشتے داروں اور قریبی عزیزوں کو مدعو کیا گیا تھا لیکن بی جان کی خواہش تھی کہ وہ اپنے سارے ارمان پورے کریں۔ فضل والا کو دلہن کی طرح سجایا جا رہا تھا اور مس شہو بھی اپنی تیاریوں میں مصروف تھیں اور کیوں نہ ہوتیں آخر اس کے چھوٹے صاحب کی شادی تھی۔

”اری او شہو! اور کتنی اپنی کالی چڑی کو چکائے گی۔ بس کر دے بھوتنی لگ رہی ہے۔“ بی جان نے اس کی شکل دیکھ کر کہا تھا اور بمشکل اپنی ہنسی ضبط کی تھی۔

”ہائے بی جان! میری گوری رنگت نرم جلد کو کالی چڑی کہہ کر تذلیل نہ کریں۔ پورے پانچ سو کا محلے کے پارلر سے وائٹ فیشنل کروایا ہے۔“ اس نے منہ بسورتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”پانچ سو کا فیشنل!“ بی جان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”ہاں تو اور کیا ایک ہزار والا بھی تھا۔ وہ شادی پر کرواؤں گی۔“ شہو نے اگلا منصوبہ گوش گزار کیا۔ بی جان کو اچھو لگ گیا تھا یہ سن کر۔ انہوں نے اسے گھور کر دیکھا۔

”ارے کم بخت تجھے جو دو ہزار روپے کپڑوں کے لیے دیا تھا۔ وہ تو ان اللے تللوں میں خرچ کر آئی ارے تیرا ستیاناس ہو۔“ بی جان نے اسے کوسا تھا۔

”وہ تو سلینہ باجی نے لے کر دینا تھا جوڑا، میں نے ان سے کہا تھا۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی کیونکہ پتا تھا بی بی جان کا جو تاملے کے لیے تیار ہو رہا ہے۔

”ارے تیرا ستیاناس کم بخت شبو۔“ بی بی جان نے یہ سن کر جو تاملے کھینچ مارا لیکن وہ تیزی سے بھاگ لی تھی۔

”عدیل آرہا ہے بی بی جان! ابھی ابھی اس کا فون آیا ہے۔“ بی بی جان زیورات کے ڈیزائن چیک کر رہی تھیں جب سلینہ نے آکر اطلاع دی۔

”اللہ خیر سے لائے میرے بچے کو، تم کامران کو بھیجو۔ ایئر پورٹ جہاز کتنے بجے لینڈ کرے گا۔“ بی بی جان نے پوچھا تھا۔

”بی بی جان! میں اور حماد جائیں گے کامران کو کوئی کام تھا وہ لاہور گئے ہوئے ہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے، شبو کو میرے پاس بھیجنا اور ہاں شمینہ کو دوبارہ فون کیا تم نے؟“ بی بی جان نے سلینہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا اور گولڈیک ہاتھ میں پکڑی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”جی بی جان! ماہ سے بھی ہوئی تھی اور آئی سے بھی۔ وہ بھی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔“ سلینہ نے جواب دیا۔

”اچھا ٹھیک ہے اور ہاں سنو۔“ انہیں نے جاتی سلینہ کو پکارا۔

”جی بی جان۔“ سلینہ پٹی۔

”فریڈہ کو فون کر دینا، تمہیں پتا ہے اس کا، ذرا دیر سے پیغام دیا تو منہ پھلائے رکھے گی۔“

”اچھا بی جان۔“ سلینہ مسکراتے ہوئے پلٹ گئی جب کہ بی بی جان جیولر کو فون کرنے چل دیں۔

☆.....☆

فلائٹ 2:30 کی تھی لیکن کچھ پرائیلم کی وجہ سے لیٹ ہو گئی تھی۔ سلینہ، دو بجے ہی ایئر پورٹ کے نکل گئی تھی اور وہاں پہنچ کر اس کی کوفت اور بڑھ گئی کیونکہ فلائٹ کا نیا ٹائم 4:20 تھا۔ وہ بڑا کر رہ گئی۔ اسلام آباد ایئر پورٹ کی گہما گہمی حسب معمول عروج پر تھی۔ مسافر آرہے تھے کچھ جانے کے لیے تیار تھے۔ وہ Waiting room میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔ حماد اس کی گود میں تھا اچانک اس کی ساتھ والی نشست پر ایک خوب دوسا مرد آ بیٹھا تھا جسے دیکھ کر اس کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

☆.....☆

انسان کے اندر بہت سی خواہشیں سر ابھارتی ہیں وہ چاہتا ہے اس کی تمام خواہشیں پوری ہوں لیکن کبھی کبھی ایسا نہیں ہوتا۔ کچھ خواہشیں ادھوری بھی رہ جاتی ہیں۔ سلینہ، فضل علی کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہوا تھا۔

نظارہ وہ اب خوش و مطمئن تھی لیکن اس کی ایک خواہش نہ پوری ہونے کی کسک ابھی بھی اس کے دل میں موجود تھی لیکن اس نے سمجھوتا کر لیا تھا۔ کئی دفعہ سمجھوتہ کرنے سے انسان کی پوری زندگی آسان اور سہل ہو جاتی ہے اور جو سمجھوتہ نہیں کرتے اپنے آپ کو بڑی شے سمجھتے ہیں وہ منہ کی کھاتے ہیں۔ ان کا غرور، تکبر انہیں لے ڈوبتا ہے۔ پھر وہ تہی داماں رہ جاتے ہیں وہ لا حاصل رہ جاتے ہیں اور جو اللہ پر بھروسا کرتے ہیں اس پاک ذات سے ہر شے مانگتے ہیں ہر خواہش کرتے ہیں وہ پاک اور اعلیٰ ذات ان کو ہر آسائش پہلے سے زیادہ دیتا ہے۔ کیونکہ وہ حضور رحیم ہے، بے نیاز ہے اور اپنے بندوں سے بہت پیار کرتا ہے۔ آپ اسی کے آگے جھولی پھیلائیں اس سے دعا مانگیں وہ آپ کی دعا ضرور قبول کرے گا۔ دعا میں کبھی رو نہیں ہوتیں۔ دعائیں تقدیر کو

بدل دیتی ہیں۔ دعا میں بڑی طاقت ہے۔ سلینہ نے بھی اپنے لیے بہتری کی دعا کی تھی اور جو اس کے لیے بہتر تھا اسے مل گیا تھا۔ وہ خوش تھی اور اپنے رب کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی تھی۔

شیردل آفندی سے اس کی میل ملاقات کالج کے کیفے ٹیریا میں ہوئی تھی۔ شیردل آفندی کا تعلق صوبہ سرحد کے کسی قبیلے سے تھا۔ وہ یہاں اعلیٰ تعلیم کے لیے آیا تھا۔ بس پہلی ملاقات ہی میں دل کا دروازہ وا ہو گیا تھا، شیردل آفندی شادی کا خواہش مند تھا لیکن سلینہ جانتی تھی نہ اس کے گھر والے یہ رشتہ قبول کریں گے اور نہ شیردل کے قبیلے والے اسے بہو تسلیم کریں گے۔ اس نے یہ بات شیردل آفندی کو دو ٹوک کہہ دی تھی۔

”سلینہ! ہم کورٹ میرج کر لیں گے۔“ اس نے مشورہ دیا تھا اور سلینہ اس کے مشورے پر ساکت رہ گئی تھی۔

”دل، تم ایسی بات کرو گے مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میں ایسی محبت کو ٹھوکر مارتی ہوں جو میرے خاندان کی رسوائی کا سبب بنے۔ بس یہ ہماری آخری ملاقات ہے آج کے بعد ہمارے راستے الگ الگ ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ رکی نہیں تھی اور تیز تیز قدم اٹھاتی کیفے ٹیریا سے باہر نکل گئی تھی اور ساتھ ساتھ اس کی زندگی سے بھی ایک ناکام، خاموش، خود غرض محبت کا خاتمہ ہو گیا تھا اور دور سر بہ کیف چوٹیاں ان کی اس محبت پر نہیں رہی تھیں۔ ایک دو تین اور کھیل ختم..... محبت کا قصہ تمام۔

اور آج اسے یوں اپنے روبرو دیکھ کر وہ جم گئی تھی جیسے اس میں ہلنے کی بھی طاقت نہ رہی ہو۔

”سلینہ تم.....“ اس کے لہجے میں جوش تھا۔

”ہاں شیردل! تم یہاں کیسے۔“ اس نے اپنے حواسوں پر قابو پالیا تھا۔

”ہاں میں امریکہ جا رہا ہوں۔ آج کی فلائٹ سے لیکن اس فلائٹ میں کافی ٹائم ہے۔“ اس نے جواز پیش کیا۔

”ہوں میں بھی یہاں اپنے شوہر کو ریسیو کرنے آئی ہوں۔“ اس نے جھوٹ بولا تھا۔ یہ سن کر شیردل ساکت رہ گیا۔

”تم نے شادی کر لی؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں یہ میرا سب سے چھوٹا بیٹا ہے۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر بتانے لگی۔

”اور تمہاری شادی ہوئی؟“

”ہاں میرا بھی ایک بیٹا ہے۔“ یہ سن کر پتا نہیں اسے صدمہ محسوس ہوا تھا۔

”خوشی ہوئی تم سے مل کر۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم خوش ہونا؟“ شیردل نے اچانک اس سے پوچھا۔

”ہاں بہت، او کے تم سے بات کر کے اچھا لگا جائے۔“ یہ کہہ کر وہ خراماں خراماں چلتی Waiting room سے باہر نکل آئی جب کہ شیردل اس کے اس اجنبی انداز پر حیران رہ گیا تھا۔

☆.....☆

جہاز بس کچھ دیر میں لینڈنگ کر رہا تھا۔ ایئر ہوسٹس مسافروں کو احتیاطی تدابیر بتا رہی تھی۔ وہ ایک سیٹ پر اکتایا ہوا بیٹھا تھا۔ جہاز کے لیٹ ہونے سے اس کے ایک دو کام ادھورے رہ گئے تھے۔ اسے میجر زمان سے ملنا تھا لیکن اب ناممکن تھا۔ وہ سلینہ کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا کہ جہاز کی غلط ٹائمنگ نے اسے

کس قدر کوفت میں مبتلا کیا ہوگا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر سامنے لگے ٹی وی پر پڑی وہاں کوئی ڈاکومنٹری چل رہی تھی آرمی کے متعلق۔ اور اب ایک نظم چل رہی تھی جسے سن کر اس کی ساری کوفت واکتاہٹ کہیں دور جا سوئی تھی۔ یہ نظم جرأت و بہادری اور بے خوفی کا سبق دے رہی تھی کہ بزدل اور ڈرپوک لوگ نہ صرف یہ کہ کوئی خطرہ مول لینے سے گھبراتے ہیں بلکہ یہ دلیر اور جرأت مند لوگوں کی راہ میں روڑے بھی اٹکاتے ہیں۔ گونا گوں مشکلات اور خدشات کا اظہار کر کے یہ باہمت لوگوں کو آگے بڑھنے سے روکتے ہیں لیکن ہمارے بہادر سپاہی ایسے لوگوں کو خوب قابو کرنا جانتے ہیں اور خاص کر کر کے پاکستان کے فوجی بھائی تو ایسے لوگوں کو ٹھیک کرنا خوب جانتے ہیں۔ ہمت، بہادری، جرأت مندی ہی تو ہمارے پاکستانی فوجی بھائیوں کا شیوا ہے۔

☆.....☆

جہاز لینڈ کر چکا تھا اور عدیل اگلے چند لمحوں کے اندر سلینہ کے پاس کھڑا حماد کو چٹا چٹ چوم رہا تھا۔
 ”سلینہ چھوٹی! کیسا لگا انتظار کرنا؟“ وہ پیار سے اسے چھوٹی کہہ کر بلاتا تھا۔
 ”اف..... کیا بتاؤں عدیل ایک تو یہ ہمارے ملک کے جہاز بھی ناں.....“ وہ جھنجھلائی ہوئی بولی۔
 ”اوہ سسٹر! ملک کونا کہو برا بھلا۔“ وہ اس کے سر پر چیت لگاتے بولا تھا۔
 ”سوری ملک کے پیارے راج دلارے بھائی جان۔“ وہ ہنس پڑی تھی۔ جو اب عدیل بھی مسکرا دیا۔
 ”اچھا جلدی کرو، بی جان تین چار دفعہ فون کر چکی ہیں۔“ اس نے حماد کو اسے دیا۔

”ایک ہینڈسم لڑکے کے ہوتے ہوئے بہن گاڑی چلائے!“ وہ ناراض ہوتے ہوئے بولا تھا۔
 ”ہینڈسم لڑکا لمبی سواری کا سفر کر کے آرہا ہے۔ اس لیے مس سلینہ ہی کار ڈرائیو کریں گی۔“ اور پھر گاڑی میں دونوں کے ایک ساتھ قہقہے گونج پڑے تھے۔
 ماہانے جب سے سنا تھا عدیل آرہا ہے تو اس کی حالت بے چین روح کی سی تھی۔ شادی میں بھی دو دن باقی بچے تھے۔ اس لیے ایک انجانا سا ڈرا اور میٹھی سی خوشی بسی تھی۔ دل تھا کہ قابو میں ہی نہیں آرہا تھا۔
 کیا یہ محبت کی علامتیں نہیں ہیں؟ اف یہ محبت بھی ناں نری بھول بھلیاں ہے جو اس بھول بھلیاں میں قدم رکھ دے پھر وہ اس سے باہر نہیں نکل پاتا۔ آگے ہی جاتا جاتا ہے۔ گم ہو جاتا ہے۔ اس محبت کو بھی کتنے گن آتے ہیں۔ اپنے جال میں جکڑنے کے یہ محبوب کو داسی بنا چھوڑتا ہے جو پریم کی پوجا کرتا ہے۔ یہ پریم کو اس میں حلول کر دیتا ہے۔ جیسے ماہا کے اندر عدیل کی محبت حلول ہو گئی تھی۔

☆.....☆

وہ سب لاؤنج میں بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور بی جان تو عدیل کو دیکھ دیکھ کر نہال ہوئی جا رہی تھیں۔ آخر کیوں نہ ہوتیں عدیل ہی ان کا کل سرمایہ تھا۔ فضل علی کے خاندان کا اکلوتا وارث تھا۔
 ”بی جان! بس کر دیں۔ اب اسے کنگلی باندھے دیکھنا اتنا بھی خوب صورت نہیں ہے یہ۔“ سلینہ نے ان کی اس کارروائی پر چوٹ کی۔

”ہش..... پرے ہٹ میرا لعل تو مجھے پوری دنیا سے پیارا ہے۔“ بی جان نے عدیل کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا تھا اور عدیل جو اب اسے ناک چڑھاتے ہوئے مسکرا دیا۔ سلینہ اس کے اس انداز پر کھول کر رہ گئی

تھی۔

”ٹھیک ہے بی جان! اب اسے ہی بیٹا بنائیں؟“ وہ منصوبی ناراضی سے بولی۔

”ہائے ہائے لڑکی سٹھیا گئی ہے کیا، پگلی تو بھی مجھے اس سے بڑھ کر پیاری ہے۔ ایویں ہی شو نہ ماریا کر۔“

بی جان نے یہ کہہ کر ساتھ ہی اس کی بے عزتی کر دی۔

”بی جان!“ وہ چیختی تھی اور اس کے اس انداز پر سب ہنس پڑے تھے۔

☆.....☆

اور آخر کار آج نکاح کا دن بھی آ پہنچا تھا۔ بی جان اور شمیمہ وقت سے پہلے ہی ہال پہنچ چکی تھیں کیونکہ انہیں مہمانوں کو رسیو کرنا تھا کچھ مہمان آچکے تھے اور کچھ آہستہ آہستہ آرہے تھے۔ ماہا، سلینہ کے ساتھ پارلر تھی اور اسے پارلر سے ہی ہال پہنچنا تھا۔

”ارے کامران ذرا سلینہ کو تو فون لگاؤ کہاں تک پہنچی ہیں۔“ بی جان کامران کے پاس آتے ہوئے بولی تھیں۔

”جی بی جان! میری ابھی بات ہوئی ہے۔ بس وہ دس منٹ میں پہنچ رہی ہیں۔“ کامران نے آگاہ کیا۔

”اچھا ٹھیک ہے اور یہ عدیل کہاں ہے دکھائی نہیں دے رہا۔“ بی جان نے اب کے عدیل کی بابت پوچھا تھا۔

پوچھا تھا۔

”وہ بی جان اس کے کچھ دوست آئے ہیں ان کی طرف ہے۔“ کامران نے بتایا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ بی جان یہ کہہ کر تیزی سے دوسری جانب بڑھ گئیں۔

☆.....☆

حسن حاضر ہے محبت کی سزا پانے کو

کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو

شبو میڈم بھی آج انوکھی ترنگ میں تھی۔ لال شرٹ، نیچے فیروزی غرارہ، فل میک اپ اپنے آپ کو وہ قیامت سمجھ رہی تھی اور اوپر سے اپنی بھدی آواز (اس کی نظر میں انتہائی سریلی) میں لتا کو گوس رہی تھی۔ لتا بھی اگر یہ سنتی تو ڈر جاتی مگر شبو میڈم تو آج اپنی محبت کو سزا دینے کی فل تیاری میں تھی۔

”اری ادم بخت کچھ شرم کر۔“ بی جان نے آتے ہی اسے دھموکا لگایا تھا۔

”اف بی جان!“ وہ کرا کر رہ گئی۔

”اف کی نجی تجھے میں سارے شہر میں ڈھونڈ رہی ہوں اور تو یہاں ڈھول پھاڑے بیٹھی ہے۔“ بی جان نے اسے لتا ڈالتا تھا۔

”اچھا چلیں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بی جان! آج ہزار والا فیشنل کروایا ہے، کیسا ہے؟“ یہ کہتے ہی وہ بھاگ کھڑی ہوئی جب کہ بی جان یہ سن کر فقط مسکرا کر رہ گئیں۔ ناقابل یقین واقعہ۔

☆.....☆

سوات کے حالات پہلے سے زیادہ بری نہج پر پہنچ چکے تھے۔ شدت پسند تنظیموں نے کئی علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا کئی افراد اپنے گھروں کو چھوڑ کر جا چکے تھے اور کچھ جارہے تھے۔ آرمی فورس پہلے سے زیادہ تیزی

رہاڈا انجسٹ 39 دسمبر 2015ء

READING
Section

سے کار عمل میں مصروف ہو چکی تھی کچھ علاقے تو باز یاب کر لیے تھے لیکن کچھ حساس اور گنجان آباد علاقے ابھی بھی ان کے قبضے میں تھے۔ ہمارے فوجی بھائی ان ناسوروں کو ختم کرنے میں پوری ہمت اور لگن سے کوشش کر رہے تھے اور انشاء اللہ انہیں اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہونا تھا۔ آمین۔

☆.....☆

نکاح کی رسم ادا کر دی گئی تھی۔ رسم ادا ہوتے ہی کھانا کھول دیا گیا۔ لوگ کھانے پر ٹوٹ پڑے تھے جیسے پہلی مرتبہ کھا رہے ہوں۔ دھکے یہ دھکا دیا جا رہا تھا۔ ایک دوسرے کو کھینچ کھینچ پیچھے کیا جا رہا تھا۔ پلیٹیں بھری جا رہی تھی۔ عدیل یہ سب دیکھ کر افسوس بھری آہ بھر کر رہ گیا۔

”لنعم وضبط تو جیسے ہمارے ہاں کے لوگوں میں بالکل ناپید ہو کر رہ گیا ہے۔“ بی جان بھی یہ سب دیکھ کر ٹھنڈی آپہن بھر رہی تھیں لیکن کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ تو میں کبھی ترقی نہیں کر سکتیں جو اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش نہیں کرتیں۔

ماہاریڈ لہنگے میں ملبوس ایک انوکھی چھب دکھا رہی تھی جب کہ عدیل بھی وائٹ شیروانی میں شہزادہ لگ رہا تھا۔ دونوں چاند سورج کی جوڑی لگ رہے تھے۔ نکاح ہوتے ہی فوٹو سیشن شروع ہو چکا تھا۔ تمام قریبی رشتے داران کے ساتھ دھڑا دھڑا تصویریں بنوا رہے تھے۔ پھر کچھ خاندانی رسمیں ہوئیں اور رخصتی کا وقت آپہنچا تھا۔ شمیمہ نے بھی نم آنکھوں کے ساتھ بیٹی کو وداع کیا اور اس کے لیے تاعمر خوشیوں کی دعائیں مانگیں۔ ان کا روم روم اپنی اس لاڈلی بیٹی کے لیے دعا گو تھا اور یوں ماہا سب کی دعاؤں تلے فضل و لارخصت ہو گئی۔

☆.....☆

خدا کرے کہ میری ارض پاک پر اترے
وہ فصل گل جسے اندیشہ زوال نہ ہو
یہاں جو پھول کھلے وہ کھلا رہے برسوں
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو

”شبو! وہ دو مٹھائی کے ٹوکڑے یاد سے گاڑی رکھوانا۔“ رخصتی کے بعد بی جان اور شبو ہال سے اپنی چیزیں سمیٹ رہی تھیں۔

”جی بی جان! رکھوادئیے ہیں بس بی جان جلدی چلیں اب ماہا باجی گھر بھی پہنچ چکی ہوں گی۔“ شبو کو بس گھر جانے کی جلدی تھی۔

”کیوں اس نے گھر ہی جانا ہے نا، کسی تھیٹر میں تو نہیں پاؤلی نہ ہو تو۔“ بی جان نے اسے ڈپٹا۔
”اوہو، بی جان مجھے گھر جانا ہے ناں دلہن کی رسمیں کرنی ہیں۔“ اب کے اصل بات اس نے بتائی تھی بی جان نے اسے گھورا۔

”کم بخت یہاں سے جلدی کرے گی تو گھر جائے گی ناں۔“ شبو اس عزت افزائی پر منہ بسورنے لگی۔
”ہاں سلینہ ہم پہنچ رہے ہیں۔“

”چلو جلدی کرو سلینہ کا فون آیا ہے وہ گھر پہنچ چکے ہیں۔“ بی جان نے اسے بتایا اور گاڑی کی جانب چل دیں جب کہ شبو تیزی سے چیزیں اٹھانے لگی۔

☆.....☆

”ہیلو جی کون؟“ سلینہ گھر پہنچی ہی تھی کہ اس کے موبائل پر کسی اجنبی کی کال آئی۔
 ”تم سے بات کرنی ہے سلینہ۔“ دوسری جانب شیردل تھا۔ وہ بھونچکی رہ گئی۔
 ”تمہیں میرا نمبر کہاں سے ملا؟“ سلینہ شاکڈی بولی۔

”بس مل گیا۔ میں کل امریکہ سے آیا ہوں مجھے تم سے ملنا ہے۔“ اس نے آگاہ کیا تھا۔
 ”واٹ پاگل ہو گئے ہو تم، میرا اب تم سے کوئی رشتہ نہیں کہ میں تم سے ملوں ہاں دوستی تھی جو شادی سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ اس لیے پلیز تم مجھے فون کر کے تنگ نہ کرو اور آئندہ اس نمبر پر کال نہ کرنا، یہ کامران کا نمبر ہے۔“ اس نے جھوٹ بولا تھا۔ پلیز صرف ایک دفع مل لو۔“ وہ منت بھرے لہجے میں بولا۔
 ”شیردل بائے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے فوراً فون کاٹ دیا تھا۔

”یہ کیوں مجھ سے ملنا چاہتا ہے؟“ وہ سوچنے لگی لیکن کوئی سراہا تھا نہ لگا تھا۔ وہ نڈھال سی ایک جانب چل دی۔

☆.....☆

”میں آئی کم ان سر؟“ سلیمان نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا تھا۔
 ”لیس کم ان۔“ میجر شیردل نے مسکرا کر اجازت دی۔

”جی سر۔“ وہ پیشہ دارانہ انداز میں بولا۔

”بیٹھے کیپٹن سلیمان۔“ میجر شیردل نے سامنے رکھی کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا۔
 ”آپ نے فائل تیار کر لی۔“

”نہیں سر! بس تھوڑا کام رہ گیا ہے۔ انشاء اللہ ایک دو دن تک مکمل ہو جائے گی۔“ اس نے جواب دیا۔
 ”ہوں۔ عدیل نے فون کیا؟“

”ہاں سر! میں نے کیا تھا کل اس کا نکاح تھا، بڑی ہوگا۔“ اس نے بتایا۔
 ”میری طرف سے بھی مبارک باد دیجیے گا۔“

”جی سر۔“

”اوکے آپ جا سکتے ہیں۔“ میجر شیردل نے کہا اور فائل کی جانب متوجہ ہو گئے جب کہ وہ تیزی سے باہر نکل آیا تھا۔

”ہیلو! کہاں مرے ہوئے ہو۔“ باہر آتے ہی اس نے عدیل کو فون ملا یا تھا۔

”ارے یار! تو تو بیویوں کی طرح نفیث کر رہا ہے۔“ دوسری جانب وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

”ہاں چہک لے صرف چند دن، اس کے بعد تو بھابی سے روز جوتے پڑوایا کروں گا تجھے۔“ وہ بھناٹھا تھا۔

”اچھا سلیمان تجھے میں تھوڑی دیر بعد فون کرتا ہوں۔“ عدیل نے دوسری جانب سے فون کاٹ دیا تھا۔

☆.....☆

”تم سے ایک سوال پوچھوں؟“ نکاح سے تین ماہ قبل سلیمان نے اچانک اس سے پوچھا تھا۔
 ”ہاں پوچھو۔“ اس نے جواباً کہا۔

”پوچھ لوں؟“ سلیمان شرارت سے مسکرایا تھا۔

”اب تم پوچھو یا نہ پوچھو میں تمہیں ایک زوردار چھٹڑ ضرور روے ماروں گا۔“ وہ زچ ہوا تھا۔

”اچھا یار! پوچھ لیتا ہوں۔“ سلیمان ہنستے ہوئے بولا۔

”تم ماہا سے محبت کرنے لگے ہو اب یہ نہ کہنا یہ سب بکواس ہے۔“ وہ اسے شریر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا لیکن عدیل تو سکتے میں آ گیا تھا۔

”کیا ہوا یار؟“ سلیمان نے اس کا کندھا ہلاتے پوچھا لیکن اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

”عدیل یار! سنو تو۔“ سلیمان فوراً اس کے پیچھے لپکا تھا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”میری بات اگر تمہیں بری لگی تو سوری۔“

”ہاں میں ماہا سے محبت کرنے لگا ہوں۔“ عدیل اتنا کہہ کر رکا نہیں اور تیزی سے ہاتھ چھڑا کر باہر کی جانب بڑھ گیا جب کہ سلیمان اس کے اس رد عمل پر حیران رہ گیا تھا۔

جس بات سے وہ خود نظریں جراتا رہا تھا وہ بات کتنی آسانی سے سلیمان نے کہہ دی تھی۔ کیا محبت کا جذبہ یونہی ہر کسی پر آشکار ہو جاتا ہے۔ لیکن جو کچھ سلیمان نے کہا تھا وہ سچ تھا لیکن وہ اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر پار رہا تھا۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا اگر کرتا تو اپنے سے کیا ہوا عہد توڑ ڈالتا اور یہ اسے قطعی گوارا نہیں تھا کیونکہ اس عہد کو تو اس نے نبھانا تھا اور عہد توڑے نہیں جاتے پورے کیے جاتے ہیں۔

☆.....☆

مختلف رسموں کے بعد اسے عدیل کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی پھول کی پتیوں نے اس کا استقبال کیا۔ سلینہ نے اسے بیڈ پر بٹھایا اور اس کا لہنگا درست کرنے لگی۔

”اچھا اب ایزی ہو کر بیٹھو بس عدیل آتا ہی ہوگا۔“ سلینہ اسے چھٹڑنے کے انداز میں بولی تھی۔

”آپی! آپ میرے پاس ہی بیٹھیں پلیز۔“ اسے گھبراہٹ نے آ گھیرا تھا۔

”ارے ایزی یار! کیا ہو گیا ہے تمہیں۔“ سلینہ اس کے انداز پر حیران ہوئی تھی۔

”آپی وہ.....“ ابھی جملہ ادھورا ہی تھا کہ عدیل اندر آ گیا۔ سلینہ اس کی جانب پلٹی تھی۔

”ارے شکر ہے تم آ گئے ہو اب اپنی بیوی کو تم خود ہی سنبھالو محترمہ کو ڈر لگ رہا ہے۔“ سلینہ ہنستے ہوئے بولی۔

”ہیں..... ڈر.....! کس بات کا!“ وہ نا سمجھی کے عالم میں بولا تھا۔

”پتا نہیں اب تم خود ہی پوچھو۔“ سلینہ اتنا کہہ کر باہر کی جانب چل دی۔ جب کہ عدیل دروازہ لاک کر کے اس کی جانب آیا تھا۔

”ہاں محترمہ ماہا صاحبہ! کیسا ڈر لگ رہا ہے آپ کو بتانا پسند کریں گی۔“ اس کا انداز بر مزاح تھا۔

”وہ..... مم..... مجھے تو..... ڈر نہیں لگ رہا۔“ وہ اٹک اٹک کر بول رہی تھی۔ عدیل مسکرا کر رہ گیا۔

”اچھا جی، اس کا مطلب ہماری بیگم صاحبہ کافی بہادر ہیں۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر گویا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ پکڑنے پر اس کا دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔

”ماہا! آپ خوش تو ہیں ناں؟“ عدیل نے اچانک اس سے پوچھا۔

”جی۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور شرم سے نظریں جھکالی۔

رداڈ انجسٹ [42] دسمبر 2015ء

READING
Section

”ماہا! میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ ماہا نے اس کی جانب دیکھا تھا۔

”دیکھئے ماہا! میں اتنی جلدی شادی کے حق میں نہیں تھا۔ آپ کو پتا ہے ہماری فیلڈ کا یہ ان محبتوں کو نام نہیں دے پاتھی۔ اس فیلڈ کی محبت بس صرف ایک چیز سے ہوتی ہے اور وہ ہے ہماری دھرتی ماں۔ ماہا میں یہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا صرف بی جان اور سلینہ کی ضد کی وجہ سے مجبور ہو کر یہ شادی کی پلیز تم کوئی دوسرا مطلب نہ سمجھنا۔ مجھے بہت پہلے سے ہی یہ ادراک ہو چکا تھا کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں لیکن میں تم سے اظہار نہیں کر پاتا تھا۔ حالانکہ ہماری منگنی دو سال رہی ہے لیکن ہماری بات چیت ان دو سالوں میں نہ ہونے کے برابر ہوئی ہے میں اظہار اس وجہ سے نہیں کر پاتا تھا ماہا کیونکہ میں نے عہد کیا تھا میری پہلی محبت دھرتی ماں ہے اگر میں اظہار کرتا تو میں وعدہ خلاف ہوتا۔ جو مجھے قطعی منظور نہیں تھا اور یہی شادی کی بات تو اس سے انکاری میں اس وجہ سے تھا کہ ماہا ہماری جا ب ہی ایسی ہے کہ سر جان کی بازی لگانی پڑتی ہے اگر مجھے کچھ.....“ ماہا نے فوراً اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”اللہ نہ کرے آپ کو کچھ ہو، عدیل میں ہر قدم پر آپ کے ساتھ ہوں۔ مجھے کوئی گلہ شکوہ نہیں ہے اگر تھا بھی تو اب ختم ہو گیا ہے پلیز آپ آئندہ ایسی بات نہ کیجیے گا۔“ اس نے نرم لہجے میں جواب دیا تھا اور ہاتھ ابھی تک عدیل کے ہونٹوں پر موجود تھا۔ جسے عدیل نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔

”ماہا! بس مجھے تمہارا ساتھ چاہیے اور کچھ نہیں۔“
”میں آپ کے ساتھ ہوں عدیل۔“ وہ مسکرائی تھی اور عدیل بھی اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔
محبت نے محبوب کو اسی بنا دیا تھا۔ وہ پریم کی پوجا کر رہا تھا اور پریم اس کے اندر حلول ہو گیا تھا۔
محبت جیت گئی
اور محبوب بھی جیت گیا

اور

محبت کے خوب صورت احساس کو فتح ہو گئی تھی۔

عدیل کی دو ہفتے کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں اس لیے وہ جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ ماہا اس کے جانے کا سن کر اداس تھی اور پتا نہیں کیوں آنکھوں سے بار بار آنسو نکل رہے تھے۔ عدیل یہ سب دیکھتا لیکن خاموش تھا۔ اس وقت بھی وہ سب لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ سلینہ بھی حماد اور زہنب کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔
”ارے عدیل! کم از کم ایک ماہ کی تو چھٹیاں لیتے۔“ سلینہ نے اس کے جانے کا سن کر کہا تھا۔
”ارے چھوٹی بس مجبوری ہے۔ ورنہ خوب صورت لوگوں کو چھوڑ کر جانے کا دل کب چاہتا ہے۔“ عدیل نے سامنے بیٹھی ماہا کو دیکھ کر کہا تھا اور ماہا یہ سن کر جھینپ گئی تھی۔
”ہاں یہ تو ہے۔“ سلینہ بھی اس کی شرارت سمجھ کر مسکرا دی جب کہ ماہا اور چائے لانے کا کہہ کر اٹھ گئی تھی۔

”بی جان! آپ کیوں نہیں کچھ کہتیں اسے۔“ سلینہ نے کب سے چپ بیٹھی بی جان کو مخاطب کیا تھا۔
”سلینہ! وہ ٹھیک کہتا ہے اس کی ضرورت ہے وہاں لوٹ آئے گا جلدی۔ اب تم سب یہ باتیں کر کے بے چاری ماہا کو تو نہ پریشان کرو۔ بچی حساس ہے، ویسے ہی اس کا دل توڑ رہے ہو۔“ بی جان نے ماہا کی طرف داری کرتے ہوئے کہا تھا۔

”ہاں ہاں اب تو بہو کی طرف داری کریں گی بیٹا کس کھاتے میں۔“ عدیل پرانی جون میں لوٹ چکا تھا۔
 ”کچھ شرم کر، پھڑ ماروں کی تجھے۔ بی جان نے اسے ڈپٹا تھا۔ وہ جو اب سر کھجا کر رہ گیا۔“

☆.....☆

رات کو وہ کمرے میں آئی تو عدیل رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔

”عدیل! میں نے پیکنگ کر دی ہے۔“

”ہاں..... اچھا۔“ وہ مصروف سا بولا۔

”کچھ لکھ رہے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں دو فائلوں کا کام ادھورا ہے۔ وہی کر رہا ہوں۔“

”عدیل آپ اب کب واپس آئیں گے۔“ اس نے اچانک پوچھا تو عدیل کا پین والا ہاتھ ٹھنک گیا۔

”ماہا جلدی لوٹوں گا تم میرا انتظار کرنا پھر ہم ہنسی مون پر بھی جا میں گے۔“ وہ اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھا

تھا۔ ماہا پھر رونے لگی تھی۔

”ماہا! تم ایک فوجی کی بیوی ہو اور فوجی کی بیوی کو بہادر ہونا چاہیے کہ وہ ہر حالات کا مقابلہ کر سکے تم میرے

لیے دعا کرتا میں جلد لوٹوں۔“ عدیل نے اس کے آنسو صاف کیے۔ وہ محض سر ہلا کر رہ گئی۔

عدیل کو گئے آج دوسرا دن تھا۔ ماہا کی طبیعت بوجھل سی تھی۔ اس لیے آج کا سارا دن اس نے کمرے میں

ہی گزارا تھا۔ کھانا بھی برائے نام ہی کھایا تھا۔ اس لیے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر کچن میں

آگئی تھی۔ آگے کچن میں شہو برتن دھو رہی تھی۔

”السلام علیکم باجی۔“ شہو نے اسے دیکھتے ہی سلام جھاڑا تھا۔

”وعلیکم السلام شہو! ایک کپ چائے کا بنا دو گی؟“ اس نے فریج میں سے ایک ٹکالٹے ہوئے کہا تھا۔

”جی، باجی بنا دیتی ہوں۔“ شہو جو ابابولی اور چائے کا پانی چولہے پر چڑھا دیا۔

”بی جان کہاں ہیں۔“

”وہ اپنے کمرے میں ہیں۔“ شہو نے جواب دیا اور کینٹ سے کپ نکالنے لگی۔

”اچھا میں بی جان کے کمرے میں جا رہی ہوں چائے وہیں لے آنا۔“ وہ یہ کہہ کر کچن سے باہر نکل آئی۔

”بی جان۔“ اس نے دروازے پر دستک دی تھی۔

”آ جاؤ ماہا۔“ بی جان نے جواباً اسے کہا۔

”بی جان، کیا کر رہی ہیں؟“ وہ ان کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”کچھ نہیں بیٹی، بس سلینہ کا فون آیا ہوا تھا تمہارا پوچھ رہی تھی۔“ بی جان نے کہا۔

”بی جان! عدیل کا فون آیا تھا۔“ اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں کرے گا۔ مصروف ہو گانا۔“ بی جان مسکراتے ہوئے کہنے لگیں۔

”بی جان! اب کب آئیں گے وہ۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی جسے اس نے بمشکل

روکا تھا۔

”جلدی آئے گا میرا بچہ پریشان نہیں ہوتے۔“ بی جان نے اسے گلے لگایا تھا۔

”چائے حاضر۔“ شہو نے زور سے انٹری دی۔

”ارے کم بخت ماری، دل دہلا دیا میرا اسپیکر ہو لے رکھا کر۔“ بی جان نے اسے کو سا تھا۔ جو ابا وہ برے برے منہ بنانے لگی جب کہ ماہا اور بی جان ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے ہنس دیں ماحول خوشگوار ہو گیا تھا۔

☆.....☆

”ہیلو! شیردل میں تم سے کہہ چکی ہوں مجھے فون نہ کرو، تمہیں کیوں سمجھ نہیں آتی۔ میری بات۔“ سلینہ جھنجھلا ہی اٹھی تھی۔

”پلیز سلینہ! صرف ایک بار مجھ سے مل لو۔“ اس کا وہی مطالبہ تھا۔

”میں..... کبھی نہیں۔ جو بات ہے تم فون پر کر لو۔“

”فون پر نہیں کر سکتا۔ پلیز صرف ایک بار۔“ وہ منتیں کر رہا تھا۔

”آخر ایسی کیا بات ہے جو تم مجھ سے ملنا چاہتے ہو۔“ اب کہ اس نے تحمل سے پوچھا تھا۔

”بس تم مجھ سے ملنے آؤ گی تو بتاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے کہاں ملنا ہے۔“ وہ ہار مان گئی۔

”جناح پارک شام پانچ بجے میں تمہارا ویٹ کروں گا۔“ اس نے بتایا۔

”ٹھیک ہے۔“

”شکریہ۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا جب کہ اس نے غصے سے فون بند کر دیا تھا۔

☆.....☆

دن اسی طرح پر لگا کر اڑ رہے تھے عدیل کو گئے دو ماہ ہو چکے تھے اور ان دو ماہ میں اس نے صرف چار مرتبہ فون کیا تھا۔ جب بھی فون آتا یا تو بی جان اٹھاتیں یا شبو اور پانچ منٹ کی کال کا ٹائم گزر جاتا، ماہا بس ٹیلی فون کا منہ دیکھ کر رہ جاتی وہ عدیل کے بغیر حد سے زیادہ اداس تھی۔ عدیل کی سنگت میں گزارہ گیا ایک ہفتہ اس کے لیے پل پل خوشی کا سیماں تھا۔ اس ایک ہفتے میں اس نے بہت سی خوشیاں کشید کی تھیں لیکن اب وہ اداس تھی، بے کل تھی، بے قرار تھی اور ان دونوں کے درمیان صدیوں کی طویل دوری تھی۔

اس نے گاڑی سائیڈ پر پارک کی اور پارک کے پچھلے دروازے کی جانب چل دی۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے وہ پارک کے اندر داخل ہو گئی تھی۔ پارک میں لوگوں کا ایک ہجوم اٹھ رہا تھا۔ شام کا ٹائم تھا۔ اس لیے ہر طبقے کے لوگ سیر و تفریح کے لیے آئے ہوئے تھے۔ وہ چلتے ہوئے پارک کے مرکزی حصے کی جانب آگئی تھی۔

”ہیلو! میں پہنچ گئی ہوں۔ ہاں مرکزی حصے کی جانب ہوں۔“ دوسری جانب شیردل تھا۔

”ہاں میں آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون کاٹ دیا اور وہ فون ہاتھ میں پکڑے ہی پاس رکھی سنگی بیچ پر

بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر میں وہ اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔

”انتظار کرنے کا شکریہ۔“ وہ زیر لب مسکرایا تھا۔

”ہاں کیا بات ہے بتاؤ میرے پاس اتنا ٹائم نہیں ہے۔“ اس کے انداز میں لا تعلقی تھی۔ شیردل نے غور سے اس کی جانب دیکھا تھا۔

”میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں تم کا مران سے طلاق لے لو۔“ اس نے ہم گرایا تھا اور سلینہ ساکت

رہ گئی تھی اور جب ہوش میں آئی تو پوری طاقت سے شیردل کے منہ پر ٹھانچہ دے مارا تھا۔

”مجھے یقین نہیں تھا کہ تم ایک عورت کی اتنی توہین کرو گے وہ بھی اس کی جو تمہاری اتنی اچھی دوست تھی

لیکن تمہارا گھٹیا پین دوستی کو بھی کھا گیا۔ میں ابھی تک پشیمان ہوں کہ میں نے تم جیسے شخص سے دوستی کی آخ تھو۔“ اس نے اس کی طرف دیکھ کر زمین پر تھوکا تھا۔

”شیردل! ثابت ہو گیا تم نہ محبت کر سکتے ہو اور نہ محبت کرنے کے قابل ہو کیونکہ محبت کرنے والے تمہاری طرح نہیں ہوتے۔“ شیردل کا شرم سے سر جھک گیا تھا۔

”میں شادی شدہ ہوں اور اپنے شوہر سے بہت پیار کرتی ہوں۔ میرے دو بچے ہیں۔“

”تم نے میری اتنی توہین کی ہے میرے پندار کی تم نے دھجیاں اڑادی ہیں۔ تمہاری نظر میں میری یہ عزت تھی کہ تم ایک شادی شدہ عورت کو طلاق لینے کا کہہ رہے ہو، مجھے اپنے آپ سے شرم آرہی ہے۔“ شیردل سر نہیں اٹھا رہا تھا اور شاید وہ اس کے سامنے کبھی بھی سر اٹھا نہیں پائے گا۔ وہ چلی گئی تھی جب کہ وہ جھکے سر کے ساتھ ابھی تک وہیں براجمان تھا۔

☆.....☆

”ہیلو ماہا کیسی ہو؟“ آج پورے تین ماہ بعد اس نے عدیل کی آواز سنی تھی۔

”میں ٹھیک، آپ کیسے ہیں اور یاد آگئی میری۔“ حال چال پوچھنے کے بعد شکوہ بھی داغ دیا۔

”ماہا! تمہیں پتا ہے ناں میری جا بجا۔ ان تین ماہ میں ایک پل بھی فراغت کا نہیں گزرا۔ میں جو تھوڑا بہت ٹائم ہوتا تو فون کرتا تھا لیکن تم ہوتی نہیں تھیں اور تین ماہ میں، میں تمہیں یقین کروا ایک پل بھی نہیں بھولا لیکن مجھے نہیں پتا تھا کہ مجھے تم سے ایسا رپانس ملے گا، خیر۔“

”بی جان، سلینہ، شبوسب ٹھیک ہیں؟“ اس کے لہجے سے ناراضی جھلک رہی تھی وہ دل مسوس کر رہ گئی۔

”سوری عدیل مجھے نہیں پتا تھا پلیز ناراض نہ ہوں۔“ وہ رو پڑی جب کہ عدیل دوسری جانب بمشکل اپنی ہنسی دبا رہا تھا۔

”اوکے، پلیز تم رومت، ورنہ میں بھی رو دوں گا۔“ وہ رونے کی ایکٹنگ کرنے لگا جب کہ ماہا بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔

”اچھا مجھے تمہیں ایک گڈ نیوز دینی تھی۔“

”جی دیجیے۔“

”اے ہی دے دوں۔ وہ بولا۔

”تو کیسے دیں گے؟“ اس نے سوالیہ پوچھا تھا۔

”ایک شرط پر۔“

”جی بتائیں۔“

”مجھے love you ابولو پہلے۔“

”کیا! وہ چیخی تھی۔

”جی ہاں۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“

”love you، اب بتائیں۔“

”ہائے ظالم، کیوں تڑپا رہی ہو۔“ عدیل اب شرارت پر اتر آیا تھا۔

رداڈ انجسٹ 46 دسمبر 2015ء

READING
Section

”عدیل! میں فون بند کر دوں گی۔“ وہ بلس ہو گئی۔

”اچھا یار! یہ بتانا تھا کہ میں پورے ایک ماہ کے لیے آرہا ہوں۔“ اس نے خوش خبری سنائی تھی۔

”عدیل! آپ آرہے ہیں۔“ خوشی کے مارے لفظ بھی ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔

”ہاں یار!“ وہ اس کی بے تابی پر ہنس رہا تھا۔

”سچ بتائیں مذاق تو نہیں کر رہے نا۔“ وہ ابھی بھی بے یقین تھی۔

”کل آؤں گا تو دیکھ لینا سچ ہے یا جھوٹ۔“ اچھا میں فون رکھتا ہوں سب کو سلام دینا اور اپنا خیال رکھنا۔“

آخر میں ایک شوخ جملہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا جب کہ ماہا ابھی بھی فون ہاتھ میں پکڑے مسکرا رہی تھی۔

☆.....☆

”سلیمان تمہارا کیا پروگرام ہے میرے ساتھ چلو گے یا بعد میں آؤ گے۔“ وہ اپنی چیزیں سمیٹ رہا تھا

جب کہ سلیمان بیڈ پر اوندھا پڑا اونگھ رہا تھا۔

”نہیں یار! تمہارے ساتھ تو نہیں جاسکتا میجر فرقان نے کل میٹنگ میں بلایا ہے۔ بعد میں آؤں گا۔“

سلیمان جو ابابولا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ عدیل کندھے جھٹکتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ جب کہ سلیمان کا فون بجنے لگا۔

”ہیلو! جی امی السلام علیکم۔“ فون کی دوسری جانب سلیمان کی امی تھیں۔

”میں ٹھیک، آپ ٹھیک ہیں ابو کیسے ہیں۔ بھانجھی بھائی منا منال سب ٹھیک ہیں۔“ اس نے پوچھا۔

”ہاں سب ٹھیک ہیں بس تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔“ امی بولیں۔

”ہاں میں ایک دو دن تک آرہا ہوں عدیل آج چلا جائے گا۔ مجھے کچھ کام ہے اس کی وجہ سے میں بعد

میں آؤں گا۔“ اس نے بتایا۔

”اچھا ٹھیک ہے خیال رکھنا اپنا۔“ انہوں نے فون بند کر دیا اور سلیمان فون ایک طرف پھینک کر پھر لیٹ

گیا اور تھوڑی دیر بعد اس کے ہلکے ہلکے خراٹے پورے کمرے میں گونج رہے تھے۔

☆.....☆

”امی عدیل آرہے ہیں آج آپ زویا کو لے کر ہماری طرف ہی آجائیں۔“ وہ اور شبو چند ضروری

چیزیں لینے بازار آئی تھیں۔ بازار سے نزدیک گھر پڑ رہا تھا۔ اس لیے وہ تھوڑی دیر کے لیے امی کی طرف

آگئی تھی۔

”ارے بیٹا! بیٹھو تو۔“ ثمنینہ بیگم نے اسے کھڑے دیکھ کر کہا۔

”نہیں امی ٹائم نہیں ہے چھ بجے عدیل کا جہاز لینڈ کرے گا اور وہ سات تک گھر پہنچ جائیں گے اور اب

چار ہو رہے ہیں مجھے بہت کام ہے پھر کبھی عدیل کے ساتھ آؤں گی۔ زویا کو میری طرف سے سلام دیجیے گا

اور رات کو یاد سے آئے گا او کے اللہ حافظ۔“ وہ یہ کہہ کر تیزی سے بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گئی جب

کہ ثمنینہ بیگم اس کی پشت دیکھ کر مسکرا دیں۔

”کون آیا تھا امی۔“ زویا لاؤنج میں آتے ہوئے بولی تھی۔

”ماہا تھی۔“ انہوں نے بتایا۔

”ہائے مجھے کیوں نہیں بتایا۔“

”جلدی میں تھی رات کھانے کا کہہ کر گئی ہے تیار ہو جانا۔“

”اچھا۔“

”دیکھو زینہ نے پائے چڑھائے یا نہیں۔“ انہوں نے اونچی آواز میں جاتی زویا کو پکارا تھا۔
”اچھا امی۔“ وہ بھی جواباً زور سے بولی تھی۔

☆.....☆

جس دن سے وہ شیردل سے ملاقات کر کے آئی تھی اس دن سے ڈپریس تھی۔ شیردل کی باتیں اسے بھلائے نہیں بھول رہی تھیں۔ کامران بھی اسے بے چین دیکھ کر دو تین مرتبہ پوچھ چکا تھا لیکن وہ ٹال جاتی۔
”شیردل ایسا کیسے کر سکتا ہے یقیناً وہ درست دماغ کے ساتھ نہیں تھا۔ ورنہ اتنی بڑی بات آسانی سے نہ کہتا۔ اس نے ایسا کیوں کہا شاید وہ اب بھی یہی سوچتا ہے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ نہیں میں تو ایسا مر کر بھی نہیں سوچ سکتی۔ میں اس سے کبھی محبت نہیں کرتی تھی ہاں وہ پاگل ہے اگر یہ سب باتیں کامران کو پتا چل گئیں تو۔“ وہ جتنا سوچتی اتنا الجھتی جاتی اور اس پریشانی نے اسے یہ تک بھلا دیا کہ آج اس کا پیارا بھائی تین ماہ بعد آ رہا تھا۔

☆.....☆

”ارے شبو! کم بخت ماری اب یہ بالوں کا ستیاناس مار آئی۔“ بی جان نے اس کے گولڈن بالوں کو دیکھ کر کہا تھا۔

”ہائے بی جان! فیشن ہے پورے تین ہزار کا پارلر سے کرایا ہے۔“ اس نے بالوں کو ادا سے جھٹکا دیتے ہوئے کہا تھا۔

”ارے کیڑے پڑیں تجھے اور تیرے اس پارلر کو۔“ بی جان نے اسے کوسا تھا۔ وہ جواباً دانت نکوسنے لگی۔
”ہاں کھی کھی کر لے کم بخت۔“

”اچھا چھوڑیں بی جان۔“ ماہانے بی جان کو رام کرنا چاہا۔

”چلو جاؤ شبو کچن میں دیکھو گوشت گل گیا یا نہیں۔“ ماہانے اسے منظر سے ہٹایا تھا۔ وہ کھٹ کھٹ کرتی چلی گئی۔

”ماہا! یہ جب بارہ سال کی تھی تو اس کی ماں اسے میرے پاس چھوڑ گئی تھی۔ میں نے اسے اپنے بچوں کی طرح پالا ان میں کبھی فرق نہیں کیا۔ اس کی ماں میرے گھر اس وقت سے کام کرتی تھی جب میں بیاہ کر آئی تھی میں نے ہمیشہ اسے ایک سہیلی جانا، نوکرانی کا رتبہ نہ دیا۔ اور وہ مرتے وقت اپنی یہ ذمہ داری میرے سر ڈال گئی اب اسے پورا کرنا میرا ذمہ ہے۔ بس میں چاہتی ہوں اس کی اپنی برادری میں ہاتھ پیلے کر دوں لیکن جو اس کے پچھن ہیں، نہ اسے تو چہرہ بھی بیاہنے نہ آئے۔“ آخری بات سن کر ماہا کی ہنسی چھوٹ گئی۔
”ہاں تم بھی ہنس لو۔“ بی جان نے اسے بھی خشکیں نگاہوں سے گھورا تھا وہ سنبھل گئی۔

”بی جان! ایئر پورٹ کون جائے گا؟“ اس نے بات بدلی۔

”تم چلی جاؤ آخر تمہارا میاں آ رہا ہے۔“ بی جان نے ٹکا جواب دیا۔

”میں..... لیکن بی جان گھر میں کون انتظام کرے گا۔ امی اور زویا بھی آرہی ہیں اور سلینہ باجی ہاں یاد آیا

آپ نے سلینہ باجی کو فون کر کے عدیل کے آنے کا بتایا؟“

رداڈ انجسٹ 48 دسمبر 2015ء

READING
Section

”کیا تھا اس کا فون بند ہے، پھر ٹرائی کرتی ہوں۔“ بی جان نے کہا۔
 ”اچھا ٹھیک ہے میں ہی چلی جاؤں گی۔“ وہ مان گئی۔
 ”نہیں رہنے دو فضلو چلا جائے گا۔“
 ”چلیں ٹھیک ہے۔“ وہ مایوس سی اٹھ گئی جب کہ بی جان ہولے سے مسکرا دیں۔

☆.....☆

جہاز لینڈ کر چکا تھا۔ عدیل نے جہاز سے اترتے ہی گھر فون کر دیا تھا۔ فون بی جان نے اٹھایا تھا اور اسے بتایا کہ فضلو تمہیں ریسیو کرنے پہنچ چکا ہے۔ وہ بیگ گھسیٹتا ہوا ایئر پورٹ سے باہر آ گیا تھا اس نے ادھر ادھر نگاہ گھما کے دیکھا فضلو ایئر پورٹ کی رائٹ سائیڈ پر گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ اس جانب بڑھ گیا۔ فضلو بھی صاحب کو دیکھ کر لش پش کھڑا ہو گیا تھا۔
 ”سلام صاحب۔“ اس نے عدیل کے قریب آتے ہی سلام کیا۔
 ”ولیکم السلام! اچھی جگہ کھڑے تھے اگر میں باہر نکل کر اس طرف نہ آتا تو تمہیں ڈھونڈتا ہی رہتا۔“
 عدیل فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا جب کہ فضلو سامان کار کی ڈگی میں رکھنے لگا تھا۔
 ”صاحب! مجبوری میں ادھر آم کھڑا تھا وہ ٹریفک والا لڑکا کہتا ادھر گاڑی کھڑا کرنا نہیں اس لیے ادھر آیا۔“ فضلو نے پشتوں لہجے میں اپنی صفائی پیش کی تھی۔
 ”اچھا ٹھیک ہے۔“ عدیل نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی جب کہ فضلو گاڑی ڈرائیو کرنے لگا تھا۔

☆.....☆

سب لاؤنج میں موجود تھے۔ بی جان، زویا، شمینہ بیگم، ماہا اور سلینہ کو بھی فون کر کے بلوایا تھا۔ وہ ایک طرف تھکی تھکی بیٹھی تھی۔ بی جان نے اسے دیکھ کر کچھ نوٹ کیا تھا لیکن اس وقت خاموش رہیں۔
 ”ارے سلینہ! بچے نہیں آئے کیا؟“ شمینہ بیگم اس کے پاس بیٹھتی ہوئی بولیں۔
 ”نہیں آنی! امی اگلی تھیں اس لیے ان کے پاس چھوڑ آئی ہوں۔“ اس نے جوابا کہا۔
 ”سلینہ آئی! آپ کو آپنی کچن میں بلارہی ہیں۔“
 ”اچھا میں آتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی تھی جب کہ بی جان کی نگاہوں نے اس کی جاتی پشت کو گھورا تھا۔

☆.....☆

عدیل آچکا تھا۔ ملنے ملانے کے بعد خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ ماہا اور سلینہ کچن میں ہی تھیں کامران بھی آ گیا تھا۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ کامران اور عدیل سیاست پر باتیں کرتے رہے جب کہ خواتین اپنی باتیں لیے بیٹھی رہیں۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ جب شمینہ اور زویا جانے کے لیے تیار ہوئیں۔

”ارے آج رک جاتیں شمینہ۔“ بی جان نے انہیں روکا تھا۔
 ”نہیں بہن، زویا کو کالج جانا ہے اور مجھے بھی ایک دو کام ہیں۔“ شمینہ بیگم نے سہولت سے منع کر دیا۔
 انہیں بیٹی کے گھر بلا وجہ جانا پسند نہیں تھا۔
 ”آپ اپنے ڈرائیور کو بولیں وہ ہمیں چھوڑ آئے۔“
 ”ارے ڈرائیور کیوں عدیل چھوڑ آئے گا۔“ بی جان نے فوراً کہا۔

”نہیں بہن عدیل تھکا ہارا آیا ہے۔ معیوب سا لگے گا، آپ ڈرائیور کو بول دیں۔“ شمینہ بیگم چادر اوڑھے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بی جان انہیں دروازے تک چھوڑنے آئی تھیں۔ ماہا کچن میں گھی اس لیے جاتے وقت نہ مل سکی۔ بی جان انہیں رخصت کرنے کے بعد واپس پلٹ آئیں۔

☆.....☆

”ارے امی چلی گئیں؟“ اسے شبو نے بتایا تھا۔

”مجھ سے ملیں بھی نہیں۔“ اسے دوسرا غم کھائے گیا۔

”فون کر لیتا۔“ سلینہ نے فرنی فرنی فرنی میں رکھتے ہوئے مشورہ دیا تھا۔

”باجی! وہ جلدی میں تھیں۔“ شبو نے اپنا حصہ ڈالا۔

”چلو ٹھیک ہے تم یہ عدیل کو چائے دے آؤ۔“ ماہا نے چائے کا گگ سے پکڑا یا اور خود برتن دھونے لگی۔

”ہیں یہ کیا، میاں تمہارا چائے شبو دے۔“ سلینہ نے ہونق بنے پوچھا تھا۔

”وہ جی باجی کو شرم آرہی ہے اس لیے۔“ شبو فوراً بولی۔

”ارے چپ کر میں نے تم سے پوچھا۔“ سلینہ نے اسے ڈانٹ دیا۔

”وہ میں کام کر رہی تھی اس لیے۔“ ماہا ڈر گئی تھی۔

”شبو برتن دھو لیتی ہے تم جاؤ۔“ سلینہ نے شبو سے چائے کا گگ لے کر اسے تھمایا۔

”شبو دے آتی ہے ناں۔“

”جاؤ تم۔“ سلینہ نے اسے گھورا تو اسے جاتے ہی بی بی ناچار وہ ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی کچن سے باہر نکل گئی۔

☆.....☆

اس نے کمرے کو ناک کیا اور ہلکے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ واش روم سے پانی گرنے کی

آواز آرہی تھی۔ عدیل نہا رہا تھا۔ اس نے شکر ادا کیا اور چائے کا گگ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر تیزی سے دروازے

کی جانب پلٹی ہی تھی کہ عدیل واش روم سے باہر نکل آیا۔ وہ وہیں ساکت ہو گئی تھی۔

”ماہا!“ عدیل نے پکارا۔ وہ اس کی جانب پلٹی تھی۔ وہ قریب آ گیا۔

”تم کہاں تھیں جس وقت میں آیا تھا تم میرے سامنے نہیں آئیں کیوں؟“ اس نے پوچھا تھا۔

لیکن اسے ہوش کہاں تھا۔ عدیل بغیر شرٹ کے اس کے پاس کھڑا تھا۔ اس کا مضبوط کسرتی جسم نمایاں ہو

رہا تھا۔ وہ اس کے اتنے قریب ہونے پر چل سی گئی اور فوراً پیچھے ہٹی تھی۔

”وہ میں مصروف تھی۔“ بی الحال اسے یہی بہانہ سوچا تھا۔

”مصروف تھیں یا مجھ سے چھپ رہی تھیں۔“ وہ شوخ ہوا۔

”نن.....ن.....نہیں تو۔“ وہ بوکھلا گئی۔

”کیا نہیں تو۔“ وہ پھر اس کے قریب ہوا۔

”چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔“

”ہونے دو۔“ وہ خمار لہجے میں گویا ہوا۔

”میں آتی ہوں۔“ وہ فوراً دروازے کی جانب لپکی تھی لیکن عدیل نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

”عدیل پلیز.....“

”کیا پلیز۔“ وہ اور قریب ہوا یہاں تک کہ اس کی سانسیں ماہا کے چہرے سے ٹکرانے لگی تھیں۔ ماہا حواس کھوتی جا رہی تھی۔ اچانک عدیل کا فون بج اٹھا۔ وہ یک دم دور ہٹی اور پھر تیزی سے بھاگتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی جب کہ عدیل فون کی جانب دیکھ کر بھنا اٹھا۔

”تمہیں بھی ابھی کال کرنی تھی۔“ دوسری طرف سلیمان تھا۔

”کیوں کیا ہوا؟“

”ہوا کچھ نہیں بس تم نے رومیٹک سین کا ستیاناس مار دیا۔“ وہ بھڑکیلے لہجے میں بولا تھا۔

”اوہ! سوری یار۔“ عدیل شرمندہ ہو گیا۔

”اٹس اوکے، بتاؤ کیسے فون کرنا ہوا۔“

”میں کل آ رہا ہوں۔“

”اوہ گڈ۔“

”میجر فرقان نے میرے بارے میں کچھ کہا تھا؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں کچھ نہیں کہا۔“ سلیمان بولا۔

”اوکے پھر آ جاؤ۔“

”اوکے ہائے رومیٹک سین اشارٹ کر لو۔“ اس نے یہ کہہ کر فوراً فون بند کر دیا جب کہ عدیل کچھ سخت

ست کہتے کہتے رک گیا تھا۔

”خبیث کہیں کا۔“ وہ مسکرا اٹھا۔

☆.....☆

”سلینہ! آج مجھے کسی شیردل کا فون آیا تھا۔“ سلینہ کے ہاتھ سے شیشے کا گلاس چھوٹ کر نیچے جا گرا تھا۔

”کیا ہوا دھیان سے۔“ کامران فوراً اس کی جانب آیا۔

”آپ رہنے دیں میں اٹھالوں گی۔“ وہ فوراً بولی۔

”کیوں آیا تھا فون۔“ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا تھا۔

”تم جانتی ہو؟“ کامران نے غور سے اسے دیکھا تھا وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

”آپ خود کہہ رہے تھے نا کسی شیردل کا فون آیا تھا۔“ وہ سنہلے ہوئے بولی تھی۔

”ہاں کہا کچھ نہیں بس میری آواز سنتے ہی فون کاٹ دیا۔“ کامران بولا۔ جب کہ سلینہ ایک سکون بھری

سانس لے کر رہ گئی تھی۔

”ارے فریدہ! مبارک ہو، سچ مجھے بہت خوشی ہوئی سن کر میں نے کہا تھا نا اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر

نہیں۔ دیکھو اللہ نے تمہاری سن لی اور تمہیں ایک بہت پیارا سا پوتا دئے۔“ بی جان فریدہ بی کے ہاں

مبارک دینے آئی ہوئی تھیں۔ عباد کے ہاں بیٹا ہوا تھا۔

”ہاں اللہ کالا کھلا کھلا شکر ہے۔“ فریدہ بی پھولے نہیں سار ہی تھیں۔

”اب تم کب دادی بننے کی خوشخبری سنا رہی ہو۔“ فریدہ بی نے چائے کا کپ انہیں پکڑاتے پوچھا تھا۔

”تم دعا کرو، بس جب اللہ کا حکم ہوا۔“ بی جان بولی تھیں۔

”ہاں۔ اس پاک ذات کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ بڑا بے نیاز غفور رحیم

ہے۔“ فریدہ بی عاجزی بھرے لہجے میں بولیں تھیں۔

”اور سناؤ بہو ٹھیک ہے۔“ بی جان نے اب کے سفینہ (بہو) کی بابت پوچھا۔

”ہاں ابھی اسپتال میں ہی ہے۔ ایک دو دن تک آجائے گی میں تو تھوڑی دیر کے لیے ہی گئی تھی۔ بس پوتا دیکھ کر واپس آگئی۔ مجھ سے تو اسپتال میں نہیں رکھا جاتا۔“

”تو کون ہے سفینہ کے پاس؟“ بی جان نے پوچھا۔

”اس کی ماں اور بہن ہیں عباد بھی ہے۔“ فریدہ نے بتایا۔

”چلو اللہ خیر خیریت سے گھرا لائے۔“

”آمین۔“

”اچھا تم بیٹھو میں ذرا کھانے کا کہہ آؤں کھانا کھا کر جانا۔“ فریدہ بی اٹھتے ہوئے بولی تھیں۔

”ارے رہنے دو، بس میرے پاس بیٹھو بس ڈرائیو آئے تو میں چلوں۔“

”آرام سے بیٹھو، کھانے کھائے بغیر تو میں نہ جانے دوں۔“ فریدہ بی نے انہیں ٹوکا اور خود کچن کی جانب

چل دیں جب کہ بی جان اپنی اس پیاری سی دوست کے خلوص پر مسکرا دیں۔

☆.....☆

فون کی گھنٹی تو اتر سے بج رہی تھی۔ وہ کچن میں رات کے کھانے کی تیاری میں تھی۔ ہانڈی ڈھک کر وہ

سنگ میں ہاتھ دھونے لگی تھی۔

”اف..... ایک تو اس فون کو بھی چین نہیں۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے کچن سے باہر نکل آئی۔

”جی کون۔“ اس نے فون اٹھاتے ہی پوچھا تھا۔

”شیردل۔“ سلینہ کو ایسا لگا اسے کسی نے تھے صحرا میں کھڑا کر دیا ہے۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر رہ گئی۔

”تم شاید تم میں انسانیت نام کی بھی کوئی چیز نہیں ہے، ورنہ فون کرنے کی ہمت نہ کرتے۔“ اس کی آواز

میں غصے کی شدت تھی۔

”پلیز ایک دفعہ میری بات سن لو۔“ شیردل بے بس سا بولا۔

”ہاں اب کوئی اور گھٹیا جملہ میرے نام کرنا ہے۔“ وہ پھنکاری تھی۔

”پلیز مجھے معاف کر دو، میں شاید کچھ زیادہ ہی نیچے گر گیا مگر یقین کرو جس دن سے تم سے مل کے آیا ہوں

اس دن سے لے کر آج تک میں سکون کی نیند نہیں سو پایا۔ لیکن کیا کروں مجھے اپنے بیٹے کی خاطر جینا ہے۔“

آخری لفظ کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دیا۔

”کیا مطلب تمہاری بیوی کہاں ہے۔“

”وہ مر چکی ہے۔“ شیردل نے اسے ساکت کر دیا۔

”اور میں بھی چند دن کا مہمان ہوں۔ مجھے بلڈ کینسر ہے اور وہ بھی آخری اسٹیج پر ہے۔ مرنے سے پہلے تم

سے معافی مانگنا چاہتا تھا مجھے معاف کر دینا۔ شاید میں اپنے بیٹے کی خاطر بہت خود غرض ہو گیا تھا لیکن کیا کرتا

میری ذہنی رو بھٹک چکی تھی اس لیے تم سے اتنی بڑی بات کہہ گیا۔“ سلینہ پتھر اگئی تھی اور آنسو بے اختیار جھولی

میں گر رہے تھے۔

”بس ایک آخری بات تم میرے بعد میرے آیان کا خیال رکھنا۔ اس کا اس دنیا میں اور کوئی رشتے دار نہیں

ہے۔ صرف تم ہی ہو تم میرے آیان کو ماں کا پیار دو گی ناں؟“ وہ پوچھ رہا تھا لیکن سلینہ کے ہونٹ سل چکے تھے۔

”بتاؤ سلینہ! تم نے مجھے معاف کر دیا ناں۔“ وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں شیردل میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ میں تمہارے آیان کو بہت پیار دوں گی اسے ماں کی کمی نہیں ہونے دوں گی تم جانتے ہو میں تم سے ناراض ہو ہی نہیں سکتی۔“ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی اور باہر دروازے پر کھڑے کامران کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے تھے۔

☆.....☆

”چائے۔“ وہ کمرے میں آئی تو عدیل آگے لیپ ٹاپ پر بیٹھا کوئی فائل تیار کر رہا تھا۔

”ہاں رکھ دو۔“ اس نے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔ چائے سائڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ اس کے پاس ہی بیڈ پر ٹنگ گئی۔

”ناراض ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں تو۔“

”پھر منہ کیوں بنایا ہوا ہے؟“ وہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔

”عدیل بند کریں اسے۔“ اس نے لیپ ٹاپ کھینچا۔

”چھوڑو، ماہادو مجھے ایک ضروری فائل تیار کرنی ہے۔“ اس نے لیپ ٹاپ دوبارہ کھول لیا تھا۔

”سوری عدیل پلیز۔“ وہ اس کے اس رویے پر رودی۔ عدیل مسکرا اٹھا تھا۔

”اوکے ٹھیک ہے رومت ورنہ میں بھی رو دوں گا۔“ مخصوص جملہ کہہ کر وہ دوبارہ ہنس دیا۔

”بد تمیز نہ ہو تو مجھے رلاتے ہی رہتے ہیں۔“

”ہائے نہیں جان! کیا دفعہ لگادی میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ وہ مسخرے پن سے بولا تھا۔

”آپ کو دیکھ کر لگتا ہی نہیں ہے، آپ فوج میں ہیں۔ آپ کو سپرکس میں ہونا چاہیے تھا۔“

”بہت غصہ دلاتی ہو مجھے اس وقت ایسے بھاگی تھیں جیسے میں تمہیں کھا جاؤں گا۔“

”آپ بھی تو بہت بے باک ہو جاتے ہیں۔“ وہ شرما کر بولی۔

”اچھا چلو پھر میں بے باکی دکھاتا ہوں۔“ اس نے یہ کہہ کر ماہا کو اپنی جانب کھینچ لیا۔

”عدیل.....!“ وہ اس کی شرارت پر چیخی تھی اور عدیل ہنس کر رہ گیا تھا۔

☆.....☆

شیردل کو گئے پندرہ دن ہو چکے تھے۔ آیان کو وہ اس دن کامران کے ساتھ جا کر لے آئی تھی اور حیرت انگیز بات کامران کو اس سارے واقعے کا پہلے سے ہی علم تھا اور اس نے ہی شیردل کو فون کرنے کا کہا تھا۔ سلینہ یہ سب سن کر کامران کی پہلے سے زیادہ مشکور ہو گئی تھی اور اپنے رب کا بار بار شکر ادا کر رہی تھی کہ اس نے کامران کو اس کا ہمسر بنایا۔

آیان کو اس نے کسی قیمتی متاع کی طرح سنبھال کر رکھا تھا اور وہ اس سے اور کامران سے کافی حد تک مانوس ہو چکا تھا۔ زینب اور حماد بھی اپنے اس ننھے پیارے سے بھائی کو پا کر کافی خوش تھے۔ اس نے شیردل سے کیا وعدہ پورا کر دیا تھا اور وہ آج سرخرو ہو گئی تھی۔

رواڈ انجسٹ [54] دسمبر 2015ء

READING
Section



عدیل دو دن کے لیے اسلام آباد سے مانسہرہ گیا ہوا تھا۔ ماہا بھی شمیمہ بیگم کی طرف گئی ہوئی تھی۔

”عدیل کا فون آیا؟“ شمیمہ بیگم نے پوچھا تھا۔

”ہاں کیا تھا، انہوں نے کہا کہ پرسوں تک آجائیں گے۔“ وہ بولی تھی۔

”آئی آج شاپنگ پر نہ چلیں۔“ زویا نے فیشن میگزین منہ سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے شام تک چلیں گے۔“

”امی مجھے ڈاکٹر کے پاس بھی جانا ہے۔“

”کیوں..... خیریت۔“ شمیمہ بیگم نے پریشانی سے اس کی جانب دیکھا تھا۔

”پتا نہیں کیوں دو تین دن سے چکر سے آرہے ہیں اور طبیعت بھی بوجھل اور ست سی ہو رہی ہے۔“ شمیمہ

بیگم یہ سب سن کر مسکرا دیں۔

”امی! آپ ہنس کیوں رہی ہیں۔“

”ارے ماہا میں نانی بننے والی ہوں ناں۔“

”کیا مطلب!“ وہ ناگھجی کے عالم میں بولی تھی۔

”ارے پاگل خوش خبری ہے تم ماں بننے والی ہو۔“ شمیمہ بیگم خوشی سے گویا ہوئیں۔

”ہو رہے ہیں خالہ بننے والی ہوں۔“ یہ سن کر زویا نے بھی فیشن میگزین دوراچھالا اور خوشی سے اس کے

گلے لگ گئی تھی، جب کہ وہ شرم کے مارے کچھ بول بھی نہ سکی تھی۔ شمیمہ بیگم نے کلینک سے ہی بی بی جان کو فون کر

کے یہ خوش خبری سنا دی تھی اور سلینہ کو بھی فون کر دیا تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔ ڈاکٹر نے کچھ میڈیسن اور طاقت

کے ٹانگ لکھ کر دیئے تھے اور مکمل بیڈریسٹ کی ہدایت کی تھی۔

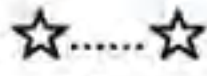
”امی! عدیل کو بتایا؟“ اس نے گھر آتے ہی پوچھا تھا۔

”نہیں، سر پر اتز دینا۔“ شمیمہ بیگم ہنستے ہوئے کہنے لگیں۔

”امی! غصہ کریں گے، فوراً کیوں نہیں بتایا۔“ وہ ناراضی کے ڈر سے بولی تھی۔

”ارے نہیں ناراض ہوتا، پرسوں تو آجائے گا۔“ شمیمہ بیگم اس کے لیے پھل کاٹنے لگیں جب کہ اس نے

پر سکون سانس لے کر آنکھیں موندھ لی تھیں۔



بی بی جان سلینہ بچے سب یہ خوش خبری سن کر دوڑے چلے آئے تھے، بی بی جان تو یہ خبر سن کر پھولے نہیں سار ہی

تھیں۔ انہوں نے آتے ہی ماہا کے دونوں گال چٹا چٹ چوم لیے اور ڈھیروں دعائیں دیں۔ سلینہ بھی اس

کے ساتھ چھیڑ خانی کر کے اسے تنگ کر رہی تھی۔ وہ شرم سے گلال ہوئی جا رہی تھی۔ سب لاؤنج میں بیٹھے

چائے پی رہے تھے کہ اچانک بی بی جان کا فون بج اٹھا۔

”السلام علیکم، کون؟“ بی بی جان نے شائستگی سے پوچھا تھا۔

”ارے عدیل! میرے بچے کیسا ہے تو، ہاں اچھا کتنے دن تک، چلو ٹھیک ہے اللہ تمہیں اپنے مقصد میں

کامیاب کرے اور ہاں تمہیں ایک خوش خبری بھی سنانی تھی۔ تم باپ بننے والے ہو۔“ بی بی جان نے ہنستے ہوئے

بتایا تھا۔

READING
Section

”سچ!“ دوسری جانب وہ چیخ اٹھا تھا۔
 ”ہاں پاگل سچ ہے جھوٹ کیوں بولوں گی۔“ بی جان نے اسے ڈپٹتے ہوئے کہا۔
 ”ماہا ٹھیک ہے۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔ ریٹ کر رہی ہے بعد میں فون کر لینا۔“
 ”چلیں ٹھیک ہے اللہ حافظ۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا تھا۔
 ”عدیل تھا، بہت خوش ہے کہہ رہا تھا کہ سوات کے حالات خراب ہو رہے ہیں اور اسے ایمر جنسی میں
 بلوایا گیا ہے۔“

”اچھا اللہ سے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔“ شمینہ بیگم خوشی سے کہنے لگیں تھیں۔
 ”اچھا بہن میں ذرا ماہا سے مل لوں پھر ہم چلیں گے۔“ بی جان اٹھتے ہوئے کہنے لگیں۔
 ”چلیں آئیں ماہا کے کمرے میں۔“ بی جان نے شمینہ بیگم کے ساتھ ہی قدم بڑھا دیے۔

☆.....☆

”ہیلو کیسی ہو؟“ دوسری جانب عدیل تھا۔

”ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟“

”میں ٹھیک اور بہت خوش ہوں۔“ وہ بولا۔

”تھینک یو سوچ ماہا۔“ اس کے لہجے میں خوشی کی کھنک تھی۔

”کس بات کے لیے؟“ وہ بولی۔

”پیارا ساتھ دینے کے لیے۔“

”آپ کب آئیں گے؟“ اس نے پوچھا۔

”بہت جلد مجھے بھی آنے کی بہت جلدی ہے۔“ ماہا کو اس کا جملہ کچھ عجیب سا لگا تھا۔

”اچھا اپنا بہت سا خیال رکھنا اور میرے پیارے سے منے کا بھی۔“

”آپ جلدی آجائیں ناں۔“ آج پتا نہیں کیوں اسے عدیل کی باتوں سے ڈر لگ رہا تھا۔

”فکر نہ کرو، جلدی آؤں گا۔“ بی جان اور سلینہ کو بہت سا پیار اور سلام دینا، اب مشکل ہے دوبارہ فون کر

سکوں کافی کام بڑھ گیا ہے۔ اچھا اپنا بہت خیال رکھنا اللہ حافظ۔“ اس نے یہ کہہ کر فون کاٹ دیا تھا لیکن ماہا

ابھی بھی فون ہاتھوں میں تھامے بیٹھی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل گھبرار رہا تھا وہ کچھ سمجھ نہ سکی تھی۔

☆.....☆

سوات کے حالات کافی خراب ہو رہے تھے۔ دہشت گرد کئی علاقوں پر قبضہ کر رہے تھے لیکن ہمارے

فوجی بہادر بھائی جرأت مندی اور بہادری سے ان کا مقابلہ کر رہے تھے۔ کیپٹن عدیل، سلیمان، میجر فرقان

بھی سوات کے متاثرہ علاقہ کے کیپٹنوں میں پہنچ چکے تھے۔ سوات کا آدھا علاقہ دہشت گردوں سے خالی کرا

لیا گیا تھا لیکن آدھا بھی ان کے قبضے میں تھا۔ کیپٹن عدیل اور سلیمان کو آڑ دیا گیا کہ وہ اپنی اپنی نفری

لے کر متاثرہ علاقے میں پھیل جائیں کیونکہ دہشت گردوں کی دواہم چوکیاں ابھی بھی قائم ہیں۔ جن کو ختم

کرنا از حد ضروری تھا۔

”عدیل تم اور تمہارے ساتھی پہاڑی والی سائیڈ کی طرف روانہ ہوں گے جب کہ سلیمان جنگل والی

سائیڈ پر نفری لے کر جائے گا۔ کیوں کہ یہی دوا ہم جگہیں ہیں جہاں ان کی چوکیاں ہیں ہمیں امید ہے ہم ان تاسوروں کا مل کر مقابلہ کریں گے۔ چلیں اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ اللہ پاک آپ سب کو اپنے مشن میں کامیاب کرے، آمین۔“ میجر فرقان نے چند اور ضروری باتیں کیں اور ان سب کو ہدایت دے کر چلے گئے۔

☆.....☆

رات کو ان کا سفر شروع ہونا تھا۔ اس لیے وہ صبح ہی تیاریوں میں مصروف تھے۔ عدیل اور سلیمان بھی اپنی اپنی پیکنگ کر رہے تھے۔

”پتا نہیں کیوں آج دل چاہتا ہے کہ اپنا وعدہ توڑ دوں۔“ اس بات پر سلیمان کے کام کرتے ہاتھ رک گئے تھے۔ اس نے سراٹھا کر اس کی جانب دیکھا تھا۔

”ہاں مگر مجھے پتا ہے تم ایسا نہیں کرو گے بلکہ ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ ہم نے دھرتی ماں سے عہد کیا ہے اور ماں سے عہد توڑتے نہیں ہیں۔“ عدیل نے جواباً اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ مطمئن لگ رہا تھا اور شاید عدیل بھی مطمئن تھا اس کا بارہا دل چاہا مہا کوفون کرنے کا لیکن ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اسے ہمت توڑنی قبول تھی لیکن عہد توڑنا قبول نہ تھا اور یوں آخر وہ اپنے عہد کو ساتھ لے کر مشن پر روانہ ہو گیا تھا۔

☆.....☆

اس مٹی کا قرض

ہم کو

اتارنا ہے

اس دھرتی ماں کا

ہمارے پر

بڑا قرض ہے

جسے ہم نے

اتارنا ہے

اس لیے تو دیکھو

یہ دھرتی ماں

کیسے مطمئن و شاد ہے

کیونکہ اس کا قرض

اس کے بیٹوں نے

اتارنا ہے

اس مٹی کا قرض

ہم کو

اتارنا ہے

عدیل سرخرو ہو کر گھبرا چکا تھا۔ اس نے اپنا عہد پورا کر دیا تھا۔ وہ اپنے عہد کا کتنا پکا تھا مہا چپ سی بس اس کی مت کے قریب بیٹھی تھی۔ بالکل چپ اب بول کے کرتی بھی کیا جس سے بولتی تھی وہ تو دور جا چکا تھا۔ دور

رداڈ انجسٹ 57 دسمبر 2015ء

READING
Section

بہت دور، کبھی نہ آنے کے لیے۔ اب تو ان کے درمیان ہمیشہ کی طویل دوری آگئی تھی۔

”ماہا! صرف ایک مرتبہ رو لے۔“ بی جان نے اسے جھنجھوڑا تھا۔

”نہیں بی جان! میں نہیں روؤں گی عدیل کو برا لگے گا۔“ وہ یکدم پیچھے ہٹی تھی۔

”دیکھیں بی جان! عدیل مسکرا رہے ہیں۔“ اس نے اشارہ کیا اور پھر یک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

بی جان نے اسے سینے سے لگا لیا تھا۔

یوں عدیل ان سب کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ پیچھے صرف اس کی یادیں تھیں۔ باتیں تھیں۔ وہ اپنی نشانی چھوڑ

کر گیا تھا ہاں اس کی نشانی اس کا پیارا سا منہ، جو ماہا کو عدیل کی ہمیشہ یاد دلاتا رہے گا اور یہ ان کے پیار کی

پہلی اور آخری نشانی تھی۔ زندگی چلتی گاڑی کا نام ہے۔ جو بس چلتی رہتی ہے۔ بھلا زندگی بھی کسی کے جانے

سے رکی ہے۔ عدیل کو گزرے دس دن ہو چکے تھے۔ ماہا کی حالت کافی خراب ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ

اسپتال ایڈمٹ تھی۔ لوگ افسوس کے لیے آ رہے تھے۔ عدیل کی موت پر ہر آنکھ اشکبار تھی۔ کسی کو یقین بھی

نہیں آ رہا تھا کہ عدیل اتنی جلدی چلا جائے گا۔ یقین تو بی جان کو بھی نہیں تھا مگر وہ مطمئن ہو گئی تھیں۔

”فضل علی، آج ایک اور عہد میں نے پورا کر دیا۔ تیرا اب خوش ہونا؟“ وہ تصور میں فضل علی سے

مخاطب تھیں اور فضل علی کو مسکراتا پا کر خود بھی ہولے سے مسکرا دیں تھیں۔

☆.....☆

دس سال بعد.....

”بیٹا جلدی کرو تا اسکول دین لیٹ ہو جائے گی۔“ ماہا نے ٹیبل پر ناشتہ لگا کر محمد علی کو آواز دی تھی۔

”السلام علیکم امی جان!“ اس نے آتے ہی سلام کیا اور چیئر گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

”وعلیکم السلام! جلدی کریں بیٹا دین آجائے گی۔“ ماہا نے دودھ کا گلاس اس کے آگے رکھا اور کہنے لگی۔

امی! آج ابو کی تصویر سے باتیں کرتے کرتے ٹائم کا پتا ہی نہیں چلا۔“ اس نے دودھ کا گلاس تیزی سے

ختم کیا اور اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”اچھا کیا باتیں کیں آج؟“ ماہا نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

”یہی کہ میں بھی ابو کی طرح بہادر بنوں گا اور فوج میں جاؤں گا۔ اور اپنے ابو کا نام روشن کروں گا۔“ وہ

ایک جذب سے کہہ رہا تھا۔ ماہا نے فقط دل سے آمین کہا تھا۔

”ہاں ضرور۔“ اتنے میں دین آگئی تھی۔

”اچھا امی اللہ حافظ۔“

”جاؤ بیٹا اللہ حافظ۔“ ماہا نے ہولے سے ہاتھ ہلایا اور وہ تیزی سے بھاگتا دروازہ پار کر گیا تھا۔ وہ بھی

دروازہ بند کر کے سیدھی اپنے کمرے میں آگئی تھی۔

”عدیل! تم نے تو اپنا عہد پورا کر دیا اب مجھے کرنا ہے۔“ وہ سامنے لگی عدیل کی تصویر سے باتیں کر رہی

تھی اور ماہا کو ایسا لگا تھا کہ عدیل مسکرا رہا ہے۔ وہ بھی مسکرانے لگی تھی۔

عدیل نے اس دھرتی ماں کا اپنے حصے کا قرض اتارا تھا حالانکہ اس دھرتی ماں کا ابھی قرض کم بالکل کم

معمولی تھوڑا سا قرض اترتا تھا۔

☆.....☆

رداڈ انجسٹ 58 دسمبر 2015ء

READING
Section

ایسا ہی وقت ہے

جون کی تپتی دھوپ سورج کی تیز گرمائش دماغ کو چھو رہی تھی جبکہ سورج کی تیز روشنی سے آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ سڑک پر جمی ٹریفک میں گاڑیوں کے بڑھتے ہجوم کے ساتھ ساتھ لوگوں کا شور بھی ماحول میں افراتفری



READING
Section

جگہ گاڑیوں سے خالی تھی، وہ کالج اسٹوڈنٹ اور پیدل آتے جاتے لوگوں نے کور کر رکھی تھی۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے آگے بڑھی گاڑی نے تھوڑی سی آگے حرکت کی تو اس نے جلدی سے اس جگہ پر سے گزرنا چاہا ہی تھا کہ پیچھے والی گاڑی وہاں آ کر کھڑی ہو گئی، 10 منٹ کے بعد جب اس گاڑی نے موومنٹ کی تو اس نے جلدی سے پھر گزرنا چاہا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک اور گاڑی آئی اور اس سے ٹکرائی۔ اس کے ہاتھ سے فائل اور بک چھوٹ کر نیچے گر گئی۔

کا منظر پیش کر رہا تھا، جہاں کچھ لوگ خاموشی سے گاڑیوں میں بیٹھے ٹریفک رولز کو فالو کرتے گرین سگنل ہونے کا ویٹ کر رہے تھے تو کچھ لوگ اپنی منزل کی طرف بڑھنے کی جلدی میں ہارن پہ ہارن بجا رہے تھے۔ آج آخری پیر دے کروہ کالج سے باہر کھڑی سر پر پہنچتی دھوپ سے پسینے میں شرابور ہوئی رش کم ہونے کا ویٹ کر رہی تھی، اسے لگا کہ اگر وہ اسی طرح کھڑی رہی تو شاید رات یہیں پڑ جائے۔ کیونکہ گاڑیوں کی لمبی لمبی لائین اتنی جلدی ختم نہیں ہونے والیں۔ سڑک پر جو



READING
Section

”ہانی!“ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص نے بے ساختہ کہا اور جلدی سے گاڑی سے اترا۔
 ”صبا آریو اوکے؟“ کسی لڑکی نے اسے پیچھے سے پکارا۔ تو اس لڑکے نے بھی اپنی کیفیت پر قابو پایا تھا۔
 ”ایم سوری!“ قریب آ کر اس لڑکے نے اس سے کہا جو بیک اور فائل اٹھا رہی تھی۔ سیدھی ہو کر وہ آواز کی سمت پلٹی۔

”واٹ سوری! اندھے ہیں آپ..... نظر نہیں آتا آپ کو۔“ وہ تو کچھ مل کے لئے سشدر رہ گیا، شاید وہ یہ سب ایک سیٹ نہیں کر رہا تھا۔
 ”مجھے تو لگتا ہے نظر آپ کو نہیں آتا، دیکھ نہیں رہی اتنی ٹریفک کو پھر بھی احمقانہ حرکت کر رہی ہیں آپ۔ اگر اتنا ہی شوق ہے مرنے کا تو کسی اور کی گاڑی.....“

”واٹ ریش، یہ جواتنے بڑے بڑے گاگلز لگائے ہیں اگر ان کا کوئی فائدہ نہیں ہے تو انہیں اتار کر کہیں دیوار سے دے ماریں۔ اگر ڈرائیونگ نہیں کرنی آتی تو بندہ نہ کرے۔ اوہ نہ ایویس شوخیوں پر اترے رہتے ہیں۔“ کہتے ساتھ ہی وہ آگے بڑھ گئی۔ وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

.....☆.....

”السلام علیکم! انابی پلینز پانی پلا دیں۔“ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اس نے فائل اور بیک ایک طرف پھینکی، دوپٹہ ایک طرف، جوتے اتارے بغیر ہی وہ صوفے پر لیٹ گئی۔
 ”انابی کلاس میں نہیں لائے گا، بوتل ہی لے آئیں بہت پیاس لگی ہوئی ہے۔“ اف اس دفعہ تو لگتا ہے پاکستان کی گرمی نے عالمی ریکارڈ توڑنا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ گاڑی والا لڑکا نظر آ گیا۔

”ایڈیٹ، جانور، جنگلی۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگی۔
 ”کیا ہوا پیر اچھا نہیں ہوا، منہ پر بارہ کیوں بیج رہے ہیں۔“ انابی نے اسے بوتل اور گلاس پکڑاتے ہوئے پوچھا۔ اس نے جلدی سے گلاس پانی سے بھر اور ایک ہی سانس میں ختم کر دیا۔ انابی اسے دیکھ کر ہی رہ گئیں۔ انہوں نے اسے کافی دفعہ منع کیا تھا کہ ایک ہی

سانس میں گلاس ختم مت کیا کرو۔ مگر وہ صبا ہی کیا جو بات مان جائے۔

”کیا بتاؤں انابی! آج تو مرتے مرتے پجھی۔“ اس نے ایک ہی سانس میں ساری ڈیٹیل بتادی۔
 ”اوہ میرے خدا تمہیں کہیں چوٹ تو نہیں لگی۔“
 ”اگر لگ جاتی تو اس کی خیر نہیں تھی، ویسے کمی تو ابھی بھی نہیں چھوڑی تھی میں نے۔“ انابی خوب اسے جانتی تھیں۔ کوئی اسے کچھ کہہ کر جائے تو جائے کہاں یہ تو چیل کوؤں کی طرح پڑ جاتی ہیں محترمہ۔

”انابی! یہ جو لمبی لمبی گاڑیوں میں بیٹھنے والے چلتے پھرتے لوگوں کو کیڑے مکوڑے سمجھتے ہیں کیا؟“ اتنا کچھ کہہ کر بھی اس کا غصہ کسی طور پر کم نہیں ہو رہا تھا۔

.....☆.....

صبح سویرے کا وہ گاڑی لے کر نکلا رات 8 بجے گھر واپس آیا تھا، اس وقت آغا پلس رنگی برنگی روشنیوں میں نہایا ہوا تھا، وہ لاؤنج میں آیا جہاں گھر کی یٹک پارٹی نے خوب محفل جمار کھی تھی۔

اس نے غصے سے گاڑی کی چابی ٹیبل پر پھینکی اور گرنے کے سے انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے آنے سے ساری یٹک پارٹی خاموش ہو چکی تھی جسے شاید اس نے نوٹ نہیں کیا تھا۔

”بجھتی کیا ہے خود کو؟ بدتمیز و جاہل لڑکی۔“ وہ منہ میں ہی بڑبڑایا۔ ہانی نے اسے پانی لادیا جسے اس نے خاموشی سے تھام لیا۔

”کیا ہوا کس نے تمہاری شان میں گستاخی کر دی۔“ جیسے ہی اس نے خالی گلاس ٹیبل پر رکھا تو اصرار نے پوچھا۔
 ”کچھ نہیں یار بس ایسے ہی.....“

”بھائی کیا بنا اس کام کا جس کے لئے چاچو نے بھیجا تھا۔“ عائبہ نے پوچھا۔

”اس کے لئے تو تجل خوار ہو کر آ رہا ہوں اس سے تو اچھا تھا، میں یونیورسٹی ہی چلا جاتا۔ اتنی تھکاوٹ تو نہ ہوتی، میں فریش ہو جاؤں اتنی دیر میں کھانا نکال دو

پلیز۔ وہ کہتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆.....

”جی بی جان! آپ نے مجھے بلایا۔“

”ہاں ریحان بیٹھو! میں نے تم سے جو کام کہا تھا کیا

بناس کا؟“

”جی جان! میں پتہ کروا رہا ہوں جلد ہی کوئی

سراغ۔“

”یہ کوئی مشکل کام تو نہیں تھا تمہارے لئے جسے تمہیں

کرنے میں اتنا ٹائم لگے۔“ جی بی جان ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں

تھیں اس نے تو تیسرے دن ہی پتہ لگوا لیا تھا لیکن کچھ

اچھی معلومات نہیں ملی تھیں جو بی جان کو وہ بتا پاتا۔

”آخر کب تک بی جان سے چھپائیں گے آپ،

ایک نہ ایک دن تو بتانا ہی پڑے گا۔ میرے خیال میں

جتنی جلدی ہو سکے آپ انہیں بتادیں، ان کی آس امید

تو باقی نہ رہے، صبر تو ظاہر ہے آہستہ آہستہ ہی آئے

گا۔“ نویدہ بیگم کی آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

”مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہے

ہو۔“ انہیں اپنے مٹے کے چہرے پر اتار چڑھاؤ صاف

نظر آ رہے تھے۔ وہ گڑبڑا گئے۔

”جی جان! آپ کے لئے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔“

انہوں نے بہت ہمت کر کے سر جھکائے کہا۔

”کیا خبر ہے بتاؤ مجھے، کیا وہ یہ ملک ہی چھوڑ گیا ہے

پھر بھی تمہیں کوئی مشکل نہیں ہونی چاہئے، اب تو دنیا

مٹھی میں سمٹی لگتی ہے کچھ بھی ممکن نہیں رہا تو پھر تم.....“

”جی جان! وہ ملک تو کیا دنیا ہی چھوڑ گیا ہے۔“

انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا.....“ انہیں شاید یقین نہیں آ رہا تھا۔

”رحمان اور اس کی بیوی جہاں رہتے تھے وہاں

سے میں نے پتہ کروایا ہے، رحمان اور اس کی بیوی کی

کافی عرصے پہلے ڈیڑھ ہو چکی ہے، ان کی ایک بیٹی

ہے، جو کسی وجہ سے وہ گھر بیچ کر تین ماہ پہلے وہاں سے

جا چکی ہے، یہ معلومات وہاں کے رہنے والے مالک

مکان نے دی تھیں۔“

”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، میرا بیٹا مجھ سے ملے بغیر

نہیں.....“ وہ تڑپ تڑپ کر رو دیں، جو ایک آس امید

تھی وہ بھی ٹوٹ چکی تھی۔

☆.....

سید ضحان آغا اور میمونہ بیگم کے تین بیٹے تھے، شیبان

، ریحان اور رحمان..... شیبان کی شادی آغا جی نے اپنی

بھینجی جبین سے کی تھی۔ ان کی چار بیٹیاں عازہ و عائشہ،

رائہ، نامہ اور دو بیٹے شعیب اور شاذل تھے۔ ریحان کی

شادی میمونہ بیگم نے اپنی بھانجی نویدہ سے کی تھی، جن

کے دو بیٹے احمد اور اشعر اور ایک بیٹی ہانیہ تھی۔ جبکہ رحمان

کی شادی انہوں نے زبردستی اپنی بھینجی سے کی تھی، جس

کا ایک ہی بیٹا عبدالہادی تھا، شادی کے کچھ ہی عرصہ

بعد انہوں نے پسند سے اپنی کلاس فیلو سے شادی کر لی

تھی، جب گھر والوں کو پتہ چلا تو انہوں نے ایکسپٹ

کرنے سے انکار کر دیا، تب وہ بیوی کو لے کر کہیں اور

شفٹ ہو گئے تھے۔ ہادی چار سال کا تھا جب اس کی

ماں کی ڈیڑھ ہو گئی تب رحمان نے اسے ساتھ لے

جانے کی بہت کوشش کی، لیکن آغا جی نے اسے لے

جانے نہیں دیا تھا، جبکہ ہادی باپ سے کافی اٹیچ تھا، وہ

اس سے ملنے آئے تھے، لیکن وردہ کی ڈیڑھ کے بعد آغا

جی نے اس پر گھر کے دروازے بند کر دیئے۔ انہوں نے

بھی یہاں آنا چھوڑ دیا تھا۔ آغا جان کی ڈیڑھ کے بعد

اب میمونہ بیگم ہی گھر کی سربراہ تھیں۔ وہ تو انہیں بہت

پہلے ہی معاف کر چکی تھیں۔ لیکن آغا جی اپنی ضد پر

اڑے ہوئے تھے۔ ان کی ڈیڑھ کے بعد بی جان چاہتی

تھیں۔ ان کا بیٹا ان کے پاس آ جائے، جسے دیکھے

سالوں گزر چکے ہیں۔

☆.....

”کچھ جلدی خیال نہیں آ گیا بی جان کو اپنے گمشدہ

بیٹے کا.....“ اپنے بیڈروم میں آئے ہوئے ہادی نے

کمرے سے آئی ان کی آواز سنی تھی پوری بات سنے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

بغیر ہی وہ کمرے میں آ گیا تھا اور اب جھنجھلا رہا تھا۔
 ”اتنے برسوں بعد خیال آیا ہے اپنے بیٹے کا۔“ جبکہ
 ہادی تو ان کو پچھلے کئی سالوں سے تلاش کر رہا تھا۔ لیکن
 ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ وہ وقت کے ساتھ
 ساتھ ایک خول میں بند ہوتا جا رہا تھا۔ ہر وقت سنجیدگی کا
 لبادہ اوڑھے رکھتا تھا۔

☆.....

یونیورسٹی کے پارکنگ ایریا میں بمشکل ایک گاڑی کی
 جگہ پکی تھی۔ آج کوئی سیمینار تھا لہذا کافی سارے باہر
 کے لوگ بھی آئے ہوئے تھے۔ اس جگہ اشعر اور شاذل
 اپنی گاڑی پارک کرنے ہی لگے۔ تھے کہ سامنے سے
 ایک بائیک آ کر رکی، بائیک پر ایک لڑکی تھی، لڑکی نے
 ہارن بجا بجا کر انہیں گاڑی پیچھے کرنے کو کہا۔ غصے سے
 اس نے ہیلمٹ اتارا اور انہیں دیکھنے لگی۔

”اوئے ہانی!“ شاذل نے دیکھتے ہی کہا۔

”صبا!“ اشعر منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

”یہ تو وہی ہے جس نے اس دن سڑک پر مجھ سے منہ
 ماری کی تھی، جس کی وجہ سے میں 4 دن ڈسٹرب رہا تھا۔ وہ
 ہارن سننے کی بجائے اپنی باتوں میں لگے ہوئے تھے۔“

”مسٹر! اگر آپ کو گاڑی میں سونے کا شوق ہے تو یہ
 شوق کہیں اور جا کر پورا کریں، پلیز یہاں سے گاڑی
 ہٹائیں مجھے اپنی بائیک پارک کرنی ہے۔ میری کلاس کا
 ٹائم ہو گیا ہے۔“ باتوں باتوں میں انہیں پتہ ہی نہیں چلا
 کہ کب لڑکی ان کے سر پر پہنچ چکی تھی۔

”نو محترمہ آپ اپنی بائیک پیچھے کریں کہ ہم اپنی
 گاڑی پارک کر کے آپ کو راستہ دے سکیں، ویسے سائیڈ
 سے آپ کی بائیک آرام سے گزر سکتی ہے۔“ اشعر
 مزے سے بولا۔

”مجھے رستہ نہیں چاہئے۔“ وہ جھنجھلا گئی۔

”تو کیا دل چاہئے، وہ بھی کھڑے کھڑے۔“ اشعر
 نے مصنوعی حیرت سے پوچھا، شاذل نے اس کو اس پر
 اسے گھورا تھا۔

”واٹ..... دماغ درست ہے آپ کا۔“ لڑکی اچھل
 ہی پڑی۔

”کیوں آپ کو ٹھیک کرنا آتا ہے۔“ اشعر
 چپکا۔ شاذل کو یقین ہو گیا کہ وہ واقعی اس کا دماغ سیٹ
 کر دے گی۔

”جی ہاں..... بہت اچھی طرح سے، اور آپ
 جیسوں کا تو مفت میں درست کر دیتی ہوں۔“

”آں..... ہاں۔“

”ایڈیٹ..... راستہ دو مجھے بائیک پارک کرنی ہے۔“
 ”اے ہیلو میڈم ایڈیٹ کے بولا۔“ اشعر کو غصہ
 آ گیا تھا۔

”کول ڈاؤن یار!“ شاذل نے اس کے کندھے پر
 ہاتھ رکھا۔

”ایڈیٹ کو ایڈیٹ نہیں کہوں گی تو اور کیا کہوں گی۔“
 اتنے میں ایک اور جگہ خالی ہو گئی۔

”چل ادھر پارک کر دیتے ہیں۔“ شاذل نے کہا۔ اشعر
 غصیلی نگاہ ڈالتے ہوئے۔ آندھی طوفان کی طرح وہاں
 سے گاڑی بھگالے گیا لڑکی اچھل کر دو قدم پیچھے ہوئی۔
 ”یو ایڈیٹ۔“ لڑکی نے چلا کر کہا۔

☆.....

”میرا تو دل کر رہا تھا اس کی گردن مروڑ دوں۔“
 گھر آ کر بھی اشعر کو سکون نہیں مل رہا تھا۔
 ”تو مروڑ دینی تھی ناں۔“ احمر نے کہا جو چینل کی
 سرچنگ کر رہا تھا۔

”بس بیٹا بس اتنی انرجی ویسٹ نہ کرو ہوتا تم سے
 کچھ نہیں ہے صرف باتیں ہی کرتے ہو۔“ شاذل نے
 جلتی پتیل ڈالا تھا۔

”تم پھا پھا کٹنے تم نے ہی کہا تھا کول ڈاؤن۔“
 ”اور تو ہو گیا، شاہاش، قربان جاؤں تیری
 فرمانبرداری پر۔“

”اب وہ مجھے ملی ناں تو پھر دیکھنا۔“
 ”کیا کرے گا اس کے پاؤں پڑ جائے گا۔“

صاحب یہ یہاں جا ب کے لئے آئی ہیں اور میں نے انہیں اپائنٹ کر لیا ہے۔“

”مس صبا! میں آپ کو ایک چانس دے رہا ہوں جس میں آپ نے اپنی قابلیت ظاہر کرنی ہے۔“

“Thank You Sir”

.....☆.....

اسے ایک ہفتہ ہو گیا تھا اس جا ب پر۔ ہادی کو یہ ماننا ہی پڑا کہ وہ ایک قابل لڑکی ہے، وہ پہلے دن والی بات نہیں بھولا تھا جب اس نے اشاف کے ساتھ ساتھ اسے بھی گڈ مارنگ کہا۔ خود بڑھ کر اس کی ٹیبل تک آیا تھا۔

”ہیلو مس صبا! کیسا لگا آپ کو آفس میں پہلا دن۔“

”سر! اشاف تو بہت اچھا ہے مگر آفس میں خاص کر اکاؤنٹ سیکشن میں کچھ تبدیلی کی ضرورت ہے۔“ صبا نے اسی اعتماد کے ساتھ کہا جو اس کا خاصا تھا۔ مگر ہادی اس جواب کی توقع نہیں کر رہا تھا وہ چونکے بنا نہ رہ سکا۔ مگر جلد ہی خود کو نارمل کر لیا تھا۔

.....☆.....

آج اس کو پہلی سیلری ملی تھی، وہ انابی کے ساتھ شاپنگ کے لئے آئی تھی۔ شاپنگ سے فارغ ہو کر کسی کنونینس کے انتظار میں سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ اگر اکیلی ہوتی تو وہ اپنی بائیک پر آ جاتی، جبکہ انابی کو اس ہوائی سواری سے بہت ڈر لگتا تھا، اس لئے وہ کسی رکشے، ویگن پر ہی سفر کرنا پسند کرتی تھیں۔

ابھی وہ انتظار میں ہی تھی کہ کچھ ہی فاصلے پر اس کی نظروں کے سامنے ایک منظر گھوما جسے دیکھ کر وہ چند سیکنڈ کے لئے سکتے میں ہی رہ گئی۔ اچانک ہی وہ سنبھل گئی تھی، ہاتھ میں پکڑے شاپنگ بیگ نیچے گرائے، سڑک کے پتھوں بچ کھڑی ہو گئی۔

دراصل وہاں ایک گاڑی والے نے سڑک کر اس کرتے بچے کو ٹکر ماری تھی، وہ بری طرح زخمی ہو گیا تھا، وہ شخص بھاگنے کو ہی تھا کہ صبا گاڑی کے آگے آگئی ناچار اسے گاڑی روکنا پڑی تھی۔ کیونکہ چاروں طرف

”میرا اس وقت تمہارے ساتھ لڑنے کا کوئی موڈ نہیں ہے، اس لئے چپ کر جاؤ، ویسے بھی بھوکے پیٹ لڑائیں جاتا مجھ سے۔“

”تو کیا اس سے لڑنے کا موڈ ہے۔“ ساذل آج زیادہ ہی چپک رہا تھا اشعر نے کشن اٹھا کر اسے مارا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

.....☆.....

”M, I Coming Sir ?“ اس نے دروازے کو ناک کرتے ہوئے پوچھا۔

”یس۔“ اس نے فائل پر نظر جمائے ہوئے ہی کہا۔

”ہانی تم یہاں.....“ جیسے ہی اس نے سامنے دیکھا تو بے ساختہ کہا۔ لڑکی نے اپنے پیچھے دیکھا، لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ تب وہ سمجھی کہ اسے ہی کہا گیا ہے۔

”سر میرا نام صبارحمن ہے کچھ دن پہلے میں نے نیوز پیپر میں آپ کی فرم کے لئے اکاؤنٹ میجر کی پوسٹ کا ایڈ دیکھا تھا، سر میں اسی سلسلے میں آئی ہوں۔“ وہ بڑے کونفیڈنٹس کے ساتھ بولی وہ خود ہی چیئر پر بیٹھ گئی تھی۔ ہادی تو اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے بمشکل خود کو سنبھالا اس سے کوالیفیکیشن وغیرہ پوچھنے لگا۔

”سر میری کوالیفیکیشن تو اتنی نہیں ہے لیکن پھر بھی قابلیت کی بنا پر میں اس پوسٹ کے لئے خود کو قابل سمجھتی ہوں۔“

”لیکن ہم تو کوالیفیکیشن اور قابلیت دونوں کی بنا پر جا ب دیتے ہیں۔“

”سر یہ میری C.V ہے اسے دیکھ لیں۔“ ہادی نے خاموشی سے C.V دیکھی C.V ریکارڈ کے مطابق میٹرک سے BCS تک فرسٹ پوزیشن لی گئی تھی، کچھ ڈپلوماز بھی تھے۔

”Sir I think آپ کو مجھے ایک چانس دینا چاہئے۔“ ہادی نے ایک نظر اسے دیکھا پھر انٹر کام پر زیدی کو اندر آنے کو کہا۔

”مس صبا! یہ یہاں کے G.M ہیں اور زیدی

لوگ بھی اکٹھا ہونے شروع ہو گئے تھے۔
 ”شرم تو نہیں آتی آپ کو ایک معصوم بچہ آپ کی وجہ سے موت کے منہ میں جا رہا ہے اور آپ نے بے حسی کی ساری حدیں ہی پار کر دیں۔ اسے ایسے ہی چھوڑ کر جا رہے ہیں۔“ اس نے گاڑی میں بیٹھے نو عمر لڑکے کا دھیان اس بچے کی طرف کر دیا تھا جو بے ہوش ہو چکا تھا۔ سر سے تیزی سے خون بہ رہا تھا۔ پاس بیٹھی شاید اس کی ماں تھی۔ جو سر پکڑے رو رہی تھی۔

وہ گاڑی سے اتر آیا تھا، اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ ”انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہے آپ میں، آپ تو انسان کہلانے کے بھی لائق نہیں ہیں بے حس۔ اب میری شکل کیا دکھ رہے ہیں اٹھائیں انہیں ہسپتال لے کر جائیں۔“ صبا مسلسل چیخ رہی تھی۔

لڑکے نے سات آٹھ سالہ بچے کو بازوؤں میں اٹھا کر گاڑی میں ڈالا تھا۔

”آئی! آپ بھی گاڑی میں بیٹھیں اور پلیز حوصلہ رکھیں اللہ بہتر ہی کرے گا۔“ صبا نے آئی کو اٹھایا اور گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بچے کے پاس بٹھا دیا۔ صبا کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

”اور آپ لوگ.....“ اس نے ارد گرد اکتھے لوگوں کو دیکھا۔
 ”صرف تماشا ہی دیکھ سکتے ہیں کچھ نہیں سکتے۔“ کہتے ساتھ ہی وہ اتابی کی طرف بڑھی جو اس سے بھی زیادہ غصے سے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ اسے پتہ تھا کہ اب اتابی اسے خوب سنائیں گی۔

☆.....

”آخر وہ کوئی لڑکی ہے یا کوئی بہروپ، اور کتنے روپ ہیں اس کے جو میرے سامنے آئیں گے۔“ وہ کب سے بیٹھا صرف اس کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔

وہ کافی دنوں کے بعد آج نظر آئی تھی، صبح جب وہ شاپنگ سینٹر سے باہر پارکنگ ایریا میں اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا تو کچھ فاصلے پر لوگوں کا جم غفیر دیکھا، وہ گاڑی کی بجائے ہجوم کی طرف چل دیا تھا، جہاں اس

کی طرح کا کوئی اور صبا کے عتاب کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ اس نے کچھ ہی فاصلے پر اس کی آواز سن لی تھی، یہ آواز وہ ہزاروں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ کچھ آگے بڑھا تو ہکا بکا رہ گیا تھا۔ صبا ایک بچے کی خاطر جسے وہ جانتی تک نہیں تھی گاڑی والے کو بے بھاؤ کی سنا رہی تھی۔ اس کی آواز میں کتنا درد تھا، آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے جو شاید اسے محسوس نہیں ہو رہے تھے۔

”اس کا مطلب وہ ایک حساس دل بھی رکھتی ہے۔“ اشعر سوچتے ہوئے مسکرا دیا۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی کی تو بات تھی جب اس کی ایک دفعہ پھر جھڑپ ہوئی تھی یونیورسٹی میں اس سے۔

”ہم لائبریری میں ہی ہوں گے تم وہیں آ جانا۔“ اشعر نے سناڈل کو کہا تھا۔ جو اسائنمنٹ لے کر اپنے ڈپارٹمنٹ کی طرف بھاگا تھا۔

وہ لوگ ابھی لائبریری کے دروازے سے داخل ہی ہونے والے تھے کہ لڑکیوں کا گروپ تیزی سے باہر نکلا۔ وہ سب آپس میں باتیں کر رہی تھیں کہ اشعر کا دوست سعد اس گروپ کی ایک لڑکی سے ٹکرا گیا۔

”اوہ..... ایم سوری۔“ سعد نے معذرت کی حالانکہ غلطی اس لڑکی کی تھی۔

”اوہ..... اس۔“ لڑکی نے فقرہ بھی پورا نہیں کیا تھا کہ انہی میں سے ایک اور لڑکی بول پڑی۔

”واٹ سوری ہاں تم لوگوں کا تو کام ہی.....“ اشعر کے دماغ میں جیسے دھماکہ ہوا۔ ”ارے یہ تو وہی ہے۔“

”ہم لوگ تو جو بھی ہیں محترمہ! ذرا اپنا حدود اور بعد بتانا پسند کریں گی، ہر کسی سے خواہ مخواہ فری ہونے کی کوشش کرتی رہتی ہیں شاید ہابی ہے آپ کی۔“ جن بے چاروں کی ٹکر ہوئی وہ تو بھول بھال ان دنوں کو خاموش گردانے میں لگ گئے۔

”تم سے فری ہونے کی کوشش مائی فٹ..... شکل دیکھی ہے اپنی سڑے ہوئے بیگن۔“

”اور تم..... تم کیا ہو کیڑا لگی بھنڈی۔“ سناڈل اسائنمنٹ

میں یہی لفظ سننے کو ملتا تھا۔

☆.....

”خون اپنے خون کو دیکھ کر جوش تو مارتا ہے۔“ بی جان کی کافی عرصہ پہلے کی ہوئی بات آج اس کی سمجھ میں آئی تھی۔

”تو یہ کشش تھی جو مجھے اپنی طرف کھینچتی تھی۔“ جب سے اسے پتہ چلا تھا کہ صبا اس کی بہن ہے، اس کے اندر ایک ہلچل سی مچی، ابھی کل ہی کی تو بات تھی جب..... وہ آفس میں بیٹھالیپ ٹاپ میں بیزی تھا جب وہ ناک کئے بغیر اندر داخل ہوئی۔

”سر! مجھے پریشن چاہئے فوراً گھر جانے کی۔“ ”خیریت۔“ ہادی اسے دیکھ کر ہی پریشان ہو گیا تھا آج سے پہلے اسے کبھی اتنا پریشان نہیں دیکھا تھا۔ ”نہیں سر! خیریت نہیں ہے۔ مجھے ابھی ابھی گھر سے کال آئی ہے انابی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے۔“ ”اوکے آپ جائیں، ٹھہریں آپ جائیں گی کیسے؟ آپ کی بائیک ٹھیک ہو گئی ہے؟“ اس کی بائیک پچھلے تین دن سے ورکشاپ میں تھی۔

”نہیں سر! میں کوئی کنونینس پکڑ لوں گی۔“ وہ جلدی سے آفس سے باہر نکلی پیچھے ہی ہادی آ گیا تھا۔ ”چلیں میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ وہ ریش ڈرائیونگ کرتا ہوا 10 منٹ میں ہی اس کے فلیٹ کے سامنے تھا۔ ایک دفعہ پہلے بھی وہ اسے چھوڑنے آیا تھا، لیکن باہر سے ہی واپس چلا گیا تھا آج وہ اندر چلا آیا تھا۔ یہ فلیٹ دو کمروں اور ایک ڈرائنگ روم پر مشتمل تھا۔ صبا گاڑی رکتے ہی تقریباً بھاگتے ہوئے فلیٹ کے اندر چلی گئی تھی۔

”خالہ، انابی کہاں ہیں؟“ اس نے کمرے سے نکلتی خالہ ثریا (ہمسائی) سے پوچھا تھا۔

”بیٹا وہ اپنے کمرے میں ہیں پہلے سے بہتر ہیں۔“ وہ کمرے کا سنتے ہی بھاگتے ہوئے کمرے میں چلی گئی۔ جبکہ خالہ نے دروازے میں کھڑے شخص سے دعا

جمع کروا کے واپس آ رہا تھا تیزی سے سیرھیاں چڑھتے اس نے لائبریری کے باہر ہجوم دیکھا۔ ”یہ یہاں کون سی کانفرنس ہو رہی ہے۔“ وہ حیران ہوتا ہوا آگے بڑھا۔

”تم تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ سے اس طرح بات کرنے کی۔“ لڑکی تو غصے سے لال پیلی ہو رہی تھی۔ ”اس میں ہمت کی کون سی بات ہے بس زبان ہی تو ہلانی ہے۔“ اشعر شاید دل کی بھڑاس نکال چکا تھا سواب اسے زچ کر رہا تھا۔ لڑکی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کیا کر ڈالے۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“ ساذل نے اشعر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”کچھ نہیں یار! یہ عادت سے مجبور ہے۔“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں کندھے اچکا کر بولا۔ ”میں عادت سے مجبور ہوں یا پھر.....“ وہ پھر شروع ہونے لگی۔

”پلیز بس اب بات ختم کریں کافی تماشا ہو چکا ہے۔“ اس نے اشعر کا بازو پکڑا اور واپسی کے لئے قدم بڑھا دیئے۔

”تو یہ لڑکی ہے یا پٹاخہ۔“ سعد تھوڑا آگے جا کر بولا۔ ”ایٹم بم ہے پوری۔“ اشعر ہنسا۔ ”سر! ہوا بیگن.....“ ساذل کو یاد آیا۔ ”ویسے اشعر کی شکل بھی تو ایسی ہی ہے۔“ وہ دل ہی دل میں ہنسا تھا۔ ان دونوں کی بھی شکل بہت میچ ہوتی تھی۔ لوگ انہیں کزن کم اور جڑواں بھائی زیادہ کہتے تھے، اشعر ساذل سے 10، 12 دن ہی بڑا تھا۔

☆.....

”شیبان! میری پوتی کو ہی کہیں سے ڈھونڈ کر لاؤ۔“ بی جان آج کل اپنی پوتی کے لئے پریشان ہو رہی تھیں۔ کچھ بھی تھا وہ ان کی پوتی تھی۔ ان کے عزیز از جان بیٹے کی اولاد۔

”بی جان کو شش کر رہے ہیں ہم..... انشاء اللہ بہت جلد وہ آپ کے پاس ہوگی۔“ بی جان کو جواب

سلام کے بعد اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ چھوٹا سا ڈرائنگ روم کافی نفاست سے سجایا گیا تھا چاروں اطراف دیکھتے اس کی نظر سامنے دیوار پر لگی بڑی سی پکچر پر پڑی تو بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا ڈیڈی، وہ دیوار کے بالکل قریب آ کر غور سے اس تصویر کو دیکھنے لگا۔

.....☆.....

”ڈیڈی کی تصویر یہاں کیسے..... کیا صبا.....“
 ”ایم سوری سر میں ٹینشن میں آپ کو بھول ہی گئی۔“
 ”آئی کی طبیعت کیسی ہے؟“ اس نے بمشکل خود کو

سنجھالا۔

”جی وہ اب ٹھیک ہیں ان کی شوگر ہائی ہو گئی تھی، اوہو میں بھی کن باتوں میں لگ گئی۔ آئیں آپ کو ملوانی ہوں ان سے۔“ وہ سوچوں کے سمندر میں ڈوبتے ابھرتے انا بی کے کمرے تک پہنچا۔ صبا نے اسے اتالی سے ملوایا، خود چائے بنانے چلی گئی۔ وہ اپنی اتج سے کافی بوڑھی لگ رہیں تھیں۔ شاید بیماری نے انہیں ایسا کر دیا تھا۔

اس کا شک یقین میں بدل گیا جب اس نے بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر پڑی فریم شدہ تصویر کو دیکھا۔ اس تصویر میں وہ اپنے می پاپا کے درمیان کھڑی مسکراتی تھی۔ اس کے بعد اس کا وہاں بیٹھنا دشوار ہو گیا تھا، صبا کے بہت اصرار کرنے کے باوجود وہ چائے پئے بنا ہی وہاں سے نکل آیا، آفس جانے کے بجائے وہ گھر ہی آ گیا تھا۔ مزید تصدیق کے لئے اس نے زیدی صاحب کو کال کر کے صبا کا پورا نام پوچھا، جو کہ اس نے صبا رحمن بتایا تھا، اب تو کسی قسم کی غلط فہمی نہیں رہی تھی۔ دوپہر سے رات ہو گئی تھی، وہ مسلسل اسے ہی سوچے جا رہا تھا۔

”مئی پاپا کے بجائے وہ کسی اتالی کے ساتھ کیوں؟“
 کیا پاپا اکلوتی اولاد کو بھی اچھا مستقبل نہ دے سکے؟ یا یہ ناراض تو نہیں ان سے؟“ بے شمار سوالات تھے اس کے ذہن میں..... جس کے جواب صبا کے علاوہ کسی کے پاس نہیں تھے، اس نے کبھی صبا سے اس کا بیک گراؤنڈ نہیں پوچھا تھا۔

.....☆.....

وہ لان میں بیٹھا ہوا تھا۔
 ”کن سوچوں میں گم بیٹھے ہو کس کی یاد ستائے۔“
 شعیب گنگناتے ہوئے اس کے پاس رکھی چیئر پر بیٹھ گیا تب وہ بھی سوچوں سے باہر نکلا۔
 ”کیا بات ہے کچھ پریشان ہو؟“
 ”نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔“

”یار! مجھے کیوں لگتا ہے کہ تم مجھ سے دور ہوتے جا رہے ہو۔“
 ”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”نہیں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، نہ تم مجھ سے بات کرتے ہو کافی دن گزر جاتے ہیں تم سے بات کئے ہوئے تم سے ملے ہوئے۔“

”تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے ڈاکٹر صاحب۔“
 ”یہ آپ کی ہی روٹین ہے جو کسی لیول پر نہیں آ رہی کبھی جناب صبح کو آتے ہیں تو کبھی رات گئے گھر میں چوروں کی طرح گھس رہے ہوتے ہیں۔“

”اچھا زیادہ بنو نہیں، بات بتاؤ کیا ہے، جس کی وجہ سے پریشان ہو۔“ اس نے اس کی حالت پر چوٹ کی گھی کافی بکھرا بکھرا لگ رہا تھا۔

”میری ایک بہن ہے۔“ اس نے بغیر تمہید کے بتایا۔
 ”ہا ہا ہا اس گھر میں اتنی ڈھیر ساری لڑکیوں میں صرف ایک تمہاری بہن ہے۔“

”I am Serious میں ان سب کی نہیں بلکہ اپنی سگی بہن کی بات کر رہا ہوں۔“ وہ اسے بھی کسی کے ساتھ ڈسکس کرنا چاہتا تھا اسے سب بتانا چلا گیا۔

”تو پچھلے 6 ماہ سے وہ تمہارے آفس میں کام کر رہی ہے، تو نے اس کے بارے میں کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔“

”نہیں کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔“
 ”تو کیا اسے بتا دیا۔“
 ”نہیں یار! سمجھ نہیں آ رہا کیسے بتاؤں، ڈائریکٹ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں تمہارا بھائی ہوں۔ کوئی اور طریقہ

سوچنا پڑے گا۔

”پہلے چاچو کا پتا کرو وہ کہاں ہیں پھر سوچتے ہیں کیا کرتا ہے، گھر والوں کو بتایا۔“
”نہیں یار کسی کو نہیں بتایا سوائے تمہارے۔“
”او کے پریشان نہیں ہو ریلیکس ہو کر سوچ پھر کوئی آئیڈیا آئے گا ذہن میں۔“

.....☆.....

وہ تیز تیز کی بورڈ پر انگلیاں چلا رہی تھی جب پاس پڑے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، اس نے ریسیور اٹھا کر کان اور کندھے کے درمیان رکھا اور دوبارہ انگلیاں کی بورڈ پر چلانے لگی۔

”جی..... سر!“ ہادی گلاس وٹڈ سے اسے ہی دیکھ رہا تھا بے ساختہ مسکرا دیا۔
”آپ اسٹاف کے ساتھ لنچ پر کیوں نہیں گئیں۔“
حالات کو وہ جانتا تھا کہ وہ بھی اسٹاف کے ساتھ باہر لنچ کے لئے نہیں گئی۔

”سر! میرا کام تھوڑا باقی تھا اس لئے۔“

”تو چلیں پھر لنچ میرے ساتھ کر لیں۔“

”تھینک یو سر! میں اپنا لنچ باکس لے کر آئی ہوں، کام ختم ہونے کے بعد کر لوں گی۔“
”چلیں میرے ساتھ شیئر کرنے کے بجائے مجھے اپنے ساتھ شیئر کروالیں۔“

”چلیں ٹھیک ہے میں کام وائنڈ اپ کر کے آتی ہوں۔“
”سر کو کیا ہوتا جا رہا ہے دن بدن جب میری خواہش تھی کہ سر مجھ سے باتیں کریں تب یہ مسٹر لفٹ نہیں کرواتے تھے، اور اب خواہ مخواہ باتوں کے مواقع ڈھونڈتے ہیں۔“
سوچتے ہوئے اس نے بالوں میں لگے ہیئر بین کو اتار کر دوبارہ سیٹ کیا۔ پھر دوبارہ سابقہ پوزیشن میں آ گئی۔

10 منٹ کے بعد دوبارہ کال بیل آ گئی۔

”کیا آپ لنچ ٹائم کے بعد آئیں گی۔“

”نہیں سر بس آنے لگی ہوں۔“

.....☆.....

سرنے کافی کھانے کی چیزیں ٹیبل پر رکھی ہوئی تھیں۔
”کیا لے کر آئی ہیں سچ میں؟“ بڑے دوستانہ انداز میں پوچھا گیا۔

”فیصی والا پراٹھا۔“

”واؤ مائی فیورٹ۔“ اس نے جلدی سے لنچ باکس اپنے سامنے رکھا۔

”خود بنایا ہے؟“ اس نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

”نوسر! ویسے بنانا تو لیتی ہوں۔ لیکن اس لفٹ روٹین میں بنانا تو دور کی بات کھانا بھی ڈھنگ سے نصیب نہیں ہوتا، صبح آفس آنے کی تیاری میں بھاگتے دوڑتے ہی ناشتہ ہوتا ہے۔ اتنا بی لنچ باکس تیار کرنے کے ساتھ ساتھ ڈانٹ بھی جاری رکھتی ہیں۔ کوئی ایک آدھ کام ہی ہوگا جو میرا نانی کو پسند ہوگا۔“ وہ حسب عادت اشارت ہو چکی تھی۔ ہادی نے کباب و پیزا اس کی طرف بڑھلایا۔

”آپ نے کبھی اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں بتایا۔“

”سر! میری کوئی لمبی چوڑی فیملی نہیں تھی۔“

”تھی.....“ ہادی کو جھٹکا لگا۔

”جی سر! میں اپنے ماما پاپا کی اکلوتی اولاد تھی، آٹھویں میں تھی جب ماما کی ڈیجھ ہو گئی۔ انہیں بلڈ کینسر تھا۔ میٹرک میں تھی جب پاپا کی ڈیجھ ہو گئی، اتنا بی جنہیں میں شروع سے ہی اپنے گھر میں دیکھ رہی تھی وہ ماما کی کوئی کزن ہیں۔“

پاپا کی خواہش تھی کہ میں بہت زیادہ پڑھوں ویسے تو انہوں نے کافی سیونگ کی ہوئی تھی، لیکن وہ میرے مستقبل کے لئے کافی نہیں تھی، اوپر سے یونی کے اخراجات بہت زیادہ تھے، BCS کے بعد میں نے اپنا گھر بیچ دیا وہ یونیورسٹی سے بہت دور تھا۔ اور یہاں آ گئی۔ یونی میں ایڈمشن لیا کیونکہ پاپا کی خواہش مجھے بہت عزیز تھی۔ اب صبح جا ب پر آئی ہوں اور ایوننگ

کلاسز اٹینڈ کرتی ہوں۔“ اس نے گالوں پر بہتے آنسو صاف کئے۔ ہادی جو سکتے کی سی کیفیت میں اسے دیکھ رہا تھا ہوش میں آیا۔

”تمہارا دودھیال ننھیال نہیں ہے؟“ وہ ایک دم آپ سے تم پر آیا تھا۔

”سر! ننھیال تو نہیں ہے، ماما اکلوتی تھیں جبکہ دودھیال کا مجھے پتہ نہیں ہے ماما نے میرے پوچھنے پر ایک دفعہ بتایا تھا کہ پاپا اپنے گھر والوں سے کسی بات پر ناراض ہیں۔ ماما نے بات نہیں بتائی تھی۔“

”تو تم نے کبھی ڈھونڈنے کی کوشش کی کہ نہیں۔“

”نہیں سر! انہوں نے اپنے سگے بیٹے کو دھتکار دیا تو میں تو پھر ان کے بیٹے کی اولاد ہوں۔“

”شاید تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ پیرنٹس کو اپنے بچوں سے زیادہ ان کے بچوں سے پیار ہوتا ہے، اپنی دے کھانا کھاؤ۔“

”کیا تم مجھے اپنا بھائی بنانا پسند کرو گی۔“ کافی توقف کے بعد پوچھا گیا۔

”جی.....“ وہ حیران رہ گئی۔

”کیا تمہیں مجھے بھائی کہنا اچھا نہیں لگتا۔“

”نہیں سر! ایسی بات نہیں ہے مجھے تو بھائی کی بہت خواہش تھی۔“

”تو چلو ٹھیک ہے آج سے میں تمہارا بھائی اور تم میری گڑیا جیسی بہن۔“ ہادی نے پیار بھرے انداز میں کہا۔

”تھینک یوسر!“ اس نے آنکھوں میں نمی لئے کہا۔

”پھر سر..... بھائی کہو ناں۔“

”جی بھائی!“ وہ مسکرا دی، ہادی کو اس کے منہ سے بھائی لفظ بہت اچھا لگا تھا۔

”ایک بھائی کی بات مانو گی۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ایک بھائی اپنی بہن سے کہہ رہا ہے کہ وہ کل سے جا ب پر نہیں آئے گی۔“

”جی۔“ اسے سمجھ نہیں آئی۔

”وہ کل سے مکمل اپنی پڑھائی پر توجہ دے گی، باقی کے سارے کام میرے۔“

”سوری بھائی! میں یہ نہیں مان سکتی، بھائی میں اپنے بل بوتے پر سب کرنا چاہتی ہوں۔“

”تو اس کا مطلب تم نے مجھے بھائی نہیں مانا دل سے۔“

”نہیں بھائی ایسی بات نہیں..... مگر.....“

”بس نو آرگو مینٹس پلیز یہ میری خواہش ہے۔“

”او کے سر! اوہ مطلب بھائی۔“ اس نے سرینڈر کر دیا۔

”بھائی ایک بات پوچھوں؟“

”ہاں پوچھو۔“ ہادی نے مسکرا کر کہا۔

”فرسٹ ٹائم آپ نے مجھے ہانی کیوں کہا تھا؟“

”اوہ..... وہ..... بالکل تمہارے جیسی کیوٹ سی میری ایک کزن ہے گھر میں سب سے چھوٹی اور سب کی لاڈلی ہے۔“

”او کے بھائی! اب میں جاؤں لیج بریک ختم ہو گئی ہے۔“

”ہاں جاؤ اور جو کہا ہے اس پر کل ہی عمل ہو جانا چاہئے۔“ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا میری بہن اتنے گرائس سے گزر کر اتنی ٹف لائف گزار رہی ہو گی۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

☆.....

”انابی آپ نے مجھے بلوایا۔“ ہادی نے انابی کے ہاتھ سے چائے لیتے ہوئے کہا۔ جب سے انابی کو پتہ چلا تھا کہ صبا کو اس کے پاس نے بہن بنا کر ساری ذمہ داری خود اٹھالی ہے، وہ بہت پریشان تھیں آج کل تو اپنوں پر اعتبار نہیں ہے کجا کہ غیروں پر۔ انہوں نے ہادی کو اس سلسلے میں بلوایا تھا، صبا اس وقت یونیورسٹی میں تھی۔

”میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم نے صبا کو کس مقصد کے لئے بہن کا رتبہ دیا ہے۔ میری بیٹی بہت معصوم اور سادہ ہے میں تمہیں اسے غلط یوز نہیں کرنے دوں گی۔“

”انابی! میں نے کسی مقصد کے تحت اسے بہن نہیں

ہوں گا۔“ کال بند کرتے ہی ایک جھٹکے سے اٹھا تھا۔
آنکھیں ابھی بھی نیند سے بھری ہوئی تھیں، رات
میںنگ کی وجہ سے کافی لیٹ گھر آیا تھا۔

☆.....

”چلو گڑیا میں تمہیں شاپنگ کروانا ہوں۔“ ناشتے
سے فارغ ہو کر اس نے اسے آفر کی تھی۔
”نہیں بھیا! میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔
ابھی تین ہفتے پہلے ہی تو شاپنگ کی تھی۔“
”وہ تو اب پرانی ہو چکی ہوگی، چلوئی لیتے ہیں انابی
آپ بھی چلیں ناں۔“

”نہیں بیٹا تم لوگ جاؤ، مجھے اب لہج کی تیار کرنی ہے۔“
”انابی لہج ہم باہر سے کر لیں گے اور آپ کے لئے
بھی لے آئیں گے آپ اب آرام کریں۔“ ہادی نے
پیار سے کہا۔

”لڑکیاں تو اپنے بھائیوں سے لڑکر زبردستی ڈنکے
کی چوٹ پر چیزیں لیتی ہیں اور ایک تم ہو قارل ہی رہتی
ہو۔“ ہادی کا بہت دل کرتا تھا کہ صبا اس سے زبردستی
کوئی خواہش منوائے، اس سے پیار سے لڑے،
جیسا کہ ہانی اور نامہ اپنے بھائیوں سے لڑتی ہیں ان
سے زبردستی پیسے نکلوانی ہیں۔

”نہیں بھیا! ایسی بات نہیں ہے، میں پاپا سے ہر
ضد پوری کرواتی تھی۔ ہر جائز ناجائز خواہش پاپا ہی
پوری کرتے تھے۔“ وہ حسب عادت شروع ہو چکی تھی۔
وہ سکون سے ڈرائیونگ کرتا اسے سن رہا تھا۔

”مما تو اکثر انکار کر دیتیں تھیں اور کبھی تو میرے
ساتھ ساتھ پاپا کو بھی ڈانٹ دیتی تھیں کہ آپ اسے سر
پر چڑھا رہے ہیں۔ پاپا مسکرا دیتے، جس پر ممما کا پارہ
اور ہانی ہو جاتا۔“

”اور جس دن پاپا نے میری بائیک والی خواہش
پوری کی تو اس دن تو ممما نے غصے کی حد ہی کر دی تین دن
تک پاپا سے ناراض رہیں۔ وہ نہیں چاہتیں تھیں کہ میں
بائیک لوں کیونکہ یہ ایک خطرناک سواری ہے۔ پاپا نے

بنایا بلکہ وہ ہے ہی میری بہن عبدالہادی رحمن آغا کی
بہن ہے۔“ انابی کچھ لمحے تو بول ہی نہ سکی تھیں۔

”بیٹا تم..... تم رحمن کے بیٹے ہو۔“ انابی نے اس کا
چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر بوسہ دیا۔ ”تمہیں پتہ ہے
تمہارا باپ تمہارے لئے کتنا تڑپتا تھا تم سے ملنے کی
آس لئے وہ منوں مٹی تلے جاسویا۔“ انابی باقاعدہ
رونے لگیں ہادی تو پہلے ہی غمزہ تھا۔
”تم نے صبا کو حقیقت کیوں نہیں بتائی۔“

”میرے خیال میں ابھی مناسب نہیں ہے۔ آپ
بھی ابھی مت بتائیے گا۔ موقع ملنے پر میں خود ہی
بتا دوں گا۔“

”او کے بیٹا! جیسے تمہاری مرضی، ویسے میرے سر
سے تو سمجھو بہت بڑا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ گھر والے
سب ٹھیک ہیں۔“ وہ ہادی سے گھر والوں کے متعلق
طرح طرح کے سوال پوچھنے لگیں۔

☆.....

کب سے اس کے سیل پر بیپ ہو رہی تھی۔ اس
نے بند آنکھوں سے ہی بیڈ پر ادھر ادھر ہاتھ مار کر
موبائل ڈھونڈا، لیس کا بٹن دبا کر کان سے لگایا۔
”ہیلو۔“ نیند میں ڈوبی آواز میں کہا گیا تھا۔
”بھائی آپ ابھی تک سو رہے ہیں؟“
”کیوں خیریت؟“

”بھول رہے ہیں آپ آج سنڈے ہے آپ نے
ناشتہ میرے ساتھ کرنا تھا۔“ ہادی کا بے انتہا دوستانہ
رویہ ہی تھا کچھ انابی نے بھی اسے بھائی بنانے پر کوئی
اعتراض نہیں کیا تھا۔ اس لئے وہ جلد ہی کافی حد تک
اٹیچ ہو چکی تھی۔

”اوہ سوری میں بھول گیا۔“ وہ ہر سنڈے اس کے
ساتھ ہی گزارتا تھا۔ ”میں آدھے گھنٹے میں آتا ہوں۔“
”بھیا آدھے گھنٹے بعد تو ویسے ہی لہج نام اشارٹ
ہو جائے گا۔“

”او کے میں بس 10 منٹ میں اپنی گڑیا کے پاس

رداڈ انجسٹ [71] دسمبر 2015ء

READING
Section

صرف میری خاطر تین دن تک مہا کی ناراضی مول لی۔ اب یہ بایک میرے کسی کام کی نہیں رہی۔ پھر بھی اسے خود سے دور کرنے کو دل نہیں کرتا۔ پاپا نے ہمیشہ مجھے بیٹوں کی طرح ٹریٹ کیا۔ انہیں بیٹے کی بہت خواہش تھی، لیکن اللہ نے ان کی یہ خواہش پوری نہیں کی تھی۔

سنڈے کا دن تو پاپا کا میرے لئے ہی ہوتا تھا۔ میں کبھی پاپا کو اکیلے بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ وہ اکیلے بیٹھتے ہی پتہ نہیں گن سوچوں میں گم ہو جایا کرتے تھے۔ میرے پوچھنے پر ٹال جایا کرتے تھے میں بھی زیادہ پریشاں نہیں کرتی تھی۔

پاپا کی ڈیڑھ کے بعد میں نے خود کو بہت مشکل سے چینیج کیا ہے۔ اتنی دیر میں ہی ہادی شاپنگ سینٹر کے باہر گاڑی پارک کر چکا تھا۔

”اب میری گڑیا کو خود کو چینیج کرنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ پاپا والی ضد اپنے بھائی سے منوا سکتی ہے۔“ ہادی نے اس کے آنسو صاف کئے جو ہونٹوں تک آئے ہوئے تھے، نامحسوس انداز میں اپنی آنکھیں بھی صاف کیں جو کافی نم ہو گئیں تھیں۔

☆.....

”اتنی بے وقوف نہیں تھی میں جتنی بھیا نے مجھے بنا دیا ہے۔ وہ بڑے سے کمرے میں ادھر سے ادھر چکر کاٹ رہی تھی۔“

”وہ مجھے اپنے گھر میں نہیں بلکہ میرے دوھیال میں لے کر آئے ہیں۔“ اچانک انابی کی ڈیڑھ کے بعد بھیا اسے زبردستی اپنے گھر میں لے آئے تھے، جہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ہادی نے اسے لانے سے پہلے شعیب کو انفارم کر دیا تھا۔ اس نے ہی گھر والوں کو بتایا تھا جس سچویشن میں وہ یہاں آ رہی تھی وہ بھی بتا دیا تھا۔ اس کے آنے پر سب ہی بہت ایکسائٹڈ تھے۔ یہاں آ کر سب سے پہلے اس کا سامنا ریحان صاحب سے ہوا تھا، جنہیں دیکھتے ہی اس نے پاپا کہا تھا۔ ہادی نے بخوبی اس کی یہ بڑبڑاہٹ سن لی تھی، وہ مسکرا دیا۔

”کیا ہوارک کیوں گئیں آؤناں۔“ اس نے سب سے پہلے ریحان صاحب سے ملوایا تھا۔ بی جان تو اسے بار بار گلے لگا رہیں تھیں اور مسلسل روئے جا رہی تھیں، تائی چچی کا بھی یہی حال تھا، صبا نے سوچا جو اسے نیا نیا نم ملائے شاید اس کی وجہ سے ہی یہ بھی غمزدہ ہیں۔ لڑکیوں کی ٹنگ پارٹی کافی ایکسائٹڈ تھی۔ ہادی اسے سب سے ملو کر دوبارہ آفس کے لئے نکل گیا تھا۔

عائبہ اسے لئے لاؤنج میں آئی جہاں ہنی ماں کی گود میں بیٹھا رو رہا تھا، جیسے ہی اس کی نظر عائبہ پر پڑی اور زیادہ رونے لگا۔

بانہیں پھیلائے، صبا کی طرف دیکھ کر اور زیادہ چلانے لگا۔ صبا نے جیسے ہی اسے بانہوں میں لیا تو وہ خاموش ہو گیا۔ سب ہی ہنسنے لگیں، صبا کو سمجھ نہیں آئی تھی ان کے ہنسنے کی۔

”تمہارے جیسی ایک لڑکی پہلے ہی اس گھر میں رہتی ہے اور ہنی اس سے بہت اٹیچ ہے، اس وقت وہ کالج میں ہے، یہ تمہیں وہی سمجھ رہا ہے۔“ کنول نے بتایا۔

کسی نے بھی اسے فیل نہیں ہونے دیا کہ وہ ان کی کزن ہے۔ اس نے خود ہی گیس لگایا تھا، ریحان صاحب کو دیکھ کر اور کچھ بی جان کی ڈھکی چھپی باتیں، اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھیں۔

☆.....

جیسے ہی اسے پتہ چلا کہ ہادی بھیا گھر آ گئے ہیں وہ لائبہ سے پوچھتے ہوئے ان کے کمرے میں آ گئی۔ وہ واش روم میں تھے۔ اس نے سرسری سی نگاہ اپنے اطراف میں ڈالی۔ اس کا شک یقین میں تب بدلا جب اس کی نظر بیڈ کے سائڈ ٹیبل پر پاپا کی فریم شدہ تصویر پر پڑی۔ دوسری سائڈ پر ایک عورت اور ساتھ چھوٹے سے بچے کی تھی۔

ابھی وہ دیکھ ہی رہی تھی جب ہادی شرٹ کے بٹن بند کرنا واش روم سے نکلا اسے دیکھ کر ایک پل کے لئے ٹھٹکا تھا۔

”اور ساتھ میں آپ ہیں ناں۔“ اس نے بیڈ کے دوسری طرف رکھی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں میں ہی ہوں یہ میری تیسری برتھ ڈے پر لی گئی تھی۔ ویسے تمہیں بتایا کس نے یہ سب، یقیناً ہانیہ نے بتایا ہوگا اس کے پیٹ میں کوئی بات نہیں رہتی ہے۔“

”اگر یہی سوال میں آپ سے کروں تو.....؟“

”جب تمہیں انا بی کی وجہ سے گھر ڈراپ کرنے گیا تھا، اسی دن ڈرائنگ روم میں لگی ڈیڈی کی تصویر دیکھی تو بس پھر سب کچھ خود ہی سامنے آتا گیا۔“

”میں نے یہاں تاپا ابو کو دیکھ کر گیس لگایا ہے رہی سہی کسر آپ کے بیڈ روم میں آنے سے پوری ہو گئی۔“

”اوہ..... تو یہ بات ہے میں بھی کہوں کہ پلان تو کچھ اور ہی کیا گیا تھا۔“

”پلان..... کیسا پلان؟“

”تمہارے آنے کی خوشی میں آج کاڈنرا سیشنل ہے اسی موقع پر تمہیں سب بتایا جاتا تھا۔“

”چلیں وہ پلان بھی انجوائے کر لیں گے، لیکن پہلے آپ سے ایک بات پوچھوں؟“

”ہاں اس میں اجازت لینے کی کیا بات ہے۔ تم تو زبردستی بھی پوچھ سکتی ہو، حق ہے تمہارا۔“

”پاپا گھر والوں سے کیوں ناراض تھے؟ کیا وجہ تھی کہ انہوں نے اپنا گھر ہی چھوڑ دیا۔“

”پاپا ناراض نہیں تھے بلکہ گھر والے ناراض تھے پاپا سے، انہوں نے گھر نہیں چھوڑا تھا بلکہ چھڑوایا گیا تھا، دوسری شادی کرنے پر۔“ وہ آہستہ آہستہ سب بتاتا چلا گیا۔

.....☆.....

صبا کو زیادہ ٹائم نہیں لگا تھا یہاں سیشنل ہونے میں۔ اس کی تو برسوں پہلے کی گئی خواہش پوری ہو گئی تھی کہ سب اس کے اپنے ہوں۔

”ہانی ایک کپ چائے تو پلاؤ۔“ اس نے صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھے ہوئے اسے کہا جو

”تم یہاں..... میں باہر ہی آنے والا تھا۔“

”بھائی آپ مجھے کہاں لے کر آئے ہیں۔“ آج سے پہلے اس نے اسے اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔

”جب تمہیں پتہ چل ہی گیا ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو۔“

”آپ نے مجھ سے ڈرامہ کیوں کیا سیدھی طرح بتا دیتے۔“ اس کی آواز ٹوٹنے لگی تھی۔ خوشی اور دکھ کے ملے جلے تاثرات تھے۔

”اگر بتا دیتا تو اس وقت جو خوشی تمہارے چہرے پر ہے وہ پہلے پتہ چلنے سے نہیں ہوتی تھی۔“ بھیا نے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا اور مسکرا کر کہا۔

”بھیا! آپ نے چٹنگ کی ہے میرے ساتھ، پہلے بتا دیتے کہ آپ میرے ریل والے بھیا ہیں۔“ کہتے ساتھ ہی وہ منہ چھپا کر بری طرح رو دی۔ پتہ نہیں کیوں جب سے اسے حقیقت پتہ چلی تھی اسے بہت رونا آ رہا تھا۔

”ارے، ارے گڑیا.....! میری جان خوش ہونے کے بجائے تم رو رہی ہو۔“ اس نے اسے اپنے ساتھ لگایا۔

”جب اللہ کو منظور ہونا تھا تب ہی تو ملنا تھا۔“ اس نے اسے بیڈ پر بٹھایا اور خود بھی پاس ہی بیٹھ گیا۔

”گڑیا! تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ میں ڈیڈی سے کتنا پیار کرتا ہوں۔ بہت عرصے سے میں انہیں تلاش کر رہا تھا، اور گڑیا میری تلاش ادھوری ہی رہی وہ مجھے نہیں ملے۔“

”آپ کی تلاش ادھوری نہیں ہے میں تو آپ کو ملی ہوں ناں۔“

”جب مجھے تم سے پتا چلا کہ ان کی ڈیڈی تھو ہو گئی ہے تو مت پوچھو اس وقت میری کیا حالت تھی، اس دن رات کو میں بہت رویا تھا۔“ رو تو وہ اب بھی رہا تھا اور اسے بھی رولا رہا تھا۔

”وہ بڑی مہا کی تصویر ہے ناں۔“ صبا نے پوچھا۔

سامنے ہی صوفے پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔

”تمہیں سنائی نہیں دے رہا“۔ اسے ٹس سے مس نہ ہوتے دیکھ کر اس نے کہا۔

”سن لیا ہے بھئی لارہی ہوں“۔ ابھی وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ بچن سے باہر آتی ہانی بول پڑی۔

”ہاں.....“ شاذل کبھی صوفے پر بیٹھی لڑکی کو دیکھتا تو کبھی بچن کے باہر کھڑی ہانی کو۔

”پھر..... بھوت“۔ تقریباً چیختے ہوئے وہ صوفے سے اٹھا اور سیڑھیوں کی طرف بھاگ گیا۔ ابھی رات ہی تو اس نے ڈروانی فلم دیکھی تھی۔

”اسے کیا ہوا؟“ ہانیہ حیران و پریشان سی کھڑی رہ گئی۔

”یہ کون تھا“۔ صبانے پوچھا۔

”یہ شاذل ہے یہ رات ہی ہوٹل سے آیا ہے“۔

”اوہ تو یہ وہی محترم ہیں جن کے بیڈروم میں رات سو رہی تھی“۔ صبانے دل میں سوچا۔

☆.....

”ہانی تم رات میرے بیڈروم میں کیوں سو رہی تھیں“۔ وہ ابھی سو کر اٹھا تھا، ناشتے کی غرض سے نیچے آیا تھا۔ جہاں ہانی نیوی دیکھ رہی تھی، اسے دیکھتے ہی رات والی بات یاد آئی تھی۔

”جب میں نے منع کیا تھا کہ میری غیر موجودگی میں میرے بیڈروم میں کوئی نہ جائے تو پھر.....“ رات گئے وہ اور شاذل ہوٹل سے آئے تھے، دونوں کا خیال تھا کہ MBA کی تیاری ہوٹل میں رہ کر زیادہ اچھی ہوتی ہے، اس لئے وہ پچھلے تین چار ماہ سے ہوٹل میں ہی رہ رہے تھے، اب وہ احمر اور ہادی کی شادی اٹینڈ کرنے آئے تھے۔

رات جب وہ اپنے کمرے میں آیا تھا تو ٹائٹ بلب کی روشنی میں اس نے ہانی کو بیڈ پر سوتے دیکھا تھا، اس نے اسے بازو سے ہلا کر اٹھایا تھا، پوچھا تھا کہ وہ یہاں کیوں سو رہی ہے اس نے سوائے سوری کے اور کچھ نہیں

کہا۔

کہا تھا اور وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی۔

”میں اور آپ کے کمرے میں..... او ہاں وہ صبا ہوگی بھائی رات کو اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی نیچے ڈھولکی کا شور تھا، تو اسے ممانے آپ کے کمرے میں بیٹھ دیا تھا“۔

”صبا.....“ وہ تو اس کے نام پر ہی اٹکا ہوا تھا۔

”لو آگئیں وہ.....“ جیسے ہی اشعر نے اسے دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ جس کے لئے وہ پچھلے ایک ہفتے سے نظر نہ آنے پر پریشان ہو رہا تھا۔ اس لئے کہ شاید اس نے اسے کھو دیا ہے۔ یہ سوچ کر ہی اس کی حالت غیر ہو جاتی تھی۔ اسے کیا پتا تھا کہ وہ اس کے گھر میں ہے۔

”السلام علیکم!“ سلام کی آواز پر ہی وہ ہوش میں آیا۔

”آپ ایک ہفتے سے یونیورسٹی کیوں نہیں آرہیں؟“ اس نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر ڈالا۔

صبا حیران تھی وہ تو ایسے پوچھ رہا تھا جیسے ان کی بڑی علیک سلیک ہو۔

”جی..... وہ.....“

”ہاں مجھے بتایا تھا آپ کی دوستوں نے کہ آپ کی کسی عزیز کی ڈیٹھ ہوگئی ہے اس لئے آپ نہیں آرہیں“۔

”ہیں..... اسے کیا لینا دینا تھا مجھ سے“۔ وہ تو سوچ کر ہی رہ گئی۔

”اشعر بھائی آپ ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟“

”اوہ..... تو یہ اشعر ہے جسے گھنڈہ بھر پہلے دیکھا تھا وہ شاذل ہے“۔ صبانے سوچا۔

”نہیں زیادہ نہیں جانتے مگر اب جان جائیں گے“۔ اشعر نے پرشوق نظروں سے اسے دیکھا۔ پورا ایک ہفتہ اس لڑکی نے اسے ڈسٹرب کئے رکھا تھا، ڈپارٹمنٹ کے علاوہ پونی کی ہر وہ جگہ دیکھ لی تھی اس نے جہاں وہ اسے نظر آتی تھی۔ لیکن اب نظر نہیں آ رہی تھی اس کی حالت بن پانی کے مچھلی جیسی تھی، جسے وہ بھی

بجھنے سے قاصر تھا، اسے چھن جانے کا خوف تھا۔ آج
اسے سامنے دیکھ کر عجیب سا سکون ملا تھا۔

☆.....

”ہانی..... ہانی.....“ احمر آوازیں دیتا ہوا ہانی کے
کمرے میں آیا۔

”میں نے کہا تھا کہ میرے کپڑے پریس کر دو،
تمہیں اپنے تیار ہونے کی پڑگئی ہے۔“

وہ ڈیرینگ ٹیبل کے سامنے کھڑی دوپٹہ سیٹ
کر رہی تھی۔ جب اس نے آواز پر پیچھے مڑ کر دیکھا تو
اشعر شرمندہ سا ہو گیا، وہاں صبا تھی، وہ ایک جھٹکے سے
باہر نکلا۔

”گڑ پاپلیز! ایک کپ جائے بنا دو۔ خالی پیٹ تو
کوئی کام نہیں ہو رہا۔“ آج مہندی کا فنکشن تھا ہر
طرف افراتفری مچی ہوئی تھی، اس نے غور سے دیکھا
کچن کے دروازے پر صبا نہیں ہانی تھی۔

”آخر تم دونوں کو کس احق نے کہا ہے ایک جیسے
ڈریس پہننے کو.....“ ہادی کے بولنے سے پہلے ہی پیچھے
سے آئے اشعر نے تیز آواز میں کہا تھا۔ دونوں کو ہادی
بھیانے ہی شاپنگ اکٹھی کروائی تھی۔ بلیک کلیوں والی
فراک پر سلور کلر کا کام ساتھ چوڑی دار پاجاما، دونوں کو
ہی بہت سوٹ کر رہا تھا۔

”کیوں کیا دو لوگ ایک جیسے ڈریس نہیں پہن
سکتے۔“ صبا نے طنزیہ کہا پتا نہیں کب وہ وہاں آ کر
کھڑی ہو گئی تھی۔

”دونوں میں سے کوئی ایک ڈریس چینج کرے۔“
اشعر نے اس کی بات ان سنی کر دی۔

”نا بابا نا..... میرا تو یہ سب سے فیورٹ ڈریس ہے
جو خاص طور پر آج کے دن کے لئے بنوایا تھا۔“ ہانی
نے کندھے اچکا کر کہا۔ تو اشعر نے التجا بھری نظروں
سے صبا کو دیکھا۔

”میں ایک شرط پر چینج کروں گی اگر مجھے ابھی اس
سے بھی اچھا نیو ڈریس لا کر دیا جائے تو.....“ اشعر تو

اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

”ارے تم دونوں تو کیا انہوں نے تو آج میرے
بیٹے کو ہی کنفیوژ کر دیا تھا۔“ کنول بھا بھی ہادی کو چائے
پکڑاتی ہوئی بولیں۔

”وہ کپڑے اٹھا کر ہانی کے کمرے میں اس سے
تیار ہونے کے لئے گیا، وہاں ان دونوں کو دیکھ کر وہ
سکتہ زدہ سا ہو گیا تھا۔ اسے ان دونوں میں سے اپنی ہانی
پھپھو کو ڈھونڈنا مشکل ہو گیا تھا۔“

”اس وقت تو ہنی کا چہرہ دیکھنے والا تھا۔“ صبا بے
اختیار ہنس دی اشعر اس کی ہنسی میں کہیں کھوسا گیا۔
”یار! اس کا ایک ہی حل ہے ان دونوں کو بٹھا کر غور
سے دیکھیں ان میں کیا ڈفرنس ہے۔“ شعیب ہنی کو
اٹھائے لاؤنج میں آیا۔

”غور کیا کرنا ہے صاف ظاہر ہے ہانی کے بال
بڑے ہیں اور صبا کے چھوٹے.....“ عائزہ نے بتایا۔

”سب سے بڑا ڈفرنس ذہانت کا ہے۔ صبا صاحبہ
MCS کے فائل ایئر میں ہیں اور جبکہ ہانی صاحبہ مر
مر کرا بھی انٹرنک پینچی ہیں۔“ شاذل نے میٹھیوں سے
اترتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ وہ ہانی کو تنگ کرنے کا موقع
ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

”یہ تم نے ڈفرنس بتایا ہے یا میری خامی بتائی ہے۔“
ہانی نے دانت کچکچائے، سب ہی ہنسنے لگے۔

☆.....

آغا پلیس آج معمول سے زیادہ خوبصورت لگ رہا
تھا۔ برقی قتموں سے لان جگمگا رہا تھا، جہاں صبح کا
گمان ہو رہا تھا۔ مہندی کا فنکشن لان میں ہی ارتج کیا
گیا تھا۔ ایچ پر دوپٹل ہادی اور عائشہ و احمر اور لائے بیٹھے
تھے۔ صبا کو نے میں لگی چیئر پر بیٹھے انہیں بڑی محویت
سے دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنا بھائی ہی سب سے زیادہ
پیارا لگ رہا تھا، جو عائشہ کی کسی بات پر مسکرا رہا تھا، صبا
دل ہی دل میں اس کی بلائیں لے رہی تھی۔

”ارے تمہارے بھائی کی شادی ہے اور تم خاموشی

”تو کوئی بات نہیں میں اٹھا کے لے جاتا ہوں، نو ٹینشن۔“ اس نے بڑے مزے سے کہا تو صبا سے گھورنے لگی۔

”کیا لگتی ہے تمہاری؟“ پاس ہی بیٹھی عورت نے اشعر سے پوچھا۔ اشعر گڑبڑا گیا اسے تو قہقہے نہیں تھی کہ کوئی ان کی طرف بھی توجہ دے رہا ہے۔

”لگتی تو بہت کچھ ہے لیکن شارٹ کٹ..... یہ میری منگیتر ہے۔“ اشعر نے بڑے کونفیڈینس کے ساتھ صبا کو دیکھتے کہا، جس کے ماتھے پر بہت سی سلوٹیس پڑ گئیں تھیں۔

”او..... پھر تو اس کا حق بنتا ہے، جاؤ بیٹا اس کے ساتھ۔“ عورت نے مسکرا کر کہا۔ صبا ایک جھٹکے سے اٹھی بجائے اسٹیج پر جانے کے وہ گھر کے اندر چلی گئی۔

”ہیں..... ابھی تو کہہ رہی تھی مجھ سے ایک اسٹیپ بھی چلا نہیں جا رہا اور اب کیسے چلا جا رہا ہے۔“ وہ جو بھاگتے ہوئے اندر آئی تھی وہ بھی اس کے پیچھے ہی آ گیا۔ وہ لاؤنج میں ادھر سے ادھر چکر کاٹی اندر ہی اندر بیچ و تاب کھا رہی تھی۔

”کیا ہوا یہاں کیوں آ گئی ہو؟“

”کیا ضرورت تھی بکو اس کرنے کی۔“

”کیوں جھوٹ بولا آئی سے کہ میں تمہاری منگیتر ہوں۔“ اس نے چیختے ہوئے پوچھا۔

”تو اس میں اتنا غصہ ہونے والی کی بات ہے۔“ بڑے آرام سے بتایا۔

”تمہارے نزدیک یہ کوئی بات ہی نہیں ہے۔“

”میں نے کون سا بیوی بتا دیا ہے منگیتر ہی بتایا ہے۔“ وہ اس کی حالت سے محظوظ ہو رہا تھا۔

”مجھے اس طرح کے بیہودہ مذاق بالکل پسند نہیں ہیں۔“ کہتے ساتھ ہی رخ مڑ لیا۔

”جھوٹ کو ابھی سچ کر دیتے ہیں۔“ اس نے دل ہی دل میں کہا اپنے ہاتھ کی انگلی سے چھلانگ اتار کر اس

سے یہاں بیٹھی ہو۔“ اشعر پاس آ کر زور زور سے بولا تو وہ ڈر ہی گئی۔

”تو مجھے کیا کرنا چاہئے۔“ اس نے غصے سے کہا۔

”ڈانس..... وہ بھی میرے ساتھ۔“ دوسرا فقرہ اس نے منہ میں ہی کہا۔

”ڈانس.....“

”ہاں ڈانس، تمہارے اس طرح بیٹھنے سے لوگ سمجھیں گے کہ شاید تمہیں بھیا کی شادی کی خوشی نہیں ہے۔“

”لیکن مجھے تو ڈانس نہیں آتا.....“

”چلو میں سکھاتا ہوں۔“ وہ اس کی سنے بغیر اسے بازو سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے اسٹیج تک لایا، جہاں پہلے ہی دو تین کپل ڈانس کر رہے تھے۔ فاسٹ میوزک اوپر سے اسپیکر، اس سچویشن میں تو خود بخود اڑ رہی اٹھتی ہے۔ اور صبا جو پہلے ہی ہلا گلا موج مستی بہت پسند کرتی تھی، سوا ب وہ شروع ہو چکی تھی۔ چھوٹے تو چھوٹے اس وقت بڑے بھی کافی انجوائے کر رہے تھے۔

”اچھا خاصا ڈانس کر لیتی ہو۔ ایویں نخرے دکھا رہی تھیں مجھے۔“ اسٹیج سے اترتے ہوئے اشعر نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ اب وہ اسے کیا بتانی۔ وہ تو خود حیران تھی۔

”ارے تم کہاں جا رہی ہو آؤ میرے ساتھ ڈانس کرو۔“ عائرہ نے جھنجھلا کر کہا۔ صبا ہنس دی۔

”سوری آپنی! مجھ تو اب کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا۔“ کہتے ساتھ ہی وہ آگے بڑھ گئی۔

”ارے تم پھر یہاں آ کر بیٹھ گئیں، چلو کچھ فوٹو سیشن ہو جائے۔“ کچھ منٹ کے بعد وہ پھر اس کے سر پر کھڑا تھا۔

”سوری میں نہیں جاسکتی۔“

”کیوں.....؟“

”مجھ سے ایک اسٹیپ بھی چلا نہیں جا رہا۔“ اس نے ہائی ہیل والی سینڈل کی طرف اشارہ کیا۔

”سوری میں نہیں جاسکتی۔“

”کیوں.....؟“

”مجھ سے ایک اسٹیپ بھی چلا نہیں جا رہا۔“ اس نے ہائی ہیل والی سینڈل کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں اشعر! ایسی بات نہیں ہے مگر.....“
 ”بس..... اس سے آگے ایک لفظ نہیں۔“ اشعر
 نے سکون کا سانس لیا۔

”تمہیں میری محبت ایکسپٹ کرنی پڑے گی۔“
 ”زبردستی ہے کیا؟“

”زبردستی ہی سمجھ لو۔“ اس نے بند مٹھی میں وہی
 رنگ نکال کر دوبارہ اسے پہنادی۔

”فی الحال اس سے گزلیہ کرو، پرسوں بھیا کے
 ویسے کے ساتھ ہی باقاعدہ آپجمنٹ کرواؤں گا۔“ صبا
 نے سر اٹھا کر عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔
 ”یار سر پرانز دینا تھا تمہیں۔“ اس نے ڈرنے کی
 ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

”کیا اب کچا چباؤ گی مجھے۔“ اس نے کہا ہی اس
 انداز سے کہ صبا بے اختیار ہنس دی۔

”چلو یار ان لمحوں کو یادگار بنالیں۔“ وہ اسے ساتھ
 لئے اسٹیج کی طرف آ گیا۔ جہاں شاذل اور ہانی
 بڑے اسٹیلش انداز میں اسٹیپ بنوارے تھے، پرسوں
 ان کی بھی آپجمنٹ تھی۔

”چلو پیچھے ہٹو کسی اور کو بھی موقع دو۔“ اشعر نے
 شاذل کو پکڑ کر سائیڈ پر کر دیا۔

”تم کیوں جیلنس ہو رہے ہو تمہارا کسی نے ساتھ
 نہیں دیا تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔“

وہ ان سنی کرتا ہادی اور احمد دونوں کیلئے جا کر
 کھڑا ہو گیا۔ صبا کو بھی اس نے ساتھ ساتھ ہی گھیٹا
 تھا۔ جو کسی روبوٹ کی طرح اس کے اشاروں پر چل
 رہی تھی۔

اسٹیپ بنواتے ہوئے اشعر نے اس کا ہاتھ پکڑا۔
 صبا نے ہاتھ چھڑوا کر اسٹیلش انداز میں اس کا بازو
 پکڑتے ہوئے جو ایک انچ کا فاصلہ تھا وہ بھی ختم کر دیا۔
 وہاں کھڑے سب لوگوں نے ہونٹک شروع
 کر دی۔ اشعر اس انداز اقرار پر مسکرائے بتانہ رہ سکا۔

☆.....

کے سامنے آ گیا۔
 ”منگیتر بنانا کون سا مشکل کام ہے۔“ اس نے اس
 کا ہاتھ پکڑا اور جلدی سے رنگ پہنادی۔

”لیکن مجھے تمہاری منگیتر نہیں بننا۔ وہ غصے سے
 رنگ اتارنے لگی تھی کہ اشعر نے اسے روک دیا۔

”ارے نہیں تمہیں پتا ہے اس طرح رنگ اتارنے
 سے بدشگونی ہوتی ہے۔“

”بھاڑ میں گئی تمہاری بدشگونی۔“ وہ اتار کر پھینکنے ہی
 لگی تھی کہ اشعر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی انگلیوں
 میں پکڑی رنگ پکڑ کر اس کے ہاتھ میں رکھ کر مٹھی
 دبا دی۔

”تم یہ رنگ نہیں بلکہ میرے سینے میں اپنے نام کی
 مالا چھپتا دل پھینکو گی۔“ اس نے اس کی آنکھوں میں
 دیکھتے ہوئے کہا۔ تو وہ سکتے زدہ سی رہ گئی۔

”ہاں صبا! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تمہیں
 کبھی بھی کسی بھی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا۔ یہاں آنے
 سے قبل پورا ایک ہفتہ کس اذیت میں گزارا ہے میں
 نے، شاید ہی تم کبھی جان سکو۔“ صبا زیادہ دیر اس کی
 آنکھوں میں نہیں دیکھ سکی تھی۔

تیری ہر ادا محبت سی لگتی ہے
 ایک پل کی جدائی صدی سے لگتی ہے
 وہ رخ موڑ گئی، دل میں ایک تدا تم برپا ہو چکا تھا۔

”صبا.....“ اس نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اپنی
 طرف کیا۔

”کیا میں تمہیں پسند نہیں ہوں؟“ وہ خاموش سر
 جھکائے کھڑی رہی۔

”کیا تم کسی اور کو پسند کرتی ہو؟“
 ”صبا پلیز.....“ اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کا
 چہرہ پکڑ کر اپنی طرف کیا۔

”مجھے بتاؤ..... پھر میں کبھی اس بارے میں تم سے
 بات نہیں کروں گا۔“ اشعر صبح معنوں میں پریشان ہو گیا

READING
 Section

تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں شامل ہونا اپنا فرض سمجھتا تھا، وہ اب وقت کی رنگینیوں میں کھو گیا تھا۔ مگر وہ آج بھی اس کی منتظر تھی۔ آج بھی ہر آہٹ پر چونک جاتی تھی۔ دن میں کئی بار اپنا فون چیک کرتی موبائل کی بجتی بپ پر اسے خیال آتا مگر یہ اس کی بھول تھی۔

وقت تیزی سے دوڑ رہا تھا اور وہ آج بھی وہیں کھڑی تھی۔ گریجویٹیشن کے بعد تعلیم بھی ادھوری چھوڑ دی۔ روحان کی یادیں اور ماں بابا سے پچھڑنے کا غم اسے بری طرح گھائل کر رہا تھا۔ دنیا کی بھیڑ میں وہ بالکل تنہا تھی۔ بڑے بھیا تائبش نے بھی اسے بے رحم وقت کے ہاتھوں میں سوپ دیا تھا اور خود اپنی زندگی

دسمبر کی سرد راتیں اس کی پسندیدہ ہوتی تھیں مگر اب یہ راتیں اس کا درد مزید بڑھا دیتی تھیں۔ سچ بستہ ٹھہرتی راتوں کی طوالت اس کی زندگی کو بری طرح بے قرار کر دیتی تھی۔

ماں بابا کو گزرے سالوں بیت گئے تھے۔ بھیا اپنی زندگی میں اتنے مصروف ہو گئے تھے کہ اس کی زندگی میں کیا چل رہا ہے کس دیکھ میں جی رہی ہے وہ، انہیں پوچھنے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ بھیا کی زندگی کا محور تو بس دو افراد تھے۔ ایک ان کی وائف، روبینہ بھابی اور ان کا بیٹا کاشان۔ اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ اس کے بابا نے اس کے حصے کا اس کے لیے بہت کچھ چھوڑا تھا مگر اس پیسے سے وہ اپنی

دسمبر کا مہینہ

افسانہ

نوستین طاہر

میں مکن ہو گئے تھے۔ ایک گھر میں ہوتے ہوئے بھی ہفتوں ان کی ملاقات نہیں ہو پاتی تھی۔ سب کچھ کتنا بدل گیا تھا۔ وہ خود بھی بہت حیران تھی۔ اب موسموں کی خوب صورتی یا اس کے فیورٹ مہینے بھی اسے اٹریکٹ نہیں کرتے تھے۔ جب ماں بابا حیات تھے تو وہ ہر چھوٹی سی چھوٹی خوشی بھی انجوائے کرتی تھی اور دسمبر کا مہینہ تو اس کا فیورٹ ہوا کرتا تھا۔ ویسے تو اس کی ہر سردی ہی بہت دلچسپ گزرا کرتی تھی مگر دسمبر کے مہینے کی بات ہی الگ تھی۔ دسمبر کے مہینے کو وہ اتنا انجوائے کرتی جیسے ہر روز کوئی تہوار ہو، سردیوں کی شاپنگ دسمبر میں کرتی۔ دسمبر کی دو پہریں دوستوں کے ساتھ گزارتی اور راتوں کو ماں بابا سے پرانے قصے سنتی، رات ہوتے ہی کیمبل میں دبک جاتی۔ اماں

خوشیاں نہیں خرید سکتی تھی۔ وقت بہت بے رحم ہو گیا تھا اور اس بے رحم وقت کی سختیاں جھیلنے کے لیے وہ تنہا رہ گئی تھی۔ اس کے دکھوں کا مداوا کرنے والا روحان، اس کا فیانس بھی وقت کی دوڑ میں شامل ہو گیا تھا۔ ماں بابا نے اپنی زندگی میں ہی اسے روحان سے منسوب کر دیا تھا۔ وہ روحان کی محبت میں پور پور ڈوبی ہوئی تھی مگر روحان کو تو شاید اس کی محبت کی پروا ہی نہیں تھی۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن چلا گیا۔ جاتے ہوئے اس نے جلد لوٹنے کے وعدے کے ساتھ اور بھی بہت سے وعدے کیے مگر وہ ایک بھی وعدہ نبھانے کے لیے واپس نہیں لوٹا۔ نہ جانے اس کا اقرار محبت اور کیے گئے وعدے کہاں فراموش ہو گئے تھے۔ وہ جو ہر روز اسے کال کرتا



میرزا

ADINA
Secret



اس کے لیے بھاپ اڑاتی گرما گرم چائے لے کے آتیں اور اماں کے ہاتھ کا گاجر کا حلوہ تو اس کا فیورٹ تھا۔ وہ دسمبر کی راتوں میں دیر تک میوزک سنتی، ڈرائی فروٹ کھاتی اور صبح اماں کے بارہا اٹھانے پر بھی جلدی نہ اٹھتی اور کہتی اماں اتنے مزے کی نیند آرہی ہے سونے دونا، مگر اب تو گئے دنوں کی یادیں ایک قصہ ہو گئی تھیں۔ وہ جو صبح دن چڑھے تک سونے کی عادی تھی اب نیند سے کوسوں دور ہو گئی تھی وہ جو ہر وقت بول بول کر پورا گھر سر پر اٹھائے رکھتی تھی۔ اب اس سے باتیں کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اب وہ اپنی باتیں کسی کو سناتی نہیں تھی اپنا درد لکھتی تھی۔ اپنی سیاہ ڈائری پر۔ نہ جانے کتنی ڈائریاں اس کے لفظوں سے بھر گئی تھیں۔ آج بھی اس کا قلم اس کی ڈائری کے ورق سیاہ کر رہا تھا۔ وہ اپنے دل کی باتیں اس سیاہ ڈائری پر اتار رہی تھی۔

”اماں بابا! اب میں دسمبر کی راتوں میں میوزک نہیں سنتی، سچ کافی کے گھونٹ بھرتے ہوئے یہ ڈائری لکھتی ہوں۔ اب نرم و گرم بستر میں لیٹ کر آرام بہت کم کرتی ہوں۔ کھڑکی میں کھڑے ہو کر تنہا چاند کو تکتے ہوئے موسم کی سختیوں کو جھیلتی ہوں۔ کیونکہ اب میرے پاس نا آپ دونوں ہیں اور نہ روحان، وہ بھی مجھے چھوڑ کر اپنی زندگی میں مصروف ہو گیا ہے۔“ وہ ماں بابا سے ہمیشہ کہا کرتی تھی۔

”بابا مجھے شاعر اور لکھاری حضرات پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ دسمبر کو درد اور اداسی کا مہینہ کہتے ہیں۔ نہ جانے ان کے قلم میں اس ماہ میں درد کہاں سے آجاتا ہے جو دسمبر پر صبحے سیاہ کر دیتے ہیں۔“ اماں، بابا اس کی بات سن کر مسکرا دیتے اور اماں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہوئے کہتیں۔ ”خدا میری تعبیر کو کبھی درد سے آشنا نہ کرے۔“ اور تعبیر مسکرا دیتی۔

☆.....☆

دروازے پر ہلکی سی دستک کے بعد تابش اندر

آ گیا۔
”تعبیر! تمہیں پتا ہے نا ہمارے گھر ہر بار نیو ایئر پارٹی منائی جاتی ہے۔ تم پھر بھی تیار نہیں ہو میں نیو ایئر کا ایک کاٹنا ہے سب گیسٹ آگئے ہیں 12 بجنے والے ہیں تم بھی تیار ہو کر باہر آ جاؤ۔“ تابش کی بات سن کر تعبیر نے اپنا پین ڈائری میں رکھا اور ڈائری بند کرتے ہوئے بولی۔

”بھیا! آپ شاید بھول رہے ہیں، آپ ہر سال مجھے بلانے آتے ہیں مگر میں اس پارٹی میں شامل نہیں ہوتی۔ آپ پھر بھی مجھے بلانے آگئے۔ پچھلے پانچ سالوں سے میری زندگی میں کوئی نیو ایئر نہیں آیا پھر کیسے کاٹوں نیو ایئر کا ایک، کیوں مناؤں نیو ایئر کا جشن۔“

دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر گالوں پر آنا چاہتے تھے مگر تعبیر نے اپنی ہتھیلیوں سے آنکھیں منسل ڈالیں اور اپنے تابش بھیا کی طرف دیکھ کر سچی سے مسکرائی۔

”تعبیر! کیا مل رہا ہے، تمہیں یوں گھٹ گھٹ کر جینے سے اس سب کی ذمہ دار تم خود ہو، کیوں اس انسان کے نام پر زندگی ضائع کر رہی ہو، جو تمہیں تنہا چھوڑ گیا وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا اور آج بھی کہہ رہا ہوں۔ مگر تمہیں شاید مجھ سے زیادہ اس شخص پر بھروسہ ہے۔“ تابش اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ آج اسے اپنی معصوم سی بہن پر بے تحاشا پیار اور ترس آیا تھا۔ اس نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا اور دھیرے دھیرے سمجھانے لگا۔

”تعبیر! اماں بابا کے غم سے باہر آ جاؤ، بالکل اسی طرح جیسے میں آ گیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم ماں بابا کو بھول جاؤ، تم ان کو اپنی اچھی یادوں میں محفوظ رکھو، ہاں مگر روحان کو بھول جاؤ۔ وہ لوٹ کر نہیں آنے والا۔ اگر اس نے آنا ہوتا تو کب کا آ گیا ہوتا، تم سے

کوئی رابطہ تو رکھا ہوتا اس نے تمہارا انتظار بے معنی ہے۔ میری گڑیا! جب تک تم اپنی زندگی میں صبح نہیں لاؤ گی تب تک یہ اندھیرا تمہیں چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ کب تک خوشیوں کے لیے دروازہ بند رکھو گی اور یوں بھاگتی رہو گی۔ پلیز اب اینڈ کر دو اس دسمبر میں اپنے درد کا اختتام کر دو۔“

تابش کی بات سن کر وہ اس کے کاندھے سے لگ کر بری طرح رو دی۔ برسوں جو آنسو اس نے چھپ چھپ کر بہائے تھے۔ آج کسی اپنے کے سامنے بہہ نکلے تھے اور تابش کے کاندھے میں جذب ہو رہے تھے۔ کتنے عرصے کے بعد آج اسے بھیا میں بابا کی صورت نظر آرہی تھی۔ وہ اپنے سارے دکھ آنسوؤں کے ذریعے بہا دینا چاہتی تھی۔ تابش اسے یوں روتے دیکھ کر سوچ رہا تھا۔

”تمہارا قصور وار تو میں بھی ہوں، میں نے بھی تو تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ خود سے لڑنے کے لیے۔“ اماں بابا کے بعد روحان بھی اسے چھوڑ گیا۔ بے درے ملنے والا ہر صدمہ اسے توڑتا رہا اور اسے سنبھالنے کے لیے کوئی اپنا بھی تو ہوتا اور میں اپنا ہو کر بھی پر اپنا بنا رہا۔ تعبیر کی تنہائی کا ذمہ دار میں بھی ہوں۔“ تابش نے اپنی آنکھوں میں آنی نمی صاف کی اور پھر اس کا ماتھا چومنے کے بعد اس سے مخاطب ہوا۔

”تعبیر! میری بہن کیپٹن اسفند کا ہاتھ تھام لو، وہ آج بھی تمہارا منتظر ہے تمہارے منع کرنے کے باوجود اس نے ہار نہیں مانی، وہ ناامید نہیں ہوا وہ بڑے پر یقین لہجے میں کہتا ہے۔ مجھے خدا پر بھروسا ہے کہ ایک دن تعبیر ضرور مان جائے گی۔ وہ تم سے سچی محبت کرتا ہے۔ تعبیر اس کی محبت کو یقین کی انگلی تھما دو۔ مجھ پر بھروسہ رکھو وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔ تعبیر اگر ایک سچ یہ ہے کہ تم نے روحان سے محبت کی ہے تو ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ اسفند تمہیں

دل و جان سے چاہتا ہے، روحان نے تمہاری محبت کی قدر نہیں کی تو کیا تم لمبھی ایسا ہی کرو گی اسفند کی محبت کو ٹھکرا دو گی۔ تعبیر کسی کو چاہنے سے زیادہ اس بات کا احساس زیادہ حسین ہے کہ کوئی تمہیں چاہتا ہے بس تم اسفند کی چاہت کو خود سے دور مت کرنا۔ باہر آ جاؤ تیار ہو کر۔ میں انتظار کر رہا ہوں اسفند بھی آیا ہے پارٹی میں اگر تم باہر آ گئیں تو میں آج ہی تمہاری اور اسفند کی شادی کے لیے ہاں کر دوں گا، مجھے یقین ہے تم میرے فیصلے کا مان رکھو گی اور باہر ضرور آؤ گی۔“ یہ کہہ کر تابش کمرے سے باہر نکل گیا۔

تعبیر نے اپنی ڈائری پھر سے اٹھائی۔ جو مکمل ہو گئی تھی مگر اس کا آخری صفحہ باقی تھا۔ اور آخری صفحے پر اختتام کرنے کے لیے تعبیر کا قلم تیزی سے چلنے لگا۔ اس پار ڈائری پر لفظوں کو بکھیرتے ہوئے وہ رو نہیں رہی تھی۔ بلکہ دھیرے دھیرے مسکرا رہی تھی۔

ڈائری کو بند کر کے تعبیر نے لا کر میں رکھ دیا۔ 12 بجنے میں صرف 15 منٹ باقی تھے وہ جلدی جلدی تیار ہونے لگی آج بہت دنوں کے بعد وہ دل سے تیار ہوئی اس حسین شخص کے لیے جس کا دل بھی بہت خوب صورت تھا۔ جو برسوں سے اسے دل میں بسائے اس کا منتظر تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ دسمبر کی اس آخری رات کو اپنے دکھوں کا اختتام کرنے کا، تعبیر کی نظر بے اختیار آسمان پر چمکتے چاند پر جا ٹکی جو آج معمول سے زیادہ چمکتا نظر آ رہا تھا۔ اسے یوں لگا کہ وہ بھی مسکراتے ہوئے کہہ رہا ہے۔

”اب تمہیں بھی تمہارا چاند مل گیا۔ اب مجھے یوں تنہا مت تکتا۔“ اور وہ مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر آ گئی۔ نئی صبح نئے سال کا استقبال کرنے۔

☆.....

ماریہ یاسر

افسانہ

دوسری گئی رات

”اف یار! سرٹوبان کی کیا پریشانی ہے۔ کیا اسٹائل
پے میں تو لٹو ہو گئی ہوں سر پر۔“ انگلش کی کلاس لے کر
باہر نکلتے ہوئے وفانے اپنا مخصوص فقرہ دہرایا تو گویا
درشاداب کو تو آگ ہی لگ گئی۔



READING
Section

گھر میں آرام فرمانے کے لیے چھوڑ آؤ۔ بے عزتی تو تمہاری بنتی تھی سر سے۔ تمہیں پتا بھی ہے کہ سر پڑھائی کے معاملے میں کوئی کمپرماز نہیں کرتے ہیں اور خبردار جو تم نے سر کو کھڑوس بولا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا سمجھیں شادا ابو۔“ وفانے اسے دھمکانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے آخر میں چھیڑا اور وہ چھڑ بھی گئی۔

”تمہیں میں نے کتنی بار بولا ہے کہ مجھے شادا ابو مت بولا کرو۔ لیکن اتنی ڈھیٹ ہو تم کہ حد نہیں۔ شادا بوسن کر ایسا لگتا ہے جیسے کسی مالی کو بلارہی ہو۔“

”وفا کی بچی تمہیں کچا چبالوں گی میں اگر دوبارہ تمہارے منہ سے میں نے یہ جملہ سنا تو ارے خدا کی بندی پورے دو مہینے سے میں تمہاری یہ بکو اس سنتی آرہی ہوں مسلسل۔ میں سرٹوبان ہوں کیا جو روز مجھے انفارم کرتی ہو۔ اگر اتنی ہی محبت ہے اس کھڑوس سے تو اس کو جا کے بتاؤ ناں۔ پر میرا دماغ مت چاٹنا کرو۔“ وہ جو سرٹوبان سے کلاس میں اپنی بے عزتی سن چکی تھی دانت چبا کر بولی۔

”شادا ابو! انگارے کیوں چبارہی ہو۔ تمہیں کس نے مشہورہ دیا تھا کہ سرٹوبان کی دی ہوئی اسائنمنٹ



READING
Section

شاداب نے اسے گھورا۔

”اچھا نام کو گولی مار اور میری بات غور سے سنو۔“
وقانے سرگوشی نما آواز نکالی۔

”ارے گولی کیوں مارو میرے نام کو۔ گولی ہی مارتی ہے تو اپنے یا پھر سرٹوبان کے نام کو مارو۔ ایویں خواجواہ میرے اتنے پیارے نام کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔“ شاداب نے اسے دھمکایا۔

”اچھا میری ماں نہیں مارو گولی لیکن میری بات تو سن لو۔“ اس نے اپنا منہ اس کے کان میں گھسایا۔
”اوائے وفا! میرا کان مت کھا جانا تمہارا کوئی بھروسہ بھی نہیں ہے۔ تم اپنا منہ دور کر کے بات کرو میں سن رہی ہوں۔“ شاداب نے اسے پرے ہٹایا۔

”تو یہ شاداب! تم اپنی بک بک کب بند کرو گی اور جہاں تک کھانے کی بات ہے تو یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ تو تمہاری ہابی ہے کھانا اور کھاتے ہی چلے جانا، اپنا پیٹ دیکھو بلکہ پیٹ نہیں بیٹی (بکسہ) جس میں لوگ کپڑے رکھتے ہیں۔“ اس نے شاداب کے موٹاپے پر طنز کیا۔

”ٹھیک ہے پھر جاؤ کوئی پتلی اپنے جیسی لڑکی ڈھونڈ کے اسے اپنے اقوال زریں سنا دو جو تم مجھے سنانے لگی تھیں۔“ وہ اب تپ ہی گئی اور بیگ اٹھا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے شاداب! کہاں جا رہی ہو میں تو مذاق کر رہی تھی۔ میری پیاری اور اتنی پتلی دوست، میری بات تو سن لو یار۔“ اس نے دوست کو جاتے دیکھا تو منانے کو لپکی۔

”میری اچھی بہن معاف کر دو ناں آئندہ ایسا نہیں بولوں گی۔ وعدہ۔ پلیز بیٹھو ناں، میری بات سن لو نہیں تو سرعابد کا پیرید اشارٹ ہو جائے بہت ضروری بات ہے۔“ اس نے اس کے گلے میں بازو ڈالے منانے کے انداز میں کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے بازو تو ہٹاؤ اتنے زور سے دبار ہی

ہوگلا کیا جان لوگی پچی کی۔“ اس نے ہنسی دباتے کہا۔

”اچھا شاداب! میں کہہ رہی تھی کہ میں سوچ رہی ہوں کہ میں آج 6 پیرید میں جا کے سر کو اپنے دل کا حال بتا دوں، کیا خیال ہے تمہارا؟“ اس نے پرسوج انداز میں شاداب کی طرف دیکھا۔

”دیکھ لو یار! لیکن ایسا نہ ہو کہ سر ناراض ہو کر تمہاری شکایت پر نپل کونہ کر دیں۔“ اس نے ڈراتے ہوئے کہا۔

”یار! اب اتنا رسک تو لینا پڑے گا لیکن اب میں سر سے بات کروں گی ضرور، اچھا ایسا کرو کہ تم میرا بیگ بھی لے جاؤ کلاس میں، میں تھوڑی دیر میں سر سے بات کر کے آتی ہوں۔ سر اس پیرید میں اسٹاف روم میں فری ہوتے ہیں۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

☆.....☆

”سرے آئی کم ان؟“ سارے اسٹاف روم میں نظر دوڑا کے کہ وہ خالی ہے اجازت طلب کی۔

”یس کم ان!“ سرٹوبان نے نوٹس پکڑے کہا۔
”سر! مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ اس نے انگلیاں مروڑتے ہوئے کہا۔

”جی ضرور مس وفا! لیکن پہلے میری بات سن لیں۔“ انہوں نے نوٹس رکھ کر اس کی طرف دھیان سے دیکھا۔

”میں نوٹ کر رہا ہوں کہ آج کل آپ کا دھیان پڑھائی کی طرف نہیں ہے۔ آپ آج بھی کلاس میں اپنی اس فرینڈ کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھیں میں ساری کلاس کے سامنے آپ کو ڈانٹنا نہیں چاہتا تھا لیکن اپنا فوکس پڑھائی کی طرف کریں۔ پلیز آپ پوزیشن ہولڈر اسٹوڈنٹ ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کے Non serious بی ہویر کی وجہ سے آپ کی پڑھائی متاثر ہو۔“ انہوں نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو وفا کو سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیا کہے۔

”اچھا آپ بولے کیا کہنے آئی ہیں۔“ انہوں نے

پوچھا۔

زبردست سی گھوری سے نوازا گیا۔ جس کی اس نے پروا نہیں کی۔

”سیدی طرح بتاؤ کہ ہوا کیا ہے؟“ اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

”کچھ نہیں یار! میری ہمت ہی نہیں ہوئی سر سے بات کرنے کی عجیب سی Feeling ہو رہی تھی اس وقت۔“ اس نے اپنے دل کی کیفیت بتائی۔

”یار قسم سے عجیب ہو تم بھی ویسے تو بڑی ٹام کروڑ بنتی پھرتی ہو سر سے ایک بات نہیں کر سکیں۔“ اس نے چاٹ کا آخری چمچ منہ میں ڈالا جس پر وفانے منہ بنایا۔

”یار شاداب! کم ٹھونسا کرو کتنی بار بولا ہے اپنا ویٹ کم کرو، مجھے تو تمہارے ہونے والے شوہر پر ترس آتا ہے جب اس کو تمہارے ہاتھ سے مکے اور گھونے کھانے پڑیں گے اور تب تمہیں بھی میری قدر آئے گی۔ اتنا کھاتی ہو پھر بولتی ہو کہ میرا پیٹ بڑھ گیا ہے کبھی کہتی ہو میرا منہ بڑھ گیا ہے پیٹ نہیں بڑھے گا تو کیا سر ٹوبان کی Pay بڑھے گی۔“ اس نے شاداب کو چڑایا۔

”وقا کی پنچی تم میرے ہاتھ سے پٹو گی اگر تمہارے منہ سے کھانے کے بارے میں، میں نے کچھ بھی الٹا سیدھا سنا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ اس نے کہتے کے ساتھ دھمو کا بھی جڑ دیا۔

☆.....☆

دروازے کی بیل پر وہ جوا بھی کالج سے آ کر لیٹے ہی تھے کہ اٹھ کر کھولنے گئے۔ دروازہ کھولا تو سامنے بلیو ٹراؤزر اور بلیک لانگ شرٹ دوپٹہ گلے میں ڈالے کھڑی وقا پر نظر پڑی تو حیران ہو گئے۔

”آپ..... وقا اس وقت میرے گھر..... خیریت تو ہے نا! اپنی پرابلم؟“ انہوں نے گلاسز سر پر نکاتے حیرانگی سے کہا۔

”جی سر! وہ میں نے آپ سے ایک بہت ضروری

”وہ سر! میں یہ کہنے آئی تھی کہ سر میں..... وہ سر..... آپ سے..... میرا مطلب ہے میں نہیں آپ نے نہیں، نہیں میں آپ سے یہ کہنے آئی ہوں۔“ وہ بوکھلائے بوکھلائے اپنی انگلیاں مروڑتی رہی۔

”کیا بات ہے مس وفا اپنی پرابلم؟“ انہوں نے گھورتے ہوئے کہا۔

”نوسر نو پرابلم میں کل آ کے آپ کو بتا دوں گی۔ اتنی خاص بات بھی نہیں ہے۔“ اس نے ہمت ہارتے کہا۔

”اچھا کل میں کلاس لینے آؤں گا تب بات کریں گے آپ کی طبیعت مجھے اتنی ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ سر ٹوبان نے کہا۔

”نہیں سر! میں ساری کلاس کے سامنے اپنی بے عزتی نہیں کر سکتی میں کل اکیلے میں ہی آپ سے بات کروں گی۔“ اس نے منہ میں بڑبڑاتے کہا۔

”کیا کہا آپ نے؟“ ٹوبان کو اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا۔

”کچھ نہیں سر!“ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکلتی چلی گئی اور پیچھے سر ٹوبان حیرت سے اس کو دیکھتے رہ گئے۔ سر عابد کی بغیر حاضری کی وجہ سے ساری کلاس ادھر ادھر گھوم کر فری پیریڈا نجوائے کر رہی تھی۔

”شاداب کینٹین میں بیٹھی سموسے، چاٹ اور کولڈ ڈرنک سے انصاف کرنے میں لگی تھی کہ وقا پھولی سانس کے ساتھ کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھی۔

”تمہیں کیا ہوا ہے سانس کیوں پھولی ہوئی ہے تمہاری۔ کشمیر فتح کر کے آرہی ہو۔“ شاداب نے کولڈرنک منہ سے لگائی۔

”نہیں یار، فتح کرتے کرتے رہ گئی ہوں آج اور یہ کولڈرنک تو مجھے پکڑاؤ ذرا۔“ اس نے شاداب کے ہاتھ سے کولڈرنک اپنے قبضے میں کر لی جس پر ایک

بات کرنی ہے۔“ اس نے آنے کا مقصد بیان کیا۔
 ”جی بولیں! آپ صبح بھی کچھ کہنے آئی تھیں آخر
 بات کیا ہے؟“ انہوں نے اس پر نظریں جمائے
 پوچھا۔

اونچی پونی ٹیل پریشان چہرہ، اونچی نازک سی وفا
 انہیں ہمیشہ سے دل سے قریب ہی لگی لیکن آج تو اس
 کا انداز ہی نرالا لگ رہا تھا۔ ٹوبان کا دل عجیب انداز
 میں دھڑکا، دل کی دھڑکن عجیب سی بے ضابطگی کا شکار
 تھی۔ فوراً نظریں ہٹا میں مبادا ان کی چوری پکڑی نہ
 جائے۔

”وہ سر میں کہہ رہی تھی کہ میں نہیں نہیں آپ
 افوہ..... میرا مطلب ہے وہ سر میں ناں..... وہ سر
 میرے سر میں چوٹ لگ گئی ہے۔ نہیں سر وہ میرا
 مطلب ہے میرے سر میں موج آگئی ہے۔ میں چلتی
 ہوں کل کالج میں بتاؤں گی۔“ اوٹ پٹانگ ہانکتے
 ہوئے اس نے تیزی سے کہا اور پاس ہی کھڑی اپنی
 گاڑی میں بیٹھی اور یہ جاوہ جا۔ پیچھے کھڑے ٹوبان یہ
 سوچ رہے تھے کہ سر میں موج کیسے آسکتی ہے۔ گھر
 پہنچ کر اس نے ساری بات شاداب کو فون پر بتائی اور
 اس سے خوب باتیں سنیں۔

☆.....☆

گاڑی سے اتر کر کالج میں قدم رکھے ہی تھے کہ
 سامنے سے آتے ٹوبان نے اشارے سے بلایا۔
 ”وفا! اسٹاف روم آئیے مجھے آپ سے ضروری
 بات کرنی ہے۔“

”یس سر کہہ کر ان کے پیچھے چلتی اسٹاف روم
 میں آگئی۔“

”جی سر!“ ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے وہ
 عجیب پریشانی میں گھری تھی۔ ٹوبان کو اس لمحے وہ اس
 قدر پیاری لگی کہ دل نے اس کے ساتھ کی دعا کی۔

”جی کل آپ نے کیا کہنا تھا بولیں۔“ نظروں کا
 زاویہ بدلتے پوچھا۔

”لیکن سیدھے طریقے سے اوٹ پٹانگ بولے
 بغیر سیدھی اور سچی بات کرئیے گا، اوکے۔“ انہوں نے
 تنبیہ کی۔

”جی سر! Last try! کر رہی ہوں اگر آج بھی
 نہ بول سکی تو گل میں آپ کو پیپر پر لکھ کر دوں گی۔“ اس
 نے معصومیت سے کہا۔

”وہ سر میں آپ سے پیار کرتی ہوں اور آپ سے
 شادی کرنا چاہتی ہوں۔“ دھڑکتے اور بے قابو دل
 سے کہتے ہوئے اس نے خوف سے آنکھیں بند
 کر لیں۔

”واٹ.....! کیا بول رہی ہیں آپ، ہوش میں تو
 ہیں ناں۔ آج تو یہ بات کر دی ہے آئندہ میں یہ بات
 آپ کے منہ سے نہ اپنے سامنے سنوں اور ناں کسی
 اور کے سامنے اوکے۔ آپ اپنی توجہ بڑھائی پر دیں
 ان سب باتوں میں وقت ضائع مت کریں۔ آپ
 کے قادر اس شہر کے بڑے بزنس مین ہیں، وہ یہ سنیں
 گے تو کیا سوچیں گے۔ اس لیے اس بات کو بھول
 جائیں۔“ ایک لمحے کے لیے ان کے دل نے وفا کو
 ہاں میں جواب دینے پر ضد کی لیکن انہوں نے دل کی
 آن سنی کرتے ہوئے دماغ سے کام لیا۔

”پر سر! اس میں برائی کیا ہے۔ میں نے شادی
 تو کرنی ہے ناں اور آپ نے مجھی تو سر مجھ سے
 شادی میں کیا برائی ہے۔“ اس نے ڈبڈبائی
 آنکھوں سے پوچھا۔

”وفا! میں نے آپ کو ایک بار کہہ دیا ناں، مجھے
 بات دہرانے کی عادت نہیں ہے۔ اب آپ جا سکتی
 ہیں۔“ انہوں نے سختی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
 وفا نے نم آنکھوں سے انہیں دیکھا اور دروازے سے
 نکل کر کالج سے باہر چلی گئی۔

4th پیریڈ اشارٹ ہوتے ہی ان کا دل تیز تیز
 دھڑک رہا تھا۔ میٹھیوں چڑھ کر اوپر والے Block
 میں 4th ایئر کی کلاس میں داخل ہوئے تو سارے

ہو۔ دفغان کرو۔ تمہارے لیے لڑکوں کی کمی ہے کیا۔“
اس نے خالص عورتوں کے انداز میں کہا۔

”تمہیں کیا پتا یار! یہ پیار کیا ہوتا ہے میں اس
کھڑوس کو نہیں چھوڑ سکتی۔ بہت پیار کرتی ہوں، دن
بدن میرا پیار بڑھتا جا رہا ہے ان کے بغیر میں مر
جاؤں گی کچھ کرو یار، انہیں سمجھاؤ پلیز میری مدد کرو۔“
اس نے نم لہجے میں شاداب کے ہاتھ تھامتے کہا۔
”اچھا تم رونا مت، میں کچھ کرتی ہوں۔“ اس
نے کچھ سوچتے ہوئے وفا کو تسلی دی۔

☆.....☆

”سر! میں آپ کے بغیر مر جاؤں گی پلیز سر! آپ
مجھے Ignore مت کریں۔“ کالج میں سر کے اجنبی
رویے پر پریشان وفانے سر سے بات کرنے کا
سوچا۔

”پلیز مس دفغا! آہستہ بولیں کوئی سن لے گا۔“
انہوں نے اسے خاموش کرایا۔

”سر! جس نے سنا ہے سن لے مجھے کسی کی کوئی
پرواہ نہیں ہے۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں ناں پلیز
سر۔“ اس نے التجا کی۔

”میں نے کہا ناں مس دفغا، میں آپ سے شادی
نہیں کر سکتا اور اب مجھے آپ دوبارہ اپنے آس پاس
نظر نہ آئیں۔“ دل پر پتھر رکھ کر کہتے ہوئے ان کے
اپنے دل نے بھی آہ بھری۔

”پر کیوں سر کیا وجہ ہے؟“ اس نے پوچھا۔
”اس بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں اور
اب آپ جا سکتی ہیں پلیز جائیں۔“ انہوں نے غصے
سے اونچی آواز میں کہا تو وہ لوٹ آئی۔

☆.....☆

وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد جسے ماما کی ڈتھ
کے بعد پاپا نے اتنے نازوں سے پالا کہ کبھی کسی بات
پر ناں سننے کی عادت ہی نہ تھی۔ ذہین اتنی کہ بچپن
سے ہر کلاس میں نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں

اسٹوڈنٹ احترام میں کھڑے ہو گئے۔ انہیں بٹھا کر
ڈانس پر کھڑے ہوئے، نگاہوں نے خاموشی سے
ساری کلاس کا جائزہ لے ڈالا لیکن اپنا مطلوبہ گوہر نہ
پا کر شاداب کو پکار بیٹھے۔

”شاداب! وفا کہاں ہیں کہیں گئی ہوئی ہیں کیا؟“
انہوں نے لہجے کو سرسری بنانے کی کوشش کی۔
”نوسر! آج اس میسنی نے چھٹی مارلی، مجھے بتایا
بھی نہیں اور خود ہی چھٹی کر کے بیٹھ گئی گھر میں۔ اب
میں بھی کل اسے بتائے بغیر چھٹی کروں گی، پھر پتا
چلے گا اسے بھی۔“ اس نے اپنے دل کے پھپھولے
پھوڑے۔

”مس شاداب! آپ سے جتنا پوچھا جائے
صرف اسی کا جواب دیا کریں۔“ ٹوبان کے کہنے پر وہ
اپنا سامنہ لے کر رہ گئی۔

”یہ وفا کہاں چلی گئی ہے، گھر گئی ہے یا غصے میں
کچھ غلط تو نہ کر بیٹھی ہو۔“ ٹوبان نے پریشانی سے
سوچا، آج سارا دن وہ ٹھیک سے کوئی لیکچر بھی نہ دے
سکے ذہن اسی کی طرف لگا رہا۔

☆.....☆

کالج سے آ کر کھانا کھایا اور اپنی مام کو بتا کے وہ وفا
کی کلاس لینے اس کے گھر آ گئی۔ اس کے کمرے میں
اس کے سامنے بیٹھی غصے سے بولی۔
”مل گیا سکون۔“ وفانے نا جھی سے شاداب کی
طرف دیکھا۔

”مل گیا سکون مجھے بتائے بغیر چھٹی کر کے۔“
اس نے ناک سکوڑتے کہا۔

”آئی تھی کالج میں صبح لیکن سر نے مجھے اتنا روڈ
لہجے میں انکار کیا تو میں گھر واپس آ گئی۔“ اس نے
آنکھوں میں آتے پانی کو چھپانے کے لیے آنکھیں
جھکالیں۔

”واٹ..... مجھے تو پہلے ہی پتا تھا کہ سر ایسا ہی کچھ
کریں گے یار تم ایسے ہی اس کھڑوس کے پیچھے پڑی

پہلی پوزیشن پر صرف اسی کا نام لکھا ہوتا۔

اس کے پاپا شہر کے مشہور بزنس مین رضا احمد خان جن کی جان و فامیں کبھی لیکن آج وہ اتنی اداس تھی کہ اس کے پیارے سے پاپا چاہ کر بھی نہ جان پائے کہ اسے کس بات کی پریشانی ہے۔ وہ جب پوچھتے تو وہ یہ کہہ کر ٹال دیتی کہ آپ کا وہم ہے۔ آج کالج سے آ کر کمرہ بند کیے وہ سوچ میں ڈوبی تھی۔

”آخر میں پوزیشن ہولڈر وفا جو جہاں بھی جاؤں سب کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہوں۔ سرٹوبان نے مجھے کیوں Reject کر دیا؟“ یہ سوچ اسے پاگل کر دینے کے لیے کافی تھی۔ وہ جتنا سوچتی اس کی محبت اور بڑھتی جاتی، موبائل پکڑے وہ کچھ ٹائپ کرنے لگی۔

ہاں میں نے تجھے چاہا انکار نہیں مجھ کو یہ جرم تو ثابت ہے کیا اس کی صفائی دوں اس نے ٹائپ کیا اور اپنے مطلوبہ نمبر پر Send کر دیا۔ پھر جیسے کچھ یاد آنے پر دوبارہ سے ٹائپ کرنے لگی۔

یہ میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا تھی کہ وہ شخص میرے پاس میرے نام کی طرح رہتا اور تلے میسج بھیجنے کے بعد اس نے موبائل بیڈ پر پھینک کر خود صوفے کی پشت پر سر نکال لیا۔

☆.....☆

”ٹوبان بیٹا! بہت ہو گیا اب تمہاری ایک نہیں سنوں گی اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے تو بتاؤ مجھے ورنہ میں اپنی پسند سے لڑکی منتخب کر کے تمہاری شادی کر دوں گی۔“ وہ جو کمرہ بند کیے لیٹے کچھ سوچ رہے تھے کہ نائلہ کی آواز پر اٹھ بیٹھے۔

”امی! میں نے آپ کو پہلے بھی کتنی بار بولا ہے کہ مجھے شادی نہیں کرنی۔“ انہوں نے اپنے ذہن کو جھٹکا جہاں وفا کھڑی مسکرا رہی تھی۔

”بیٹا! تم کیا چاہتے ہو میں اپنی یہ خواہش لیے ہی

دنیا سے چلی جاؤں، تمہارے ابو آج زندہ ہوتے تو وہ بھی یہی خواہش کرتے۔ اکلوتے بیٹے ہو تم میرے۔ میرا دل بھی کرتا ہے کہ اس گھر میں تمہارے بچوں کی قلقاریاں گونجیں، کیا تم مجھے اس خواہش کے لیے ترسا ترسا کے مارو گے؟“ انہوں نے آنسو پونچھتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہا۔

”اللہ نہ کرے امی! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ، ایک آپ ہی تو ہیں میرے پاس۔ میں کیسے رہوں گا آپ کے بغیر آپ ایسی باتیں کر کے مجھے تڑپایا نہ کریں پلیز۔“ انہوں نے ماں کے منہ پر ہاتھ رکھتے کہا۔

”تو بیٹا! ماں لو ناں میری بات کر لو شادی تمہیں میری قسم۔“

”امی! خدا کا واسطہ ہے ابھی فی الحال مجھے شادی کا مت بولا کریں، ابھی میں اس قابل نہیں کہ یہ ذمہ داری اٹھاسکوں۔“ کہہ کر وہ اٹھ کے باہر چلے گئے۔ 32 سالہ گھبرو جوان بیٹے کی آنکھوں میں ایسا کچھ تھا کہ نائلہ چونک سی گئیں۔ اٹھ کے بیٹے کے پیچھے گئیں۔

”کیا بات ہے بیٹا! تم کسی کو پسند کرتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا، مجھے تو بس تمہاری خوشی چاہیے۔“ انہوں نے کچھ کھو جتے کہا۔

”امی! کتنی بار بولا ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ ایک بات کے پیچھے ہی بڑگئی ہیں۔“ انہوں نے غصے سے کہا اور گھر سے باہر نکل گئے۔ نائلہ حیران پریشان دروازے کو دیکھتی رہ گئیں۔

☆.....☆

”یار وفا! اس بار بھی تم New year پارٹی دے رہی ہونا۔“ فری پیریڈ میں وہ اپنی کلاس فیلوز کے ساتھ گراؤنڈ میں بیٹھی تھی جب بلال نے پوچھا۔

”ہاں وفا! بتاؤ ناں دو دن رہ گئے ہیں۔ اس ایئر کی پارٹی کچی ناں۔“ اب کے بوٹے سے قد والی رانی نے پوچھا۔

”نہیں یار! اس بار کوئی پارٹی نہیں اریج کر رہی ہوں میں۔“ اس نے بے دلی سے کہا تو سب کے منہ لنگ گئے۔

☆.....☆

وہ گم صم بیٹھی کسی گہری سوچ میں تھی کہ اس کے پاپا نے چنگی بجا کے اسے متوجہ کیا، کیا بات ہے۔ ”بیٹا! تم اتنی اداس کیوں رہتی ہو۔“ انہوں نے پریشان ہوتے کہا۔

”نہیں پاپا! ایسی تو کوئی بات نہیں آج کل گھر میں بوریٹ ہو جاتی ہے۔“ اس نے ٹالا۔

”بیٹا! آج اس سال کا آخری دن ہے اور تم تو ہمیشہ اس دن پارٹی رکھتی تھیں اس بار منع کیوں کر دیا تھوڑا دل بہل جاتا تمہارا۔“ انہوں نے عینک ٹھیک کرتے پوچھا۔

”نہیں پاپا! اس بار موڈ نہیں ہو رہا پارٹی کا۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھتے کہا۔

”او کے بیٹا! جیسا تمہارا دل کرے اچھا سنو کل فاضل انکل کی طرف جانا ہے تمہیں یاد ہے ناں، رمزہ کی بارات ہے۔“ انہوں نے اسے یاد دہانی کرائی۔

”جی پاپا! مجھے یاد ہے آپ بے فکر رہیں میں ٹائم پر ریڈی رہوں گی۔“ اس نے تسلی دی۔

”اچھا تو بیٹا! اب آپ سو جائیں، ایسے بیٹھے بیٹھے سردی لگ جائے گی چلیں اندر کمرے میں۔“ انہوں نے لاڈ سے بیٹی کو اٹھایا۔

کمرے میں لیٹی گہری سوچ میں تھی کہ اچانک اٹھ بیٹھی اور موبائل کی تلاش میں نظریں ادھر ادھر دوڑائیں۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھا موبائل اٹھا کے Msg ٹائپ کرنے لگی۔

”کسی کو دیکھوں تو ماتھے پہ ماہ و سال ملیں کہیں بکھرتی ہوئی دھول میں سوال ملیں آؤ کچھ دیر دسمبر کی دھوپ میں بیٹھیں یہ فرصتیں ہمیں شاید اگلے سال نہ ملیں

اس نے بڑے جذب کے عالم میں Msg ٹائپ کر کے ٹوبان کے نمبر پر بھیج دیا۔

کروٹیس بدل بدل کر جب وہ تھک گیا تو اٹھ کے بیٹھ گیا۔ بکھرا حلیہ ان کے بکھرے دل کی عکاسی کر رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھاما تھا کہ میسج نون بیج اٹھی۔ بے دلی سے Msg کھولا ہی تھا کہ نظر پڑتے دل جیسے کھل اٹھا۔

پچھلے سال بھی اُداس رہا روٹھ کر گیا تجھ سے ملے بغیر دسمبر گزر گیا جو بات معتبر تھی وہ سر سے گزر گئی جو حرف سرسری تھا وہ دل میں اتر گیا وہ اس کے میسج جوں جوں پڑھتے گئے۔ دل ان کی لگائی گئی پابندی کے خلاف شدید احتجاج کرنے لگا۔ دل میں اٹھتے شور و غل سے گھبرا کے وہ بائیک لے کر باہر نکل گئے اور دیر رات تک بلا مقصد شہر کی سڑکیں تاپتے رہے۔

کوشش کے باوجود وفا سونہ سکی۔ رات کے پارہ بیج رہے تھے لیکن اس کی نیند اس سے روٹھی بیٹھی تھی۔ وہ جانے کتنی دیر ان کی یاد میں جاگتی رہی۔ سردرد سے پھٹا جا رہا تھا۔ زندگی میں کچھ بھی اچھا نہ لگ رہا تھا۔ آخر وہ مان کیوں نہیں جاتے۔ یہی ایک سوچ اس کے ذہن میں گونج رہی تھی۔

☆.....☆

نئے سال کا پہلا دن تھا لیکن اس کی زندگی کا انوکھا دن تھا۔ پچھلے کئی سالوں سے وہ یکم جنوری کو بہت ایکٹو اور انرجی فیل رہتی تھی لیکن اس بار اس کو یوں لگ رہا تھا کہ گزرا سال اس سے کوئی شے چھین لے گیا ہے۔ آج سارا دن وہ اپنے کمرے میں اندھیرا کیے پڑی رہی۔ کالج سے بھی چھٹی کی۔

”بیٹا! ٹھیک آٹھ بجے رات کو تیار رہنا میں آفس سے آ کے تمہیں پک کر لوں گا۔“ انہوں نے ایک بار پھر سے یاد دہانی کرائی۔

”او کے پاپا۔“ وہ انہیں بھیج کر اپنے کمرے میں آگئی۔ آج شدت سے رونا آرہا تھا۔ خود کو روکنے کے باوجود وہ اپنے آنسوؤں پر بند نہ باندھ سکی۔ روتے روتے سارا دن گزر گیا۔ سات بج رہے تھے کہ وہ بے دلی سے اٹھی فریش ہو کر الماری سے بلیک سوٹ نکالنے لگی۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ تیار کھڑی تھی۔ موبائل لے کر بیٹھی اور Msg ٹائپ کرنے لی۔

”میرے لفظوں سے نکل جائے اثر

کوئی خواہش جو تیرے بعد کروں“

ٹھیک آٹھ بجے رضا صاحب کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو وہ باہر آگئی۔

”ارے آج تو میری بیٹی بہت پیاری لگ رہی ہے۔“ انہوں نے لاڈ سے کہا۔

بلیک کپڑوں پر سلور کام اتنا نفاست سے کیا گیا تھا کہ اس کی سفید رنگت پر اور بھی کھل اٹھا۔ میک اپ سے عاری دھلا صاف ستھرا چہرہ، کلانی میں رسٹ و اج اور پاؤں میں نازک سی بلیک جوتی، بال کندھے پر آئے ہوئے سے اڑ رہے تھے۔ جنہیں وہ بار بار ہاتھ سے پیچھے کر رہی تھی۔ یہ تھی اس کی تیاری لیکن اس کے باوجود اس میں کچھ ایسا خاص تھا جو سوگوار سا بنائے اُسے سب سے الگ بنا رہا تھا۔

شہر کے مقامی مہنگے ہوٹل میں وہ لوگ پہنچے تو ہر طرف روشنیوں اور رنگوں کا خوب صورت امتزاج محفل کو چارچاند لگا رہا تھا۔ پاپا کے ہمراہ اسٹیج کی طرف بڑھ گئی جہاں تانیہ دلہن بنی انتہائی پیاری لگ رہی تھی۔ وہ اس کے پاس ہی کچھ دیر بیٹھ گئی۔ رضا انکل ان کی بیوی سے مل کر وہ کونے کی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

☆.....☆

”ابے کہاں سے یار! کب پہنچے گا، اتنی دیر سے میں فون کر رہا ہوں لیکن تو اٹھا ہی نہیں رہا۔“ منزل نے

ٹوبان کی آواز سنتے ہی غصے سے کہا۔

”بس یار 10 منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔“ کہہ کر اس نے فون کاٹ دیا۔

وہ اپنے ہی خیالوں میں بیٹھی تھی کہ منزل کی آواز پر چونک گئی۔

”اوہ مائی باری ڈول تم یہاں ایسے کیوں بیٹھی ہو، چلو یہاں آؤ میں تمہیں کسی سے ملواتا ہوں۔“ منزل نے وفا کا ہاتھ کھینچ کے اٹھایا تھا تو وہ پھٹ پڑی۔

”لیومی الون منزل! اینڈ ڈونٹ ٹرائی ٹو سٹیج می اگین۔“ اس نے غصے سے چلاتے کہا۔

”اور آئندہ مجھے میرے نام سے بلانا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا اگر تم فاضل انکل کے بیٹے نہ ہوتے تو اب تک مجھ سے تھپڑ کھا چکے ہوتے۔“ وہ غصے سے بولی۔

”او کے وفا! ٹھیک ہے اچھا غصہ مت کرو میں آئندہ خیال رکھوں گا، آؤ میں نے تمہیں اپنے کالج کے بیسٹ فرینڈ سے ملواتا ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا کہ سامنے سے آتے شخص پر نظر پڑتے ہی وہ بت بن گئی۔

”سر آپ.....!“ بڑی مشکل سے وہ صرف اتنا کہہ پائی اور وہ جو اسے اپنے سامنے موجود پا کر خوشی سے پھولے نہیں سمار ہے تھے۔ دل پھر سے بغاوت پر اتر آیا۔

”تم جانتی ہو ٹوبان کو؟“ منزل نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں میں وفا کی انگلش کی کلاس لیتا ہوں کالج میں۔“

”اوہ ہاں مجھے تو یاد ہی نہیں رہا کہ تم دونوں ایک ہی کالج میں ہوتے ہو۔“ ٹوبان کی بات سن کر اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ منزل ابھی بات کر ہی رہا تھا کہ کسی نے آواز دے کر بلا لیا۔ تنہائی ملتے ہی وفا نے ٹوبان کی طرف یوں دیکھا، گویا کوئی گلہ کر رہی ہو۔

”سر! آپ یہاں کیسے؟“ وہ بولی بھی تو فقط یہی۔

”ہاں میں یہاں منزل کی وجہ سے وہ میرا کالج کا

فرینڈ تھا، اسی نے زبردستی بلوایا ہے، ورنہ میں تو نہ آتا۔ مجھے فنکشن میں جانا اچھا نہیں لگتا۔“ انہوں نے ہاتھ اپنی جیب میں ڈالتے تفصیل بتائی۔ grey سوٹ ان کی پرسنالٹی پر خوب فٹ رہا تھا۔ دونوں کی آنکھوں میں دیے سے روشن تھے۔

”ٹوبان! آخر آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں پلیز مجھے آج بتا ہی دیں۔“ اس نے تھکے لہجے میں پوچھا۔

”آؤ میرے ساتھ یہاں پاس ہی ایک ٹی شاپ ہے، میں تمہیں آج تمہارے سوال کا جواب دیتا ہوں۔“ انہوں نے کہا تو وہ فوراً ہی ان کے پیچھے ہوئی۔ ہوٹل سے نکل کر وہ بائیک کے پاس رک کر اس کی طرف مڑے۔

”اگر تم ایزی فیل نہ کرو تو ٹیکسی روک لیتا ہوں میں، میرے پاس کوئی گاڑی نہیں ہے۔ یہی ایک بائیک ہے۔“ انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے پوچھا۔

”ٹوبان! آپ کے ساتھ میں بائیک کیا رکشے پر بھی جاسکتی ہوں مجھے گاڑی کی نہیں آپ کے ساتھ کی ضرورت ہے۔“ اس نے سچے دل سے کہا تو وہ بائیک اشارت کرنے لگے۔ وفان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یوں بیٹھ گئی گویا سالوں سے بائیک پر سفر کرتی رہی ہو۔ وہ اتنی پرسکون اور مطمئن ہو گئی کہ اپنی ہی کیفیت پر حیران ہو رہی تھی۔

ٹی شاپ میں چائے کا آرڈر دے کر وہ اپنی طرف متوجہ وفا کی طرف دیکھ کر بولے۔

”تم یہی جانا چاہتی ہونا کہ میں تم سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتا اور میرے انکار کی وجہ کیا ہے تو سنو میرے انکار کی وجہ ہے ہمارے Life style کا فرق۔ میں ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ میری فیملی میں، میں اور میری امی ہیں، میں شروع سے ہی تعلیم میں اچھا رہا۔ ہر کلاس میں پوزیشن لیتا رہا ہوں۔ کالج اور یونیورسٹی میں بھی 1st پوزیشن آئی تو

پرنسپل نے مجھے وہیں اپوائنٹ کر لیا۔ ابھی میرے پاس اتنے وسائل نہیں کہ میں شادی کے بعد اپنی بیوی کو خوش رکھ سکوں اور تم ایک Upper کلاس کی لڑکی ہو۔ تم نے اپنی زندگی میں جو سہولتیں دیکھی ہیں، میں تمہیں وہ سب نہیں دے سکتا اور میں نہیں چاہتا کہ محبت میں آ کر میں تمہاری ساری زندگی برباد کروں۔ ابھی تمہیں اس بات کا اندازہ نہیں لیکن میں نہیں چاہتا کہ بعد میں تم پچھتاؤ میرے ساتھ پر۔“ وہ سانس لینے کو رکھ کر کہا۔

”ٹوبان! آپ مجھے سمجھ ہی نہیں سکے۔ میں امیر گھرانے سے ضرور ہوں لیکن بگڑی ہوئی لڑکی ہرگز نہیں ہوں کہ ان گاڑی، بنگلوں دولت کے بغیر رہ نہ سکوں، مجھے صرف آپ کے ساتھ کی ضرورت ہے پیسے کی نہیں۔“

”تم ابھی جذباتی ہو کر سوچ رہی ہو وفا! جب تم میرے گھر کا لائف اسٹائل دیکھو گی ناں تو نہیں رہ سکوں گی وہاں۔“ ٹوبان نے اسے حقیقت دکھائی۔

”اب میں دوبارہ تمہارے منہ سے ایسی ویسی کوئی بات نہ سنوں آج تمہارے اصرار پر میں نے تمہیں بتایا ہے سب سچ۔ اس کے بعد ہمارے درمیان کبھی اس موضوع پر بات نہیں ہوگی۔ چلو اٹھو اب ہوٹل واپس جائیں تمہارے فادر تمہیں ڈھونڈ رہے ہوں گے۔“ انہوں نے اپنے مچلتے دل کو تھکتے ہوئے اسے اٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ انہیں روکتی رہ گئی۔

”ٹوبان! پلیز میری بات تو سنیں۔“ وہ تقریباً ان کے پیچھے بھاگتے ہوئے بولی لیکن ٹوبان نے اس کی ایک نہ سنی۔

☆.....☆

ٹوبان کے ساتھ آخری ملاقات کے بعد اس نے ایک ہفتہ روتے دھوتے گزارا اور کالج سے چھٹی بھی کر لی۔ شدید ذہنی دباؤ کے باعث اسے بخار ہو گیا جو اترنے کا نام بھی نہیں لے رہا تھا۔ رضا صاحب الگ

پریشان تھے۔ دوسری طرف شاداب کا دل بھی اس کی حالت پر تڑپ رہا تھا وفا موبائل تھا مے Msg ٹائپ کرنے لگی۔

”یہ میرا حوصلہ ہے تیرے بغیر سانس لیتا ہوں بات کرتا ہوں“

msg بھیج کر اس نے ایک سرد آہ نکالی اور آنکھیں موندھ لیں۔

”کیا کر رہی ہو فضول لڑکی مجھے تو بھول ہی گئی ہو، بہت بری دوست ہو تم۔“ شاداب نے آتے ہی گلہ کیا۔

”ارے تم، شکر ہے تمہیں بھی یاد آیا کہ تمہاری ایک دوست بھی ہے۔“ اس نے بھی گلے کا جواب گلے سے دیا۔

”یار وفا! تم نے اپنا حال کیا بنا رکھا ہے تمہیں پتا ہے انکل تمہاری وجہ سے کتنے پریشان ہیں، تم ایسی تو نہ تھیں، یہ کیا ہوتا جا رہا ہے پارا گروہ تم سے پیار نہیں کرتے تو تم بھی دفعتاً کروا نہیں۔“ اس نے فکر مندی سے اس کے بکھرے حلیے کی طرف اشارہ کیا۔

”یار کیسے چھوڑ دوں میں ٹوبان کے بغیر مر جاؤں گی۔ شاداب کیسے سمجھاؤں میں تم سب کو اور انہیں بھی۔“ اتنے دنوں سے ضبط کرنے کی وجہ سے آج وہ دل کا غبار نکال بیٹھی۔ شاداب کے گلے لگ کر وہ زارو قطار رونے لگ گئی کہ شاداب کے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ دوست کی ایسی اجڑی حالت دیکھ کر اس کا دل کٹ رہا تھا۔

”اچھا اچھا وفا تم رونا تو بند کرو میں کچھ سوچتی ہوں کہ اس گھی کو کون سی انگلی ٹیڑھی کر کے نکالنا ہے۔“ اس کی بات سن کر وفارہ نا بھول کر اسے دیکھنے لگی۔

”کیا مطلب؟“ اس نے حیرانگی سے پوچھا۔

”مطلب یہ کہ محاورہ بول رہی ہوں وہ جو کہتے ہیں ناں کہ جب گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو انگلی ٹیڑھی کرنی پڑتی ہے تو میں سر ٹوبان کا سوچ رہی ہوں کہ ایسا کیا کیا جائے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاشی بھی نہ

ٹوٹے۔“ اس نے دوسرے محاورے کا بھی غلط استعمال کیا تو وفا پھٹ گئی۔

”شاداب کی بیچی کیا اول فول بکے جا رہی ہو۔“ اب کی بار وفا نے اسے مکادے مارا تو اس نے زمین پر گرنے کی ایکٹنگ کی۔

”اچھا پہلے مجھے ساری بات بتاؤ کہ اس دن تمہاری سر سے کیا بات ہوئی تھی؟“ شاداب نے اس سے پوچھا تو وفا نے ساری بات بتادی جسے سن کر اس نے کہا۔ ”اس سے یہ تو ظاہر ہو گیا کہ سر بھی تم سے پیار کرتے ہیں بس وہ اسے حالات کی وجہ سے تمہیں اپنا نہیں رہے۔“ اس نے کچھ سوچتے کہا۔

”یار! میں نے انہیں بولا بھی تھا کہ وہ میرے پاپا کے آفس میں جا کر لیں تو یہ بات بھی وہ نہیں مانتے۔“ اس نے مایوسی سے کہا۔

”وفا! تم ایسا کرو کہ کچھ دن کے لیے اپنے پاپا کے ساتھ پھپھو کے گھر انگلینڈ چلی جاؤ۔“ اس نے جیسے کچھ سوچتے کہا۔

”یار! میں یہاں سر کے لیے مری جا رہی ہوں اور تم مجھے گھومنے کا مشورہ دے رہی ہو۔“ اس نے تپتے ہوئے کہا۔

”ارے عقل کی دیوی میری بات تو سنو۔“ شاداب نے اسے ٹوکا اور اپنا سارا پلان بتا دیا۔

☆.....☆

آج پورے 29 دن ہو گئے تھے۔ وفانے کالج آنا چھوڑ رکھا تھا۔ شاداب نے سوچ رکھا تھا کہ آج وہ اپنے منصوبے کے مطابق سر سے بات ضرور کرے گی لیکن اس سے پہلے سر ٹوبان نے اسے اسٹاف روم میں اپنے پاس بلا لیا۔

”مس شاداب! اتنے دن ہو گئے ہیں۔ وفا کالج کیوں نہیں آرہی ہیں۔ آپ نے پتا کیا؟“ اس کے آتے ہی ٹوبان نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

”جی سر! آج میں آپ کے پاس آنے ہی والی تھی

”تم جو بھی کر رہے ہو اس کی بہتری کے لیے کر رہے ہو۔ اس سے شادی کر کے تم اسے کیا دے سکو گے۔ کبھی خوش نہیں رہ سکتے گی وہ تمہارے ساتھ۔“ دماغ نے دل کو ڈپٹا۔ وہ دیر رات یہاں وہاں بائیک گھماتے رہے۔

☆.....☆

کالج آتے تو ہر چہرے میں اس کو تلاش کرتے رہتے۔ پڑھانے میں دل نہ لگتا، کئی بار ساکھی ٹیچرز نے ان کے بکھرے حلیے کے بارے میں بھی پوچھا لیکن وہ طبیعت خرابی کا بہانہ بنا دیتے۔

بکھرے بال، بڑھی ہوئی شیو، سب سے بڑھ کر سرخ انگارہ ہوتی ہوئی آنکھیں ان کارت جگا اور حال دل بتانے کے لیے کافی تھا۔ ہر روز شاداب سے اس کے بارے میں پوچھنے سے خود کو روک نہ پاتے۔

☆.....☆

”یار وفا! تم مجھے ٹریٹ کیا دے رہی ہو؟“ فون پر شاداب نے پوچھا۔

”کیوں کیا ہوا کس بات کی ٹریٹ؟“ اس نے سوال کیا۔

”ارے یار! تمہارے لیے کیا پلان سوچا ہے میں نے، داد دو مجھے۔ سر کو تمہارے لیے بالکل مجنوں بنا دیا ہے میں نے۔ ٹریٹ تو بنتی ہے نا۔“ اس نے دانت نکالتے کہا پھر وفا کے پوچھنے پر ٹوبان کی حالت اور بے تابی سب کچھ اس کو بتا دیا۔ وہ بھی خوشی سے پھولے نہیں سار ہی تھی۔

☆.....☆

یونہی دن بے کیف سے گزر رہے تھے۔ اب ٹوبان بھی اپنے دل سے لڑتے لڑتے تھک گئے تھے۔ اس لیے انہوں نے آج کالج میں شاداب سے وفا کا نمبر لیا اور گھر جاتے ہی سب سے پہلا کام جو کیا وہ اسے فون تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی دل اور بے قرار ہو گیا۔

سر اس نے مجھے بولا کہ میں آپ سے بات کر لوں کہ اس کے پاپا اس کی شادی اس کی پھپھو کے بیٹے سے کروا رہے ہیں۔“ اس کی بات سن کر ٹوبان کے دل کو کچھ ہوا۔

”کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ انہوں نے اپنے لہجے کو حتی المقدور لا پرواہ بنانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔

”جی سر! وہ کہہ رہی تھی کہ وہ صرف آپ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ وہ اپنے پاپا کے کہنے پر کزن سے شادی کے لیے مان تو گئی ہے لیکن وہ وہاں کبھی خوش نہیں رہ سکتے گی۔ اب بھی آپ کے پاس وقت ہے آپ اس کی زندگی تباہ ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ آپ ایک بار ہاں کہہ دیں وہ سب چھوڑ کے لوٹ آئے گی۔ اور جہاں تک بات اس کے اور آپ کے Life Style کی ہے تو سر میں آپ کو تسلی دیتی ہوں کہ وہ گاڑی بنگلوں میں رہتی ضرور ہے لیکن ان کے بغیر وقت پڑنے پر خود کو ایڈجسٹ ضرور کر سکتی ہے۔“ اس نے کہتے ہوئے ٹوبان کی طرف دیکھا۔

☆.....☆

گھر آ کے بھی ان کے دماغ میں شاداب کی باتیں گھومتی رہی تھیں۔ دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ان کی بہت قیمتی شے ان سے چھن گئی ہے۔ ناملہ بھی بیٹے کی حالت دیکھ کر پریشان تھیں۔

”وہ مجھے بتائے بغیر کیسے چلی گئی اتنی دور۔“ دل سے شکوہ نکلا۔ پہلے یہ احساس ہی جینے کے لیے کافی تھا کہ وہ اس شہر میں ہی رہتی ہے۔ اس کی خوشبو وہ اپنے ارد گرد محسوس کرتے تھے۔ وہ سر شام ہی بائیک لے کر نکل گئے لیکن انہیں کہیں سکون نہیں مل رہا تھا۔

”کہیں میں نے کوئی غلطی تو نہیں کر دی۔ میں بھی تو اس سے بہت پیار کرتا ہوں، اس کے بغیر کیسے رہوں گا۔“ دل نے شکوہ کیا۔

”وفا! میں پوری کوشش کروں گا تمہیں خوش رکھنے کی جو میرے بس میں ہوگا میں تمہارے لیے کروں گا۔ میں کالج کے ساتھ ساتھ کوئی دوسری جاب بھی ڈھونڈ لوں گا۔ اپنی طرف سے تمہیں کوئی کمی نہیں ہونے دوں گا۔“ انہوں نے نہایت اہمیت سے کہا۔

”ٹوبان! میں نے پہلے بھی آپ کو کتنی بار بولا ہے کہ مجھے مال و دولت کی ذرا بھی لالچ یا ہوس نہیں ہے، میں کم میں بھی خوش رہنے والی ہوں۔ بس مجھے آپ کا ساتھ چاہیے۔ آپ ایک بار مجھے آزما کے تو دیکھیں۔“

”میرے لفظوں سے نکل جائے اثر کوئی خواہش جو تیرے بعد کروں“

اس نے بہت دل سے شعر پڑھا تو ٹوبان مسکرا دیئے۔

”اچھا ٹوبان! پھر کل ملتے ہیں، اللہ حافظ۔“ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ کیونکہ ابھی اس نے اپنی پیاری سہیلی سے بات کر کے اس کا شکریہ بھی ادا کرنا تھا جس کی بدولت اسے اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ملنے والی تھی اگر اس نے وفا کو انگلینڈ والا آئیڈیا نہ دیا ہوتا تو شاید ہی ٹوبان کو اپنی محبت کا ادراک ہوتا۔ شاداب کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے اس پر بہت پیارا رہا تھا۔ اس کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے وہ مسکرا دی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی زندگی کا نیا سال تو اب شروع ہونے والا ہے ٹوبان کے ہمراہ۔ مایوسی اور دکھ کا پچھلا سال گزر گیا ہمیشہ کے لیے۔

وہموں کے کالے بادل چھٹ گئے۔ آسمان بالکل صاف شفاف ہو گیا۔ یوں لگتا تھا گویا ہوانے پھولوں کی خوشبو ہر طرف پھیلا دی ہو جس کی وجہ سے موسم میں عجیب سہانا پن آ گیا ہو۔ ایک دل فریب مہک ہے جو ہر اور پھیلی ہو جس نے ہر ایک پر مستی کی کیفیت طاری کر دی ہو۔

.....☆.....

”وفا! کیوں چھوڑ کر چلی گئی ہو مجھے، تم نے مجھے بتانا بھی گوارا نہیں کیا، تمہیں پتا ہے کہ تمہارے بغیر میں کیسے جی رہا ہوں، کیوں کیا تم نے میرے ساتھ ایسے پہلے تو کہتی تھیں کہ میرے بغیر جی نہیں سکتیں اور اب کسی اور سے شادی کرنے لگی ہو۔ یہ کیا پیار ہے تمہارا؟“ انہوں نے بے چینی سے ایک ہی سانس میں اتنے سارے سوال کیے کہ وفا کے دل میں ان کی بے چینی جان کر سکون اتر آیا۔

”میں کہاں چھوڑ کے آئی ہوں آپ کو، چھوڑنے کی باتیں تو آپ کرتے تھے اور مجھے بھی تو آپ نے خود اپنے سے دور کیا۔ میں یہاں کیسے جی رہی ہوں یہ آپ کو کیا معلوم؟“ اس نے بھی اپنی بے تابیاں بتائیں۔

”تو واپس آ جاؤ ناں وفا! میں تمہارے بغیر نہیں جی سکتا۔ پلیز واپس آ جاؤ پلیز۔“ انہوں نے بے قراری سے کہا۔

”کیا واقعی آپ مجھے اپنی زندگی میں شامل کریں گے؟ میں واپس آ جاؤں کیا؟“ اس کو ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا۔

”ہاں تم اب جلدی سے واپس آ جاؤ۔“ ٹوبان نے جذب کے عالم میں کہا۔

”او کے تو پھر میں کل تک آپ کے پاس ہوں گی لیکن اپنی بات سے مکرمت جائیے گا۔“ اس نے انہیں چھیڑا۔

”میں تو اب کبھی مرکز بھی نہیں مکر نے والا لیکن تم اپنے قادر کو کیسے agree کرو گی۔“ انہیں تشویش ہوئی۔

”آپ بے فکر ہو جائیں یہ سب مجھ پر چھوڑ دیں۔ میرے بابا مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں وہ میری خوشی میں خوش ہو جائیں گے اور کوئی ایشو نہیں ہوگا انہیں۔“ خوشی کے مارے اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

”اچھا میری بات سنو وفا۔“ انہوں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

”جی بولے!“ وفا نے تابعداری سے کہا۔

دسمبر کا سورج

وجود پر برداشت کر رہا تھا۔ بنا کسی گرم شال کے بھی
خنکی کا احساس اسے کپکپانے پر مجبور نہیں کر رہا تھا۔
اس کی ڈیشنک پر سنائی سفید رنگت اور کالی گہری

دسمبر کے اوائل میں کھڑکی سے باہر چھا جوں مینہ
برس رہا تھا اور وہ اپنی سوچوں میں گم بے نیاز کھڑا
شدید سردی کے باوجود ٹھنڈی ہوا کے تھپڑوں کو اپنے



آنکھوں کے ساتھ کتنے دلوں کے ارمان بنی ہوئی تھی مگر وہ آج اپنے کرچی کرچی دل کو سینے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

”عمیر! اس دسمبر کے موسم میں آپ کو یہ پشمینہ اوڑھ لینا چاہیے اور بے وفاؤں کے دکھ میں کڑھنے کے بجائے اس موسم کو انجوائے کیجیے۔“ قریب ہی سرگوشی ابھری تھی اور وہ چونک کر پلٹا تھا مگر وہاں کمرے میں اس وقت خود اس کے وجود کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

وہ کھڑکی کے پٹ بند کر کے اپنی الماری کی طرف آیا تھا اور اس کے پٹ کھول کر اس بے وقوف لڑکی کا دیا ہوا پشمینہ نکالا تھا جس نے بھی اس کے عم کے موسم کو خوشی میں بدلا تھا اور وہی اسے اس موسم کی لغزشیں دے گئی تھی۔

”عمیر بیٹا! آج اس موسم کے تیور کی وجہ سے اسلام آباد جانے والی فلائٹ بھی کینسل ہو گئی۔ باقی ٹرین بھی جانا مشکل ہے۔ انعم کی شادی کو تین دن رہ گئے ہیں۔ بارش تھمے تو بانی کار بھی چلنے کا پروگرام بنایا ہے اس لیے تیار رہنا۔“ ربیعہ بیگم نے کمرے میں آ کر کہا۔

”جی امی۔“ مودب انداز میں عمیر نے کہا۔
 ”بیٹا! اب انعم کی شادی اٹینڈ کرنے کے بعد تمہاری شادی بھی کر دوں گی۔ یوں تمہیں تڑپتے دیکھ کر میرے دل پر کیا گزرتی ہے کبھی سوچنا ضرور۔“
 ربیعہ بیگم آنکھوں میں نمی لا کر دو ٹوک لہجے میں بولی تھیں اور اس سے پہلے عمیر کچھ کہتا، وہ وہاں سے چلی گئیں۔

”انعم پاگل لڑکی یہ کیا کرنے جا رہی ہو۔“ وہ اس کے بارے میں سوچتا نہیں چاہتا تھا مگر سوچ رہا تھا اسے یاد آ رہا تھا۔ پچھلے سال کے اوائل دسمبر میں وہ ارمان و لالندن سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد آیا تھا سب گھر والے اسے ریسیو کرنے آئے تھے۔ جن

میں نوجوان کزن لڑکے اور لڑکیاں شامل تھے۔ ان میں ایک منفرد چہرہ بڑا شوخ و چंचیل نظر آ رہا تھا جو انعم کا تھا بچپن میں وہ کم و بیش ہی دکھتی تھی کہ وہ اس کی خالہ زاد تھی۔ اسلام آباد میں رہتی تھی۔ رشتے داروں کے گھر جانے سے کتراتے تھی مگر وہ یہاں پورے مہینے رہنے آئی تھی۔ اس کی کیا وجہ تھی ذہن میں آیا تھا مگر اس کو اس کی پرواہ نہیں تھی کیونکہ وہ بچھا بچھا دل لیے سب سے باری باری مل رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کرب کی لہریں اس کے عم کی غماز تھیں کہ وہ لندن میں اپنے قہقہے، خوشی اور خوب صورت خوابوں بھری نیندیں لٹا کے آیا ہے۔ سب ہی اس کے اس رویے پر دل مسوس کر رہ گئے تھے۔

☆.....☆

”سردی کتنی بڑھ گئی ہے رابعہ آنٹی! میں آلو کے پکوڑے بنا کے لائی ہوں سب کے لیے۔ عمیر کہاں ہیں؟“ پکن سے نکلتی انعم ٹرے لیے رابعہ آنٹی سے پوچھ رہی تھی۔

”عمیر اپنے کمرے میں ہے۔“ رابعہ لاؤنج پر آ گئیں، جہاں سب ہی گھر کے افراد موجود تھے۔ انعم عمیر کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔

”کم ان۔“ عمیر کی آواز آئی تھی۔
 انعم کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ وہاں دانیال عمیر کا چچا زاد بھائی اور شہلا تایا زاد بہن پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔

”جی مس انعم! آپ بھی آئیے اور سن لیجیے کیوں میں اتنا اداس رہتا ہوں۔ کیوں اتنا کٹھور ہوں آپ سب کو بڑی میری فکر ہے۔“

”ارے عمیر! انعم بے چاری پر کیوں برس رہے ہو۔“ دانیال نے تاسف سے کہا۔

”بھئی! اب میں باری باری سب کے سوالوں کا جواب نہیں دے سکتا۔ تم بھی کافی دیر سے یہی سوال

پوچھ رہے تھے۔ تمہارے پیچھے شہلا بھی یہی سوال کر رہی تھی۔ اب یہ انعم بھی۔

”آخر بات کیا ہے؟“ انعم بھونچکا بنی کہہ گئی۔

”بات یہ ہے کہ ایک لڑکی وفالندن میں مجھ سے اور میں اس سے محبت کرتے تھے مگر اس نے وفانہ کی جفا کر گئی میرے ساتھ دولت کی ہوس نے اسے اندھا کر ڈالا۔ دولت تو میرے پاس بھی تھی مگر مجھ سے بھی زیادہ دولت مند کی طرف لڑھکتے ایک سیکنڈ نہ لگایا اور اس سے شادی کر لی یہ بھی نہ سوچا محبت کوئی کھیل نہیں یہ موسم مجھے برا لگتا ہے۔ دسمبر کا موسم میرے لیے بد صورتی سے کم نہیں۔ ہم اس موسم میں بڑا لطف اٹھاتے تھے۔ میں تم لوگوں کے ساتھ انجوائے نہیں کر سکتا۔ خدا را میرے دل کو نہ دکھاؤ۔ یہ موسم تکلیف دے رہا ہے مجھے۔“ وہ خفگی سے بولا۔

”غصے سے دھاڑتا ہوا اینگری بنگ میں اس قدر بزدل ہو گا یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“ دانیال نے عمیر کو خفت کا احساس دلاتے ہوئے کہا تھا۔

”دانیال! اگر تمہارے ساتھ کوئی دھوکا اور فریب کرتا تم اس طرح نہیں کہتے، میں کیوں خفت محسوس کروں۔“ عمیر نے کرب سے کہا۔

”اس طرح آپ اپنے زندگی کے موسموں سے کیسے بھاگ سکتے ہیں۔ دکھ کا موسم ہو یا خوشی کا موسم ہو یہ زندگی کے موسم ہیں اور محبت بھی ایک موسم ہے اور نفرت بھی ایک موسم ہے یہ دسمبر کا موسم جیسے آپ کی محبت کا موسم ہے جو آپ کی نفرت کا موسم بن گیا ہے۔ اسی طرح میرے لیے یہ نفرت کا موسم ہے۔ ایک دکھ کا موسم ہے جسے میں لطف سے کاٹ رہی ہوں۔“ انعم نے گہری سانس لی تھی۔ اس نے اپنے اندر درد سا اترتا محسوس کیا تھا۔

”انعم! کون نہیں جانتا تمہیں یہ موسم بہت بھاتا ہے۔ تم جتنی خوب صورت ہواتا ہی یہ موسم تمہارے لیے خوب صورت ہے، تم نہیں تو اور کون اس موسم کی

دلفریبیوں سے واقف ہو گا اور تمہارا فیاضی تمہارا خالہ زاد وہ بھی سنا ہے تم سے شادی دسمبر کے اس موسم میں کرے گا۔ ایک حسین یادگار شادی اس موسم کا خوب صورت لمحہ بن جائے گا تمہارے لیے۔“ عمیر کی باتیں سن کر انعم ٹوٹ کر رونے کی خواہش کے باوجود جیسے پتھر بنی کھڑی تھی۔ آنکھوں میں نمی ضبط کے باوجود جھلکنے لگی تھی تو اس نے وہاں سے جانا بہتر سمجھا۔

”ارے یہ رونے کیوں لگی؟“ عمیر نے شہلا کی طرف دیکھ کر استفسار کیا۔

”آپ تو صرف اپنی دنیا تک محدود ہی ہیں ارد گرد بھی دیکھ لیا کریں کہ کس کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ انعم کا منگیتر حمزہ آپ کو پتا ہے کتنا لوز کریکٹر ہے۔ انعم اس کو بھائی سمجھتی تھی اس نے اپنی کزن شینا کا ہاتھ پکڑا تھا وہ تو شرما کر رہ گئی اور اس کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی لیکن جب اس نے انعم کا ہاتھ پکڑا تو انعم نے ایک زور کا پھٹرا اس کے گال پر مارا تھا۔ حمزہ نے اسی بات کا بدلہ لینے کے لیے اس سے شادی کرنے کی خاندان بھر میں خبر پھیلا دی۔ وہ دسمبر کی رات تھی جب وہ اپنے کمرے میں بیٹھی اپنی کی منگنی کی انگلیوں کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ تب ہی اس نے کہا تھا۔

”یہ انگلی تمہاری بربادی کی شروعات ہے اور تمہیں دسمبر کا موسم بڑا پسند ہے اسے میں تمہاری تڑپتی ہوئی روح کا موسم بناؤں گا۔ تمہیں خود سے اس موسم سے نفرت ہونے لگے گی۔“ شہلا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

ان باتوں کو سن کر عمیر دنگ رہ گیا تھا۔

☆.....☆

دو پہر کے دو بجے تھے مگر سورج آسمان پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ چھم چھم برستی سہانی گھٹائیں پورے آسمان پر چھائی ہوئی تھیں۔ نوجوان لڑکے لڑکیوں کی ٹولی

چھت پر پہنچی ہوئی تھی۔

دل کی بات کہہ دی۔

”ہاں۔“ خیالوں میں کھویا ہوا عمیر بے اختیار کہہ

گیا۔

”نہیں۔“ عمیر سنجیدہ ہو گیا۔

”اب انعم سے بات کرنا تمہارا کام ہے۔ ایسی

باوقا لڑکی کو ہاتھ سے جانے نہ دینا ممکن ہوئی ہے

شادی نہیں، دیکھنا ہاتھ سے نکلنے نہ پائے۔“ عمیر

جھینپ گیا، دانیال نے قہقہہ لگایا تھا۔

☆.....☆

انعم اس کے کمرے میں رات کو ٹرے میں چھلے

ہوئے چلغوزے اور اخروٹ لے کر آئی تھی۔ باہر

ابھی بھی بارش ہو رہی تھی، سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ

اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔

”آہم.....م.....“ اس نے ہنکارا بھرا۔

وہ چونک کر دیکھنے لگا۔

انعم نے اسے بغیر سویٹر کے اتنی سرد ہواؤں کے

کو برداشت کرتے ہوئے دیکھا تو اپنا پشیمینہ اس کو

اوڑھایا۔

”اس دسمبر کے موسم میں آپ کو یہ پشیمینہ اوڑھ لینا

چاہیے اور بے وفاؤں کے دکھ میں کڑھنے کے بجائے

اس موسم کو انجوائے کیجیے۔“ انعم نے ٹرے اس کے

آگے بڑھاتے ہوئے کہا وہ مسکرا دیا۔

”بے وفاؤں کو بھلانے کے لیے وفا شعار کی

ضرورت ہے انعم۔“ وہ معنی خیزی سے بولا مگر انعم نا

سمجھ سکی۔

”انعم بچپن میں تم مجھے چھلے ہوئے چلغوزے اور

اخروٹ بھججتی تھیں۔ یہ تمہاری مجھ سے وفا شعاری کا

ثبوت ہے۔“ انعم نے حیرت سے دیکھا۔

”میرے جیسے وفا شعار تو آپ کے ارد گرد بھرے

پڑے ہیں۔“

”مگر تم خاص ہو میرے لیے کب مجھے اس بات کا

احساس ہوا پتہ نہیں چلا، بس اب میں خوش رہنے لگا

اور سرد ہوا میں چل رہی ہیں۔ گرج چمک کے ساتھ

بارش کا مزہ ہی اور ہے۔“ انعم نے بھگتے ہوئے اچھل

اچھل کر بنستے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔ شہلا سب کے

لیے گرم گرم چائے اور سمو سے لے آئی۔ نوجوان

لڑکے لڑکیاں خوب شور و غل اور ہلہ گلہ کر رہے تھے۔

عمیر بھی یہاں چھت پر آیا تھا۔

”ارے عمیر! کیا بات ہے دل خوش کر دیا۔ آؤ آؤ

بھیگو اس برسات میں اور گرما گرم چائے سمو سے

سے لطف اٹھاؤ۔“ دانیال نے عمیر سے کہا جو کرسیوں

پر براجمان ہو گئے تھے۔

”دیکھو کتنا خوب صورت موسم ہے، مٹی اور چچی

نے ایک دو دفعہ آکر بہت ڈانٹا کہ بخار ہو جائے گا۔

زکام ہو جائے گا۔ زیادہ نہیں نہاؤ مگر ہمیں اس موسم

نے ڈھیٹ بنا دیا۔“ دانیال، عمیر سے باتیں کر رہا تھا

اور عمیر کا دھیان انعم کی طرف تھا۔ جب وہ لندن میں

تھا انعم کے بارے میں رابعہ بیگم نے اسے کتنی مرتبہ کہا

تھا کہ وہ انعم کو اپنی بہو بنانا چاہتی ہیں۔ بڑی خوب

صورت و سعادت مند بچی ہے۔ ایسی بہو خوش

نصیب گھرانے کو ہی نصیب ہوگی۔ تب اس نے انعم

کے متعلق نہیں سوچا۔ بچپن کی دوستی تھی تو کیسے اس سچ

پر سوچتا۔ کیونکہ وہ وفا کے سحر میں کم تھا لیکن آج وہ

جب کسی کے ساتھ منگنی کر چکی تھی وہ اس کے بارے

میں سوچ رہا تھا اور اسے دیکھ رہا تھا۔ دکتی گوری

رنگت، چھوٹی سی خوب صورت ناک بڑی بڑی کتھی

آنکھیں، گھنیری پلکوں کی باڑھیا سے گرتی اور لرز

رہی تھیں۔ بس وہی پل تھا۔ عمیر اس کی معصومیت

بھری مسکراہٹ ہمیشہ کے لیے قائم اپنے ارد گرد

محسوس کرنا چاہ رہا تھا۔ انعم کو ایک ٹک دیکھتے دانیال

نے عمیر کے سامنے چٹکی بجائی۔

”کیوں انعم ہے ناپیاری۔“ دانیال نے اس کے

ہوں اور اس خوشی کو قائم رکھنا اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔“ عمیر نے دھیسے لہجے میں مگر پیار سے کہا۔
 ”لیکن حمزہ میرا منگیترا ہے۔“ بمشکل انعم نے کہا۔

”بھول جاؤ حمزہ کو اس سے تمہارا رشتہ ختم ہو گیا ہے، یہی سمجھو۔“

استحقاق ایسا تھا گویا اس کے جسم و جان کا مالک ہو، انعم کچھ لمحوں کے لیے واقعی کنفیوژ ہو گئی تھی۔

وہ اس کے لیے شہزادے سے کم نہیں تھا جو اسے ایک شیطان جادوگر سے آزاد کر کے لے جانا چاہتا تھا، تبھی سر اٹھا کر سرسری سی نگاہ اس کے سپاٹ چہرے پر ڈالتے ہوئے بولی۔

”کل وہ مجھے لینے آرہا ہے۔ میری تقدیر کا فیصلہ ہو چکا اگر میری اس سے شادی نہیں ہوئی، تو میرے ماں باپ کی بے عزتی ہوگی اور وہ مجھے کہیں کا نہیں چھوڑے گا۔ میرے پاپا نے انہیں زبان دی ہے اور پاپا اپنی زبان سے نہیں پھرنے والے۔“ اور پھر دوسرے دن وہ وہاں سے چلی گئی یادوں کے لمحوں سے نکل کر اس نے گھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ بارش تھم چکی تھی۔ سب اسے بلا رہے تھے وہ جلدی سے تیار ہو کر سفر طے کرتے کسی طرح اسلام آباد پہنچے۔ پھر انعم کے گھر پہنچے۔ شادی کے دن انعم اسٹیج پر دلہن بنی بیٹھی تھی۔ عمیر حسرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بارات آنے کا انتظار ہو رہا تھا، وقت بیتا جا رہا تھا انعم کے پاپا فون پر بات کرتے ہوئے نڈھال ہو گئے۔ رابعہ، عمیر اور شہلا ان کی طرف لپکے تھے عمیر نے انعم کے پاپا کو سنبھالا دیا۔

”کیا ہوا، بھائی صاحب! بارات آرہی ہے ناں؟“ رابعہ بیگم نے استفسار کیا۔

”وہ نہیں آرہا، وہ کبھی بارات لے کر نہیں آئے گا۔“ انعم کے پاپا روتے ہوئے بولے فون رابعہ نے ان کے ہاتھوں سے لے کر کان میں لگایا۔

”ہیلو..... حمزہ۔“

”کون رابعہ آئی؟“ حمزہ نے کہا۔

”حمزہ! تم بارات لے کر نہیں آرہے؟“

”نہیں میں بارات لے کر اپنی دلہن شینا کو لا چکا ہوں۔ انعم سے کہیے گا وہ ساری زندگی بارات کا انتظار کرتی رہے۔“ حمزہ نے قہقہہ لگا کر کہا۔

”ہوں..... تم نے بہت اچھا کیا۔ بارات لے کر نہیں آئے کیونکہ بارات ہم لے کر آئے ہیں انعم کی شادی اب میرے بیٹے سے ہوگی۔“ رابعہ بیگم نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

حمزہ ہیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ انعم کے پاپا نہایت ہی مشکور نگاہوں سے رابعہ کو دیکھ رہے تھے۔

عمیر کو دو لہبا بنا اسٹیج کی طرف آتا دیکھ کر انعم اور مہمانوں کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔

”تمہاری جوڑی حمزہ جیسے آدمی کے ساتھ نہیں لکھی تھی پاگل لڑکی۔“ دونوں کے نکاح کے بعد شہلا نے انعم سے کہا تھا۔

”ہماری شادی اس موسم میں ہوئی ہے جو ہمارے لیے دھنک کے رنگین موسم جیسا ہے یہ دسمبر کا موسم، ہمارے وطن کا موسم یہ دسمبر کا موسم کبھی آئی تھی جو جدائی اسی موسم میں ایسی نہ آئے اب جدائی اس دسمبر کے موسم میں۔ عمیر نے بڑی چاہ سے کہا۔

”یہ سرخ شال بڑی چاہ سے نہ جانے کیوں میں نے لندن میں خریدی تھی، مجھے یہ پسند آگئی تھی اس وقت وفا بھی ذہن میں نہ تھی۔ اب پتا چلا یہ اس موسم کی سوغات کے طور پر تمہیں سرد پھیٹروں سے محفوظ رکھے گی۔“ انعم نے شال تھام لی تھی اس کی زندگی کے موسموں میں خوشبوئیں و خوشی و مسرتیں جو بکھر گئی تھیں۔

☆.....

بیگم

دیکھنا کہ اصل گلاب کا پودا اور گلاب ہوتا کیسا ہے۔“
 ”اچھا، اچھا ٹھیک ہے پہلے تم ذرا ادھر آؤ اور ذرا
 اس ناریل کے پودے کو تو دیکھو۔“ بیگم صاحبہ بڑی
 رکھائی اور بے زاری سے گویا ہوئیں اسے ناریل کے
 درخت کی طرف لے گئیں اور وہ کسی فرمانبردار بچے کی
 طرح بنا کسی چوں چراں کیے ان کے پیچھے پیچھے ہولیا۔
 مسز شہاب نہ جانے کب سے اپنے گھر کی بالکونی
 میں کھڑی سامنے والے گھر کا نظارہ کر رہی تھیں، گو
 کہ اس ملک کا ایک پڑھا لکھا مہذب شہری ہونے
 کے ناطے ان کی یہ حرکت غیر شائستہ اور غیر مہذبانہ
 گردانی جاسکتی تھی لیکن سامنے والی پجوشن اتنی
 دلچسپ تھی کہ وہ خود کو ایسا کرنے پر مجبور پارہی تھیں۔
 ”بیگم صاحبہ! یہ ناریل..... یہ تو کبھی پھل نہیں
 دینے کا، بیگم صاحبہ تم اسے یہاں سے اب نکلوا ہی دو تو
 اچھا ہے۔“ مالی منہ بنا کر اپنی رائے سے نوازر ہاتھا۔
 ”دیکھو بیگم صاحبہ! بارہ سال پہلے میں یہاں آیا
 تھا، تب بھی یہ ناریل کا درخت اسی طرح بے ثمر کھڑا
 تھا اور آج بارہ سال بعد بھی یہ یونہی بے ثمر کھڑا ہے۔“
 ”تم میری بات مانو تو اس درخت کو یہاں سے
 نکلوا دو، یہ پھل پھول نہیں دینے کا۔“ وہ کسی ماہر
 اسپیشلسٹ کی طرح پودوں کا بغور جائزہ لیتا اور اپنی
 قیمتی آراء سے آگاہ کرتا جاتا۔
 ”بیگم صاحبہ! تم ایسا کرو مجھے پانچ سو روپے لا
 دو۔ میں تمہیں بڑھیا قسم کے ناریل کے پودے لا کر

”یہ جو گلاب کے پودے ہیں ناں بیگم صاحبہ
 بالکل سٹریل گھٹیا..... یہ دیکھیں یہ اس کی شاخیں
 دیکھیں کیسی سوکھی ہوئی دیکھ رہی ہیں اور یہ دیکھیں ان
 کے پتے کیسے زرد پڑ رہے ہیں۔“ مالی گلاب کے
 ایک پتے کو انگلیوں سے مسل کر دیکھتے ہوئے بولا۔
 پھر بیگم صاحبہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔
 ”بیگم صاحبہ! اس سیزن میں جو کہ گلابوں کا سیزن
 کہلاتا ہے، اس سیزن میں اس پودے میں یہ سٹریل
 مریل سا گلاب ہے۔ یہ تو اصلی گلاب کا پودا ہے ہی
 نہیں۔ بالکل سٹریل گھٹیا مال۔“ وہ گلاب کا ایک
 سوکھا پتا توڑ کر چبانے لگا۔
 ”بالکل جنگلی سٹریل! بیگم صاحبہ کسی نے تمہیں بری
 طرح ٹھکا ہے۔“ مالی گلاب کے پتے کو ایک طرف
 تھوکتے ہوئے حقارت سے گلاب کے پودے کی
 طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
 ”بیگم صاحبہ! تم ایسا کرو، مجھے پیسے دو میں تمہیں
 اصلی اور بڑھیا گلاب کے پودے لا کر دوں گا۔ پھر تم
 دیکھنا بیگم صاحبہ ان پودوں میں اس سیزن میں کیسے
 کیسے بڑے بڑے گلاب ہوتے ہیں۔ اتنا بڑا تو اس
 کا ایک گلاب کا سائز ہوتا ہے۔“ وہ ہاتھوں کے
 پیالوں سے گلاب کا سائز بنا کر بولا۔
 ”ایک گلاب کا پودا بیگم صاحبہ! اس گلاب کے
 سیزن میں چالیس پچاس گلابوں سے لد جاتا ہے۔
 بیگم صاحبہ تم ایسا کرو تم مجھے پانچ سو روپے دو پھر تم



READING
Section

دوں گا۔ تم دیکھنا سال بھر میں وہ ناریل سے لد جائے گا۔ وہ پورے وثوق اور یقین کے ساتھ کہتے ہوئے بیگم صاحبہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”یہ..... یہ ناریل بالکل سڑیل، اجاڑ نسل یہ کبھی پھل نہیں دینے والا بیگم صاحبہ بالکل گھٹیا سڑیل مال۔“ وہ ناریل کے پودے کا ایک بڑا سا پتارول کر کے منہ میں ڈال کر چبانے لگا۔

”اف..... میرے خدا! یہ انسان ہے یا کسی جانور یا بکری کا بچہ جو کبھی گلاب کے پتے چبا ڈالتا ہے تو کبھی ناریل کے پتے کھا جاتا ہے۔“

مسز شہاب مالی کی اس حرکت پر حیرت زدہ سی اسے دیکھتی رہ گئیں لیکن اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ وہ بے چارا غربت کا مارا اپنے اس فعل کے ذریعے دراصل گھٹنے بھر سے مالکن پر یہ ثابت کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ وہ پودوں کے بارے میں پوری سوجھ بوجھ رکھنے والا ایک ایکسپٹ ماہر ہے اور وہ ان کے پھول پتے چکھ کر یاد دیکھ کر یہ بتا سکتا ہے کہ وہ کس نسل کا ہے۔ گھٹیا یا بڑھیا! دراصل وہ بھوک و افلاس کا مارا مالی بیگم صاحبہ سے پودوں کے نام پر ان سے کچھ پیسے اپنا کمیشن یا سود و سومناغ کمانا چاہتا تھا جو کہ وہ خاتون کسی طور دینے کو تیار نہ تھیں اور مسلسل نال مثل سے کام لے رہی تھیں۔

”اچھا، اچھا! ٹھیک ہے دیکھیں گے۔ سوچیں گے بابا۔“ صرف ایک غریب کو سود و سو روپے زیادہ ہاتھ آجانے کے ڈر سے وہ عیار و مکار عورت یہ چال چل رہی تھی۔ حالانکہ اس خاتون کو ابھی کوئی بڑا ادارہ غریبوں کی مدد کے لیے چندہ یا ڈونیشن وغیرہ کے لیے بلائے تو یہی عیار عورت وہاں پلبٹی کے لالچ میں دوڑی دوڑی چلی جائے گی اور ہزاروں لاکھوں روپے غریبوں کے نام پر ڈونیشن دے کر آجائے گی لیکن ایک غریب غربت کا مارا آدمی اگر پودوں کے بہانے کچھ پیسے مانگ رہا ہے تو یہ عیاری و

مکاری سے کام لے رہی ہے۔
”اف بے چارا مالی۔“

”اچھا، اچھا۔ اسے ابھی چھوڑو تم ذرا ادھر آؤ مالی۔“ وہ مالی کو مسلسل ناریل کے پودوں کے لیے پیسوں کا اصرار کرتا دیکھ کر جلدی سے بات بدلتے ہوئے بولی اور بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے اپنی معلومات میں پودوں اور پھلوں سے متعلق اضافہ بھی کیے گئی۔

”یہ دیکھو مالی! یہ موتیا، چنبیلی اور یہ گھاس دیکھو کیسے سوکھی چلی جا رہی ہے۔ پتا نہیں کیا بات ہے پہلے تو اچھا بھلا پھول دیتے تھے، گھاس بھی ہری بھری تھی۔ اب پتا نہیں کیوں سب سوکھتے چلے جا رہے ہیں۔ اس گھاس کو دیکھو کیسی سوکھی پھلی ہوتی جا رہی ہے۔“ مالکن پاؤں کے اشارے سے گھاس کو رگڑ رگڑ کر دکھانے لگی تو جیسے مفلس مالی کی آنکھوں میں امید و خوشی کی ایک کرن پھر جھلملائی۔

”ارے بیگم صاحبہ! کیسی بات کرتے ہو، ارے اس کو غذا ملے گا تو یہ ہرا ہو گا نا، جب تم پودوں، درختوں گھاس کو غذا نہیں دو گے تو وہ کیسے پھلے پھولے گا۔“ مالی گہری سوچ میں پڑتے ہوئے بولا۔
”ارے بیگم صاحبہ! اس میں کھاڈا لوتب کہیں جا کے یہ ہرا بھرا ہو گا۔ پھول پتے پھینکے گا، اس کو بھی غذا کی ضرورت ہے کہ نہیں ہماری تمہاری طرح اسے بھی پانی غذا کی ضرورت ہے۔ بیگم صاحبہ تم ایسا کرو مجھے پانچ سو روپے دو میں.....“

وہ اپنی دانست میں بیگم صاحبہ پر بہت بڑا انکشاف کرتے ہوئے مطلب کی بات پر آ گیا کہ تب ہی بیگم صاحبہ بیچ سے اس کی بات کاٹتے ہوئے غصیلے لہجے میں گویا ہوئیں۔

”ارے بابا! کیسی باتیں کر رہے ہو مالی، ابھی پرسوں تو میں نے گاڑی بھر کر کھاڈا ڈلوایا ہے۔ یہ نظر نہیں آ رہا تمہیں۔“ وہ گھاس اور کیاری میں پڑی کھاڈکی طرف اشارہ کرتے ہوئے مالی کے ارمانوں



- ☆ اکثر قارئین کی شکایات کے مطابق کہ یہاں پر پرچہ دستیاب نہیں ہے۔
- ☆ ایجنٹ کی سہولت کے لیے پرچہ نہ ملنے کی صورت میں آپ ادارے سے رابطہ کریں۔
- ☆ اپنے شہر اور علاقے کا نام۔
- ☆ بک اشال کا نام جہاں پر پرچہ دستیاب نہیں ہے، ہو سکے تو بک اشال کا کنٹیکٹ نمبر لکھ کر ادارے کو بتائیں۔
- ☆ ہماری ہر ممکن کوشش ہوگی کہ ردا آپ کو بروقت مل سکے۔

رابطہ کریں

ردا پبلی کیشن

021-34535726

خط و کتابت کا پتہ:

129-D - بلاک 2

پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ سوسائٹی، کراچی

پراوس ڈال گئی۔

وہ مایوسانہ سے انداز میں گھاس میں پڑی کھاد کی طرف دیکھنے لگا کہ تب ہی اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کو امید کی ایک کرن جھلملائی۔

”یہ..... یہ کھاد..... مٹی بالکل بے کار سڑیل..... یہ تو بیگم صاحب گو بر کی کھاد ہے۔“ اس نے بیگم صاحبہ پر انکشاف کر کے جیسے اپنی دانست میں بہت بڑا تیر مارا۔

”بیگم صاحبہ! تم ہمیشہ میری ایک بات یاد رکھو۔ تم کھاد جب ڈلوادو تو خالص گٹر کا کھاد ڈلوادو، پھر دیکھنا کیسے لد کر پھل پھول آتے ہیں۔ اب تم یہ ناقص گو بر کا کھاد ڈلوادو گی تو پھول پتے تو مرجھا میں گے نہیں تو اور کیا ہوگا۔“

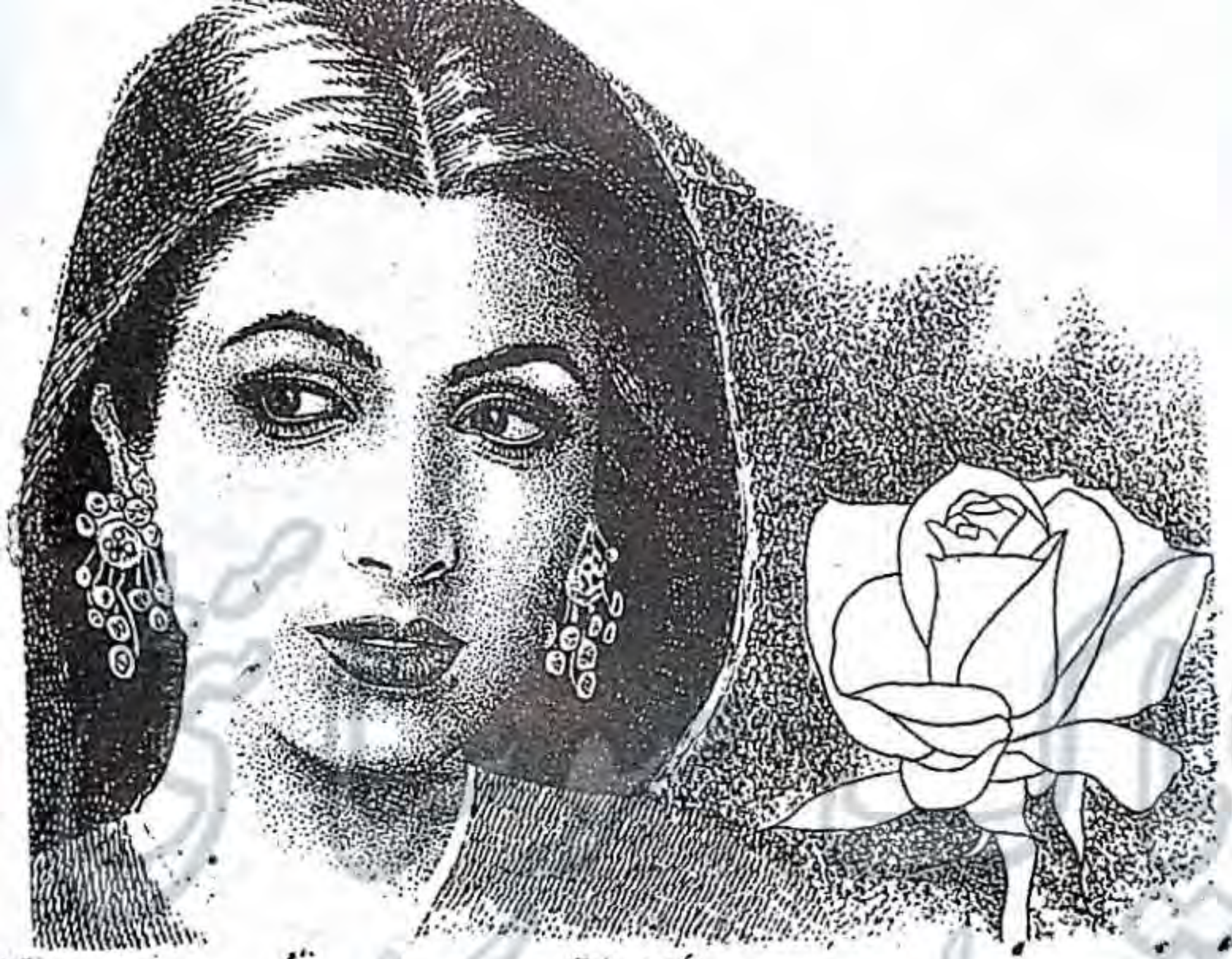
سیاہ قام مالی لہجے میں ڈھیروں اپنائیت بھرتے ہوئے گویا ہوا اور ریسرچ کے طور پر مٹھی بھر کھاد ہاتھ میں بھر کر اسے ابھی بڑا سامنے کھول کر پھانکنے ہی والا تھا کہ اچانک حیرت اور دکھ کے میری چیخ نکل گئی۔

”مالی! ذرا ایک منٹ کو برابر والے گیٹ پر آنا۔“ وہ میری زوردار آواز اور چیخ پر جلدی سے کھاد سے بھری مٹھی وہیں کیاری میں جھاڑتا تیزی سے گیٹ پر آ گیا۔

”مالی! ذرا یہ پھولوں کی کیاری دیکھ کر بتانا کہ اس میں کون سی اور کتنی کھاد ڈلوانی ہوگی۔“

دالان میں بنی ایک پھولوں کی پتلی سی کیاری کی طرف میں نے اشارہ کرتے ہوئے مالی سے پوچھا اور اس کا جواب سننے سے پہلے اس کے بوڑھے ہاتھ میں پانچ سو کا ایک کڑک نوٹ تھما دیا۔

”کل تم ایسا کرنا ایک بوری کھاد لا کر ڈال جانا۔“ وہ حیرت سے نوٹ کی طرف دیکھتا خوش خوش مست مست سا وہاں سے چل دیا اور مجھے یوں لگا جیسے میں نے اسے اس گندگی کا ڈھیر پھانکنے سے بچا کر اسے ہی نہیں اس کی سات نسلوں کو ہزاروں بیاریوں سے بچا لیا ہو۔ ☆



عائشہ ذوالفقار

سلسلہ وار ناولٹ

اڑ جا رہی تیری بدلی

ہم سے نہیں ملیں گے جھونکے ہوا کے ہیں
تم سے تراش لیں گے پتھر نظر میں ہیں

کیا چاہتے ہیں ہم لائف سے؟ زیادہ کچھ نہیں بس 21 تک کے منے منے دکھ سکھ بانٹنے کے لیے ایک اچھا سا دوست۔

28 تک کے سونے جیسے پل دونوں ہاتھوں سے لٹانے کے لیے 5 فگرز (ہندسوں) والی سیلری۔

50 تک کی میٹریاں چڑھنے کے لیے ایک باوقاساھی اور مرنے تک سکون سے جینے کے لیے پیار کرنے والے بچے۔

اور سب ہم لائف سے قرض نہیں مانگتے۔ یہ ہمارا حق ہوتا ہے اس پر مگر لائف یہ ہی نہیں دے پاتی۔

READING
Section



اور میں نے تو شاید کچھ زیادہ ہی مانگ لیا تھا اس سے بھی وہ مجھ سے بری طرح ناراض ہو گئی تھی۔

☆.....☆

”اویار حارث! دیکھیں یہ تو پھر ہنگ ہو گیا۔“ سلمان نے اپنے سے آگے سیڑھیاں اترتے حارث کو کہا تھا۔
 ”واٹ..... اس سے تو بہتر تھا کہ تو Nokia 1100 لے لیتا، وہ کم از کم تجھے چلانا تو آتا۔“ حارث نے
 اس کے ہاتھوں سے Dany Tab چھینا تھا۔

”اولس میں تو آپ بہت تنگ ہوں اس سے، جیب وچ وی نہیں آندا۔“ سلمان واقعی تنگ تھا۔ حارث نے
 گراؤنڈ تک آتے آتے اسے ٹھیک کر دیا۔

”تو بس اس سے کال کیا کرو اور سنا کر، اتنا ہی بہت ہے میرے بیٹے۔“ ٹیبلٹ سلمان کے ہاتھ میں دیتا وہ
 گراؤنڈ میں اترتا۔ لاکھ اس نے عمیر کے گروپ کے پاس سے چپ چاپ گزرنے کی کوشش کی مگر عمیر کو بھی
 3000 لڑکوں میں بس وہی پسند تھا۔ سو با آواز بلند اسے چھیڑ لیا۔

”یہ محفل جو آج ججی ہے اس محفل میں ہے کوئی ہم سے“

وہ یکدم رکا۔

قسط نمبر 1

READING
Section

”ہارنا ہی ہے نا تمہیں۔ یہ اتنے سارے بیٹھے ہیں کسی سے بھی ہار جاؤ، میرا وقت ہی برباد کیوں کرنا ہے۔“
عمیر قبہ لگا کر ہنستا تھا۔

”کیونکہ جانی، تو ہی تو میری انسپریشن ہے۔“ حارث نے کندھے سے بیگ اتار کے سلمان کے بازو پر لڑکایا۔

”پکڑا سے۔“ عمیر نے مسکراتے ہوئے اپنے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ حارث بیٹھ گیا۔
دونوں نے مضبوطی سے ایک دوسرے کے ہاتھ کو تھام لیا۔

”چل حمزہ! شروع کر۔“ ان دونوں کے گرد کافی جھگھٹا لگ گیا تھا۔ دونوں ہی برابر تھے۔ اکڑ میں، ضد میں اور دشمنی میں۔ حمزہ کو بیٹھے بیٹھے جمائیاں آنے لگیں۔ سلمان نے پھر سے Tab سے کوئی پن گالے لیا تھا۔ آخر پچیس منٹ بعد حارث نے اس کا بازو گرادیا۔

”مل گئی انسپریشن۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”بالکل ایک چوکیدار کے بیٹے میں اور کچھ ہونہ ہو، ہمت و حوصلہ ضرور ہوتا ہے۔ ہے نا۔“ حارث کی آنکھیں سرخ ہوئیں تھیں۔

”اگر ہار کوللکار نے کی ہمت رکھتے ہو تو برداشت کرنا بھی سیکھو۔“ وہ بیگ کندھے پر ڈالتے ہوئے چل دیا۔
سلمان ایک دم اس کے پیچھے بھاگا۔

”دیکھیں حارث! اینوں فر کچھ ہو گیا۔“ حارث، عمیر، سلمان اور حمزہ، چاروں گورنمنٹ کالج میں بی ایس سی کے اسٹوڈنٹس تھے۔ حارث اور عمیر کی یہ دشمنی بہت پرانی تھی مگر اس کی وجہ شاید وہ دونوں خود بھی نہیں جانتے تھے۔
”بائیو لیب فیسٹ ایئر سے انی پڑی تھی۔ شیلیفوں پر بھی لڑکیاں تھنسی ہوئی تھیں۔ آج F.Sc فیسٹ ایئر کی پہلی بائیو کلاس تھی۔“

”ماری! میں نے سنا ہے بڑی سخت ہیں میم رخسانہ، تھپڑ مار دیتی ہیں۔“ نمرہ پکھلی جا رہی تھی۔
”دفع اتنا ہی ڈر لگ رہا ہے تو یہ رد امونی کے پیچھے چھپ جا۔“ مجھے غصہ آ گیا۔ میم رخسانہ کی انٹری ہی بڑی ہولناک تھی۔ سیکنڈ ایئر کی کسی لڑکی کو گردن سے پکڑے باقاعدہ گھسیٹتے ہوئے اندر لے کر آئیں۔ ہر طرف ہن ڈراپ سائنس۔

”خبردار! جو آئندہ کلاس بنک کی تو نکمیاں ٹیوشنز پڑھ کر سمجھتی ہیں کہ بس اب کالج میں پڑھنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔“ وہ لڑکی ان کے جھٹکے سے ہی دروازہ پار کر گئی۔

”تم لوگوں میں سے کون کون اکیڈمیوں میں پڑھتا ہے کھڑا ہو جائے۔“
ایک نہ دو، پوری کلاس کھڑی ہو گئی۔ میم رخسانہ کا مہر کر 100 تک پہنچا اور تھر ما میٹر چھن سے ٹوٹ گیا۔
”یہاں کالج میں پڑھائی نہیں ہوتی کیا جو ماں باپ کا پیسہ اجاڑتی ہو، یہاں آ کر پڑھا کرو۔ اور نہ جانے کیا کچھ۔“

”جب تو نے نہیں پڑھانا تو اکیڈمیوں میں ہی پڑھنا ہے نا۔“ ردا میرے کان میں گھسی تھی تیس منٹ بعد آزادی ملی۔

”سیٹ ڈاؤن۔“ سب ایک دم بیٹھیں تو یکدم شور ہوا، دوسرا تھر ما میٹر بھی ٹوٹ گیا اور ایک بار پھر کمٹیوں ذیلیوں کی گردان شروع ہوئی ایسے میں ”اول اول“ کی باریک سی آواز سنانے میں ابھری۔

”کون جاہل ہے یہ؟“ اب کے آواز میرے قریب سے ابھری۔
 ”اسٹینڈ اپ..... ایڈیٹ۔“ تیسرا تھرما میٹر ٹوٹنے کے قریب تھا، میں نے سیٹ کر دیا۔ نمرہ، ردا کی بغل میں
 چھپی سسکیاں بھر رہی تھی۔ پوری کلاس کے چھت پھاڑتے تھے اور تیسرا بھی ٹوٹ گیا تھا۔

☆.....☆

”باہر سے لائٹ بند نہ کرنا۔“ کہتے ہوئے میں اسٹور میں داخل ہوئی تھی اور اگلے ہی لمحے میرے پیچھے یکدم
 دروازہ بند، لائٹ بند۔ فلک شکاف چیخ مارتے ہوئے میں واپس مڑی تھی۔
 ”عارش! ذلیل کمنے دروازہ کھول۔“ کہتے ہوئے میں نے زور سے دروازہ دھڑا دھڑایا تھا۔ عارش ایکدم
 دروازہ کھولتے ہوئے چھت پر بھاگا۔

”ہمت ہے تو وہیں رک جا۔“ کہتے ہوئے میں نے عارش کی طرف جوتا اچھالا۔

”جوتانہ ماریں، جوتانہ.....“ مگر میرا دوسرا جوتا عارش کی کمر سینک گیا۔

”دروازہ کیوں بند کیا؟“ عارش پلٹا اور مجھ پر جھپٹ پڑا۔

”اوائے دفع ہونوں، چھت پر نہ لڑو۔“ اماں نے نیچے سے آواز لگائی تھی۔

”حاری! دیکھ وہ کیا۔“ عارش کے ہاتھوں سے اپنے بال چھڑواتے ہوئے میں نے اس کی انگلی کی سمت میں

دیکھا۔ دو چھت چھوڑ کر وہ میرے گھر کی چھت پر کھڑا تھا۔

”ہائے اس کے بالوں کو کیا ہوا؟“ میں یکدم ہنسی۔

”کل شب رات تھی ناں ایک پٹاخہ اس نے اپنے بالوں میں چلا لیا ہوگا۔“ عارش ہنسا تھا۔ میں اس کے

کندھے پر ہاتھ مار کے ہنس پڑی بس۔

اتنی ہی دیر چلتی تھیں میری اور عارش کی لڑائیاں۔ پل میں نشوں فیشوں اور پل میں ہی ہاہا۔ مجھ سے چار

سیال چھوٹا تھا وہ مگر یاری چار ہزار فٹ اونچے پہاڑ سے زیادہ بلند اور چار ہزار فٹ گہرے سمندر سے زیادہ گہری

تھی۔

میرا مسئلہ..... اس کا مسئلہ۔

میری خوشی..... اس کی خوشی۔

میرے آنسو..... سمجھو اس کی آنکھوں سے نکل رہے ہیں۔

اس کی غلطی..... سمجھو ڈانٹ مجھے پڑی ہے۔

ہر اٹنے سیدھے کام میں ہم دونوں ساتھ ہوتے تھے۔ چاہے وہ کوئی غلط بات پر بحث کرنے کا ہو یا غلط
 فرمائشوں پر ضد کرنے کا۔ رات کو ایک ہی رضائی میں گھس کے ڈیراؤنی موویز دیکھنے کا ہو یا چھپ چھپ کر پینڈ
 فری لگا کر گانے سننے کا، بس ایک فرق تھا ہم دونوں میں، میں ذہین تھی اور عارش بہت ذہین تھا۔

☆.....☆

وہ جیسے پہلے ہی کارڈ بور سے باہر نکلا، سامنے سے تیزی سے سیرھیاں چڑھتے عمیر سے ٹکرا گیا۔

”دیکھ کر چلا کر مسٹر سشمس..... اب ہٹو۔“ عمیر کو جلدی تھی۔

”میں کیوں ہٹوں سائیڈ سے گزر جاؤ، پہلو ان تو ہو نہیں تم۔“ حارث کے لہجے کی تمام سختی صرف عمیر کے لیے

تھی۔

ردا ڈائجسٹ [111] دسمبر 2015ء

READING
Section

”ناؤ یووانٹ ٹو فائیٹ وومی (اب تمہیں لڑائی کرنی ہے؟)“ حارث نے کندھے اچکائے۔
 ”سنو! اکڑ کی بھی ایک حد ہوتی ہے، ایسا نہ ہو کہ تمہاری اکڑ تمہیں تمہاری اوقات سے ہی باہر نکال دے۔“
 عمیر کو غصہ آیا۔

”آج تم یہ بھی بتا ہی دو کہ میری اوقات کیا ہے؟“ حارث آگے کو آیا تھا۔
 ”اوقات تو خیر تمہاری میرے جوتے سیدھے کرنے کی بھی نہیں ہے نہ کہ لڑائی کرو۔“ عمیر کی مسکراہٹ
 حارث کو سلگا گئی۔

”مگر دیکھ لو، تمہارا گریبان پکڑا تھا۔“ عمیر نے پوری قوت سے اسے تھپڑ مارا اور بس..... دونوں وہیں
 بیٹھیں، پر ہی گتھم گتھا ہو گئے۔ ہوش تپ آیا جب گارڈ اٹھا کر پرنسپل آفس میں چھوڑ آیا، ٹوٹے ہوئے بٹن،
 پتھرے بال اور خون رستے ہونٹ..... چستی صاحب دونوں کو دیکھ کر رہ گئے۔

”دادو میری ہمت کو جو چار سال سے تم دونوں کو ایک ہی کالج میں رکھا ہوا ہے اور جب تم دونوں صحیح سلامت
 یہاں سے فارغ ہو جاؤ گے تو میں اپنا نام کنیز بک آف ریکارڈ میں بھیجوں گا۔“ دونوں چپ تھے۔
 ”ایسا کرتے ہیں تم دونوں میں ریسٹنگ کا ایک مقابلہ رکھواتے ہیں۔ ایک مرجائے گا ایک بیچ جائے گا۔
 فائدہ ہی فائدہ سکون ہی سکون۔“

بیس منٹ تک ہوتی رہی۔

”ہڈ وی گوناؤ۔ (کیا اب ہم جائیں)۔“ حارث نے بیزاری سے پوچھا۔
 ”مجھ سے زیادہ اہم وقت نہیں ہے تمہارا سمجھے۔ شوکت صاحب کو بلایا ہے میں نے۔“
 ”اوہ نو.....“ عمیر بے بس سا ہو گیا یعنی ابھی مزید ہونا تھی۔

☆.....☆

دی اشار سائنس اکیڈمی ہمارے شہر کی واحد بیسٹ سائنس اکیڈمی عالیہ نے یہ اکیڈمی اس لیے جوائن کی کیونکہ
 اس کے چچا یہاں تھرڈ شیئر ہولڈر تھے۔ نمرہ نے اس لیے جوائن کی کہ اسے اس کے بھائی اور بہن نے کہا تھا میں
 نے اکیڈمی کا نام سن کر اور رداموٹی نے میری وجہ سے۔
 ”حاری باقی سب تو ٹھیک ہے یہاں مگر فزکس کی بینڈنج جاتی ہے۔ سر شوکت کا جیٹ سر کے اوپر سے گزر جاتا
 ہے، بھائی بتا رہے تھے۔“ نمرہ صرف ایک کام ٹھیک سے کرتی تھی۔ ڈرنا اور ڈرانا (سیکریٹ۔ میں نے اور ردا
 موٹی نے اس کا نام ڈراؤنی رکھ دیا تھا)۔

”ہاں ٹھیک کہہ رہی ہے یہ F.SC کے بچوں کو ایم فل لیول کا پڑھاتے ہیں۔ خاک سمجھ نہیں آتا۔“ عالیہ بولی
 تھی۔ میری بس ہو گئی۔

”بات سن میری۔ مجھے تو یہ سب پتا نہیں تھا اس لیے یہاں آ گئی۔ تم دونوں کو تو سب پتا تھا ناں پھر کیوں آئیں
 یہاں۔“ عالیہ نے آہ بھری۔

”اب اپنے چچا کی اکیڈمی میں، میں ہی نہیں بڑھوں گی تو کون پڑے گا۔“ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

”بہت سست ہیں سر شوکت، سلیپس بھی بمشکل ختم ہوتا ہے۔“

”کلاس میں بہت دیر سے آتے ہیں۔“

”چھٹیاں بہت کرتے ہیں۔“ یہ..... وہ..... فلاں..... فلاں.....

رواڈ انجسٹ [112] دسمبر 2015ء

READING
Section

اور ان کی پہلی کلاس میں ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ سب غلط نہیں تھا۔ سولہ آنے درست تھا۔ ان کے الفاظ اتنا اونچا اڑ رہے تھے کہ میں تو ایک بھی نہ پکڑ سکی۔ میں منٹ میں صرف فزکس کی تعریف ہی سمجھایاے وہ۔

حاری میری بات مان۔ نہیں اور چلے جاتے ہیں۔ یہاں رہے تو پاس بھی نہیں ہوں گے۔ ”رداموٹی بھی پریشان ہو گئی مگر میری شروع سے ہی ایک بری عادت تھی۔ جو کام نہیں ہو سکتا وہی کرنا ہے۔ دو تین ہفتوں میں ہی سر شوکت کو سمجھ گئی میں، ان کے مطابق۔

”آسان چیز کو مشکل کر کے بڑھو۔ مشکل کو مزید مشکل کر کے پڑھو تو پھر جو سب سے زیادہ مشکل ہو گا وہ مشکل نہیں لگے گا۔“ سر شوکت مشکل پسند تھے۔ اب انہوں نے تو میرے جیسا بننا نہیں تھا سو میں ان جیسی بن گئی۔ وہ بورڈ پر ٹائپ لکھ کر نہیں پڑھاتے تھے بلکہ سب کچھ پڑھا کر ٹائپ لکھتے تھے۔ پہلے دن کلاس میں کل 38 لڑکیاں تھیں۔ ہفتے بعد 17 رہ گئیں۔ پہلا ٹیسٹ ہوا تو وہ میں نے وہیں پھاڑ دیا۔ 15 میں سے 07 نمبر۔

”میں بھائی سے کیا کہوں گی؟“ نمرہ سسکیاں بھر رہی تھی۔ رداموٹی پُرسکون تھی کیونکہ اس کے مجھ سے صرف دو کم تھے۔ سب سے زیادہ 09 تھے بس۔“

”مجھے لگتا ہے یہ ٹیسٹ سرنے نہیں افلاطون نے بتایا تھا۔“ عالیہ بولی۔

”وہ کون ہے؟ کہاں پڑھاتا ہے۔“ نمرہ بولی تھی۔

”اب حاری، نمرہ کے کتنے ہیں۔“ نمرہ کی بڑی بہن ناعمہ ہم سے ایک کلاس آگے تھی۔ بقول نمرہ کے ”میری سوکن ہے یہ۔“ نمرہ جھٹ رداموٹی کی بغل میں جا چھپی۔

”او کوئی نہیں، میرا تو انڈہ آیا تھا پہلے ٹیسٹ میں اب 15، 16 آجاتے ہیں۔“ ناعمہ نے دلا سہ دیا تھا۔

☆.....☆

”بھائی! امی بلا رہی ہیں۔“ عالیہ اسے آواز دے کر اپنے کمرے میں گھس گئی۔ بیزار سامنے بنائے وہ نیچے آیا تھا۔

”پوچھو اس سے صرف اس کی شکایتیں سننے کے لیے تو نہیں جاتا میں کالج۔“ شوکت راؤ اسے دیکھتے ہی پھٹ پڑے۔ ثمینہ راؤ اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

”اتنا ہی اسے سید ہونے کا زعم ہے تو بات ہی نہ کیا کرے اس سے، کیوں لیتا ہے اس سے پنکا؟“ عمیر ہولے سے بولا۔

”ہمیشہ میں ہی نہیں لیتا۔“ شوکت راؤ زور سے بولے۔

”تم ہی لیتے ہو، میں جانتا ہوں حارث کو، وہ تمہارے اکسانے پر بھڑکتا ہے۔“ عمیر چپ رہا۔

”دیکھیں بھابی! پروموشن کے بعد شاید میرا ٹرانسفر ہو جائے، جانے سے پہلے اپنا مقام اور اپنی سیٹ اسے دے کر جانا چاہتا ہوں، مجھے لگتا ہے بس ایک دو سال اور پھر دی اٹارٹوٹ ہی جانی ہے۔“ ثمینہ راؤ نے بے بسی اے عمیر کی طرف دیکھا۔ متوقع نصیحتوں کے پیش نظر وہ پہلے ہی بول اٹھا۔

”اچھا سوری، آئندہ خیال رکھوں گا، سوری۔“ کہہ کر اٹھ گیا۔ جب کہ چہرے پر بڑا بڑا لکھا ہوا تھا۔

”میری مرضی جو مرضی کروں۔“ ثمینہ راؤ، شوکت راؤ کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔

☆.....☆

”حارث یار! میں نے ٹیبلٹ بیچ دیا یہ لے لیا۔“ حارث حمزہ کو ڈھونڈتا ہوا باہر آیا تھا جب سلمان نے آ کے

خوش خبری سنائی۔

”اوٹھینکس برو۔“ حارث ہنسا تھا۔ حمزہ اسے گراؤنڈ میں نظر آ گیا۔

”رضوی صاحب کے نوٹس کہاں سے مل رہے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”حسن فوٹو شاپ سے۔“ حمزہ بولا۔

”جھینکس۔“ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ آگے بڑھنے لگا تھا جب عمیر پر نظر پڑی۔ وہ نیٹ کے

پاس کھڑا تھا۔

”آج نہیں یعنی انسپریشن؟“ حارث کو معلوم تھا کہ عمیر بیڈ منٹن میں اچھا ہے مگر پھر بھی اسے جا کے چھیڑ دیا۔

عمیر نے ہنستے ہوئے ریکٹ اس کی طرف اچھالا تھا۔

”پھر لوگ کہتے ہیں کہ میں پنگا لیتا ہوں۔“ حارث نیٹ کے دوسری طرف آ گیا۔

”یار! ان دونوں کا کھیل بڑا بورنگ ہوتا ہے لسا ہی لسا۔“ حمزہ بولا تھا۔

”ہاں پر دیکھنا پڑتا ہے۔ کیا خبر کب کھیل سے دنگل ہو جائے۔“ سلمان وہیں بیٹھ گیا۔

”آگے کیا کرنا ہے حمزہ؟“ سلمان نے پوچھا۔

”M.sc Physics لیکن لاہور سے۔“ حمزہ بولا۔

”عمیر نے بھی یہ ہی کرنا ہے پر وہ شاید فیصل آباد سے کرے۔“ سلمان نے سر ہلایا۔

”میں اور حارث بھی فیصل آباد ہی جائیں گے۔ حارث تو شاید کیمسٹری میں کرے گا۔“ حمزہ چونکا۔

”یعنی پھر دونوں اکٹھے ہو جائیں گے۔ ایک ہی یونیورسٹی میں۔“ سلمان نے کندھے اچکائے۔

”یونیورسٹی میں تو ویسے بھی اتنی سختی نہیں ہوتی، ان دونوں نے اور خود سر ہو جانا ہے۔“ حمزہ دونوں کی طرف

دیکھ کر بولا۔

”میں سوچتا ہوں ابھی کچھ ہوا نہیں ہے دونوں کے بیچ تو نفرت کا یہ حال ہے اگر خدا نخواستہ کبھی کچھ ہو گیا تو کیا

ہوگا۔“ سلمان بولا تھا۔ حمزہ نے بھی سر ہلایا۔ عمیر جیت گیا تھا۔ حارث ریکٹ اس کی طرف اچھالتے ہوئے

سلمان کی طرف آ گیا۔

B.Sc کے بعد حمزہ تو پنجاب یونیورسٹی چلا گیا۔ جب کہ عمیر، حارث اور سلمان، تینوں نے فیصل آباد یونیورسٹی

میں ایڈمیشن لے لیا۔ جانے سے پہلے شوکت راؤ نے خاص طور پر حارث کو اپنے پاس بلایا۔

”جب ایک ہی ماں کے دو بچوں میں جھگڑا ہوتا ہے ناں تو وہ اس کو سمجھاتی ہے جس کے بارے میں اسے یقین

ہوتا ہے کہ وہ سمجھ جائے گا۔ میں آج تمہارا باپ بن کر تمہیں سمجھا رہا ہوں، نہ خود سے آگے بڑھنا اور نہ وہ بلائے تو

آگے بڑھنا۔“ حارث نے سر ہلایا تھا۔

☆.....☆

”یار ایسا لگتا ہے مجھے کہ جب سر پڑھا رہے ہوتے ہیں تو میرا سر اوپر سے کھل جاتا ہے اور جب چپ ہوتے

ہیں تو بند ہو جاتا ہے۔ سب کچھ اندر اتر جاتا ہے۔“ میری بات نمبرہ کو انتہائی بری لگی۔

”اوہو، تیرا دماغ نہ ہوا ماڈل ہو گیا۔ جب چاہا کھل گیا جب چاہا بند ہو گیا۔“ ردا موٹی آگے کو آئی تھی۔

”حاری میرے ساتھ بھی ایسے ہی ہوتا ہوگا۔ ہے ناں۔“ میں نے اسے حوصلہ دیا تھا۔ خوش ہو گئی ردا (موٹی)،

لوگ کہتے ہیں کہ کالج لائف نہیں بھولتی۔ یونیورسٹی لائف نہیں بھولتی وغیرہ وغیرہ۔ مگر میں مجھے اکیڈمی لائف نہیں

ردا ڈائجسٹ 114 دسمبر 2015ء

READING
Section

بھولتی۔ F.Sc کے دو سالوں میں سیکھا کہ شوق کیا ہوتا ہے۔ لگن کسے کہتے ہیں اور لگن کس طرح شوق کو جنون بنا دیتی ہے اور جو چیز شوق بن جائے وہ پھر مشکل نہیں رہتی ہم دو لڑکیوں کے ساتھ بھی یہ ہی ہوا۔ فزکس کے فائنل پیپر میں ہم سب قہقہے لگا کر ہنس رہی تھیں۔ سر شوکت کے افلاطون کے بنائے ٹیسٹ دے دے کر وہ پیر حلوہ لگ رہا تھا۔ F.Sc کے بعد آگے کا مسئلہ۔ میرے اندر کہیں خواہش تھی ڈاکٹر بننے کی مگر مسائل اتنے تھے کہ میں نے وہ خواہش مضبوطی سے اندر ہی دبا دی۔

”انٹری ٹیسٹ تو دے لے۔“ اماں نے بہت اصرار کیا۔

”رہنے دیں۔ نہ کلیئر ہوا تو دکھ ہوگا لیکن کلیئر ہو گیا تو زیادہ دکھ ہوگا۔ یہ عارش دے گا انٹری ٹیسٹ انشاء اللہ۔ یہ بنے گا ڈاکٹر۔“ میں، نمبرہ اس کی بہن ناعمہ اور ناعمہ کی ڈھیر ساری فرینڈز رہ گئیں۔ رول موٹی اور عالیہ کی سائنس پڑھ پڑھ کر شاید بس ہو گئی تھی۔ سو دونوں نے وہیں بی اے میں ایڈمیشن لے لیا۔ مجھے اور نمبرہ ڈراؤنی کو روز ناعمہ اور اس کی سہیلیوں کے ساتھ ڈسٹرکٹ کالج جانا پڑتا۔ میں ان سب کو صرف نمبرہ ڈراؤنی کی وجہ سے برداشت کرتی ورنہ وہ سب پھونکنے کے لائق تھیں۔ اس دن بھی صبح صبح تیار ہو کر جب نمبرہ ڈراؤنی کے گھر پہنچی تو ناعمہ ابھی تیار ہو رہی تھی۔ مجھے بازو سے کھینچ کے اندرونی کمرے میں لے گئی۔

”سنو حاری! ہمیں ناعمہ کی فرینڈز سے سوری کرنی ہے۔ ٹھیک!“ مجھے ہنکے لگ گئے۔

”دفع میری تو جوتی بھی معافی نہ مانگے ان خدائی مخلوٹوں سے اور کس خوشی میں مانگنی ہے معافی۔“ نمبرہ اور آگے کو آئی۔

”کل ہم انہیں ساتھ لیے بغیر آگئے ناں تو۔“ میں نے ایک دم نمبرہ کی بات کاٹی۔

”اوہیلو! آدھا گھنٹہ انتظار کیا تھا ہم نے ان کا ان کی تو مٹر کشتیاں ہی ختم نہیں ہوتیں۔ تمہاری بہن کی دوستیں ہیں ناں تو تم مانگو معافی۔ میں تو نہیں مانگوں گی بلکہ ایک سکینڈ، کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں بھی سیریس ہونے کی، تم میری دوست ہونہ کہ ان چڑیلوں کی۔“ میری آواز اونچی ہو گئی۔

”آہستہ بولو۔ حارث بھائی سوری ہے ہیں۔“ نمبرہ نے میرے منہ پر ہاتھ رکھا۔

”اب تو اٹھ گیا ہوں میں۔“ حارث نے کروٹ لی۔ ”اس کے چہرے کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ اس نے میری باتیں سن لی تھیں۔“

”سوری جی! آپ کو اٹھا دیا ویری سوری۔“ اب اتنے مینرز تو آتے تھے مجھے۔

”نو پراہلم۔“ وہ اٹھ گیا تھا۔

”کب جارے ہیں آپ فیصل آباد؟“ میں نے پوچھا۔

”رسوں۔“ وہ مسکرایا۔

”چلیں جی۔ بیسٹ آف لک۔“ ناعمہ تیار ہو گئی تھی اور اس کی چچیاں بھی آگئی تھیں۔ سو نمبرہ مجھے باہر لے آئی۔

☆.....☆

یونیورسٹی میں لڑکے کے ہوں یا لڑکیاں، اکثر کولت ضرور ہی لگ جاتی ہے گرل فرینڈ اور بوائے فرینڈ کی۔ حارث نے چند ایک بنا میں۔ عمیر نے بے تحاشا بنا میں اور ان بے تحاشا دوستیوں میں ایک نہ ایک شدت اختیار کر رہی جاتی ہے جسے ہم ”کرش“ بھی کہتے ہیں۔ علیزہ بیگ۔ عمیر کا پہلا کرش۔ وہ ان چند لڑکیوں میں سے تھی جو خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین اور عقلمند بھی ہوتی ہیں۔ عمیر اور علیزہ کی دوستی کافی آگے تک نکل گئی۔ اس

ردا ڈائجسٹ [115] دسمبر 2015ء

READING
Section

دن بھی عمیر اور وہ گروپ کے ساتھ بیٹھے اسائنمنٹ بنا رہے تھے جب اس کی نظر حارث پر پڑی۔ وہ کسی کام سے فزکس ڈپارٹمنٹ آیا تھا۔

”عمیر یہ ہی ہے نا، جس کے الیکٹرونکس میں ہم دونوں سے زیادہ مارکس ہیں۔“ علیزہ نے پوچھا۔
 ”ہاں، آجاتا ہے یہ کبھی کبھار اوقات سے باہر۔“ شاید کافی دن ہو گئے تھے ان دونوں کو پنگالیے۔ تبھی جب حارث پاس سے گزرا تو عمیر نے اسے چھیڑ لیا۔

”حارث جانی! یہ علیزہ بڑی تعریف کر رہی تھی تمہاری۔“ حارث رک گیا۔
 ”میں نے بڑی مشکل سے روکا اسے، کہاں پتا ہے اسے کہ چھوٹے لوگوں کو بڑے لوگوں کی تعریفیں ہضم نہیں ہوتیں۔“ عمیر کو اندازہ نہ ہوا کہ وہ کتنی بڑی غلطی کر رہا ہے۔

”اور تم ٹھہرے ایک چوکیدار کی اولاد۔ خواجواہ ہمت دکھانا تو ویسے بھی تمہارے خون میں ہے۔“ حارث نے چپ چاپ آگے بڑھنا چاہا مگر عمیر کی آواز نے اس کے قدم روک دیئے۔

”پتا ہے علیزہ! بڑی محنت سے پڑھایا ہے اس کے باپ نے اسے۔ پارٹ ٹائم بیرہ گیری کر کے ہم لوگوں کے آگے کھانے کے برتن سجایا کرتا تھا اس کا باپ، میں اسے وقتاً فوقتاً اس کی اوقات اسی لیے یاد کرواتا رہتا ہوں کہ کہیں یہ اپنے باپ کی محنت کو نہ بھول جائے۔“ حارث نے نہ جانے کیسے اپنا غصہ دبایا تھا۔

”کاش..... جو وعدہ مجھ سے لیا گیا ہے وہ تم سے بھی لیا گیا ہوتا۔“ وہ کہہ کر رک نہیں۔ علیزہ، عمیر کے روکنے کے باوجود اس کے پیچھے آئی تھی۔

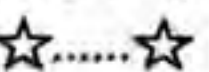
”لیسن ایم سوری۔“ وہ ایک دم مڑا۔
 ”بٹ وائے؟“ حارث حیرانی سے بولا۔

”وہ سب آپ نے تو مجھ سے نہیں کہا۔“ علیزہ چند لمحوں بعد بولی۔
 ”مگر کہا گیا تو میرے سامنے ہے نا۔“ حارث مسکرایا۔

”رہنے دیں علیزہ جی! جب کہنے والے کو پرواہ نہیں ہے تو آپ کیوں شرمندہ ہو رہی ہیں۔ اس اوکے۔“ وہ کہہ کے آگے بڑھ گیا۔



F.Sc جتنے مزے سے کی۔ B.Sc نے اتنا رلا دیا۔ مشکل، مصیبت، پریشانی وغیرہ وغیرہ کا جو ملک شیک بنتا ہے وہ بھی بی ایس سی سے آسان ہوتا ہوگا۔ ایسے ٹھونسا ہوا ہے سلیپس کتابوں میں جیسے پڑھنے والے نیوٹن کے لگتے گتے ہیں۔ اوپر سے سونے پر سہا گایہ ہوا کہ وہاں فزکس اور میتھ کی کل چھ ٹیچرز تھیں اور ایک سے بڑھ کے ایک۔ کسی کی آواز نہ نکلتی کسی کی کانوں میں اتر جانی۔ پچیس تیس سالوں سے بڑھا بڑھا کے وہ جیسے خود بھی تنگ آچکی تھیں۔ میں نے پوری زندگی میں کبھی اتنا نہیں بڑھا جتنا بی ایس سی میں۔ کبھی فزکس کو یاد نہیں کیا، کبھی اپنے نوٹس نہیں بنائے۔ کبھی راتوں کو جاگ کر نہیں پڑھا۔ کبھی پیپر ز والی رات کتاب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ پیپر ز سے چار گھنٹے پہلے کتاب چھوڑ دیتی تھی میں مگر بی ایس سی..... اس نے سب کچھ کروا لیا۔ بے تحاشا پیپر ز اور بے تحاشا پریکٹس..... خدا خدا کر کے ختم ہوئے نوبت یہ آگئی تھی کہ میں صرف پاس ہو جانے کی دعائیں کیا کرتی تھی۔



اس دن حارث کو ہلکا ہلکا بخار تھا۔

”حارث! اٹھ کھانا کھا کے آتے ہیں۔“ سلمان نے اس کا کندھا ہلایا۔ رات کے نونج رہے تھے۔

”تو جامیر اڈل نہیں کر رہا۔“ اس نے کروٹ لی۔

”حارث! چپ چاپ اٹھ جا، صبح سے یوں ہی پڑا ہے۔ اٹھ میس سے ہی کھا آتے ہیں۔ باہر نہیں جاتے۔“

سلمان نے بمشکل اسے اٹھایا۔ میس روم میں کافی رش تھا۔

”او بھاجی کی پکایا آج۔“ سلمان نے پوچھا تھا۔

”بھنڈی اور شامی انڈہ۔“ حارث تپ گیا اور ان بھنڈی تو ریوں کے علاوہ کچھ نہیں ملتا تھے۔“ پکانے والا

بھی بول پڑا۔

”سبزیوں سے آپ کو پرابلم ہے جی۔ گوشت سے انہیں۔ روز چاول بھی نہیں کھانے، مجھے بتاؤ کہ میں کدھر

جاؤں۔“ اس سے پہلے کہ حارث کچھ بولتا۔ عمیر اس کے برابر آ کر کھڑا ہو گیا۔

”چہ چہ..... حارث جانی کو کچھ نہیں ملا کھانے کو، اچھا کھانا تو باہر سے ہی ملے گا ناں اور اگر پیسوں کا مسئلہ

ہے، نو پرابلم مجھ سے لے لینا۔“ حارث پہلے ہی اپ سیٹ تھا۔

”اتنا ہی بڑا دل ہے ناں تمہارا تو مجھے دیکھ کے زبان بند رکھنا سیکھو۔“ حارث کی آواز اونچی ہو گئی۔

”چل چھوڑ حارث۔“ سلمان بیچ میں آیا تھا۔

”اور تم مجھ سے تمیز سے بات کرنا سیکھو ورنہ۔“ حارث نے ایک دم پلٹ کے اسے بات بھی مکمل نہ کرنے دی۔

”ورنہ کیا..... آج بتا ہی دو کہ ورنہ کیا؟“ عمیر تن کے اس کے سامنے آیا تھا۔

”ورنہ وہ حشر کروں گا کہ واپس جانے کے قابل بھی نہیں رہو گے چوکیدار کی نسل۔“ شوکت راؤ سے کیا وعدہ

ایک لمحے میں توڑ کے حارث، عمیر پر جھپٹا تھا۔

”تم مجھے ہاتھ بھی لگا کر دکھاؤ ذلیل انسان۔“ دونوں وحشیوں کی طرح لڑتے ہوئے پاس پڑی میز پر گرے

تھے۔ سلمان دونوں کو روکتا رہ گیا۔ بمشکل دونوں کو الگ کیا گیا۔

”تمہارا جو دماغ عرش پر پہنچا ہوا ہے ناں اسے نیچے اتار کے دم لوں گا میں۔“ حارث جاتے جاتے بھی باز نہ

آیا تھا۔

☆.....☆

”حارث تو بچہ تو نہیں ہے کہ میں تجھے سمجھاؤں۔ گندگی میں ہاتھ ڈالو تو چھینٹے اپنے اوپر ہی آتے ہیں۔“

سلمان اس کے ماتھے پر سنی پلاسٹ لگاتے ہوئے بولا تھا۔

”میں نہ بھی ڈالوں تو چھینٹے میرے اوپر ہی آتے ہیں۔“ وہ غصے سے بولا۔

”کدھر گئی تیری وہ مشہور زمانہ قوت برداشت۔“ سلمان نے پوچھا۔

”کہیں نہیں گئی، یہیں ہے سارے زمانے کی بات برداشت کر سکتا ہوں میں مگر اس کی نہیں۔“ حارث نے

سلمان کے ہاتھوں سے اپنا بازو چھڑوایا اور کھڑا ہو گیا۔

”اب کہاں جا رہا ہے؟“ سلمان اس کے پیچھے ہی باہر آیا۔ حارث ریٹنگ پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

”یہاں.....“ اس نے سلمان کے دل پر انگلی رکھی۔

”یہاں زخم لگاتا ہے وہ میرے سیدھی یہاں آ کے لگتی ہیں اس کی باتیں۔ ہر بات میں ابو کی جاب کا ذکر

ہے۔ ہر بات میں اوقات یاد دلاتا ہے۔“ غصے سے حارث کے ہونٹ کاٹنے لگے تھے۔

رواڈ انجسٹ 117 دسمبر 2015ء

READING
Section

”اب میں بھی اسے اسی کی اوقات ہی یاد کرواؤں گا۔“ سلمان نے چونک کر اسے دیکھا۔
 ”اس کے بھی دل پر لگے گی ناں تب پتہ چلے گا اسے۔“ سلمان کو اس کی آنکھوں سے خوف آیا۔
 ”حارث! کیا کرے گا اب تو؟“ حارث صرف مسکرایا تھا۔

☆.....☆

کلاس شروع ہونے میں دس منٹ باقی تھے۔ عمیر ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ ہولے ہولے کارڈور میں واک کرنے لگی۔

”ہائے۔“ حارث کی آواز پر وہ یکدم مڑی تھی۔

”اوہ ہائے..... آپ نے تو مجھے ڈرا دیا۔“ علیزہ واقعی ڈر گئی تھی۔

”سوری جی، پر میں تو سمجھا تھا کہ آپ خاصی بہادر ہیں۔“ علیزہ ہنسی تھی۔

”وہ تو میں ہوں کوئی شک نہیں۔“ حارث کھل کے ہنسا۔

”ویسے آپ صبح صبح یہاں کیسے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں اپنے ڈپارٹمنٹ جا رہا تھا جب آپ کو یہاں ٹہلتے دیکھا، سوچا ہیلو بول دوں، صبح صبح خوب صورت

لوگوں کے درشن کر لو تو دن اچھا گزر جاتا ہے۔“ علیزہ ہنسی تھی۔

”یعنی میرا دن تو گیا۔“ وہ حارث پر چوٹ کرتے ہوئے بولی۔

”یہ تو اپنی اپنی قسمت ہے جی، ویسے بھی آپ کو اپنے اس چاکلیٹی ہیرو کے آگے میں گیا گزرا ہی لگوں گا۔“

حارث کھل کے بولا۔

”نو نو یو ہو گڈ بر سٹائی۔“ علیزہ فوراً بولی۔

”چلیں جی ٹھیکس، ویسے بھی آپ کا ہیرو آ گیا۔“ حارث تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے عمیر کو دیکھ کر بولا جس

کے تاثرات ان دونوں کو دیکھ کر ایک دم تبدیل ہوئے تھے۔ اس کی طرف ہاتھ ہلاتے ہوئے اس نے ایک دلنشین

مسکراہٹ عمیر کی طرف اچھالی تھی اور یہ تو بس شروعات تھی۔ کوئی کمی تو نہیں تھی حارث میں، خوب صورت، دلکش،

ذہین، بہت اچھا اخلاق تھا اس کا۔ بس ایک بیک گراؤنڈ مضبوط نہیں تھا اور علیزہ جیسی عقلمند لڑکی کے لیے وہ کوئی

معنی نہیں رکھتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے علیزہ کو اچھا خاصا اپنی طرف کھینچ ہی لیا۔ عمیر کی آنکھوں میں اسے دیکھ کے

بیدار ہونے والی نفرت اور لہجے میں اس کے ذکر سے ہونے والی کڑواہٹ بڑھتی چلی گئی۔ عمیر جتنا تلخ بنتا گیا،

حارث اتنا میٹھا ہوتا چلا گیا۔ عمیر کی ہر کڑوی بات مسکراہٹ میں اڑا دیتا۔ بہت اچھی دوستی ہو جانے کے باوجود

اس نے کبھی علیزہ کو تم نہ کہا۔ ہمیشہ آپ کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔

”جانتے ہو حارث! عمیر بہت اچھا ہے۔ بہت اچھا۔ مجھ سے بہت پیار کرتا ہے اور مجھے یہ کہنے میں کوئی عار

نہیں کہ میں بھی شاید اس سے پیار کرنے لگی ہوں لیکن تم..... تم ان چند لوگوں میں سے ہو جن کا مقام میرے دل

میں بہت بڑا ہے۔ بہت اونچا۔ میں شاید باقی زندگی تمہیں کبھی نہ بھلا سکوں۔“ حارث ہولے سے مسکرایا تھا۔

”یعنی دیر ہو گئی۔ عمیر سے پہلے کوشش کرنا تو آپ کو مجھ سے پیار ہو ہی جاتا۔“ علیزہ اس کی بات پر کھل کے

مسکرائی تھی۔

”ایک بات مانیں گی؟“ وہ چند لمحوں بعد بولا تھا۔

”کہو۔“ علیزہ ہنسی سے بولی۔

”ہوسکے توکل شام 5 بجے یونیورسٹی گارڈن آجائیے گا۔ کچھ دکھانا ہے۔“ علیزہ حیران ہوئی۔
 ”مجھے؟“ حارث صرف مسکرایا تھا۔
 ”اوکے آجاؤں گی۔“ علیزہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔

☆.....☆

”یونیورسٹی گارڈن 5 بجے۔“ عمیر کو Text کر کے وہ گارڈن آ گیا۔ علیزہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ وہ کچھ دیر ٹہلنے کے بعد بیچ پر بیٹھ گیا۔

”سوری تھوڑی دیر ہوگئی۔ اپنے پیچھے علیزہ کی آواز سن کر وہ کھڑا ہو گیا۔

”علیزہ میں تمام عمر آپ کا انتظار کر سکتا ہوں۔“ حارث کی ذومعنی بات میں بہت کچھ چھپا تھا۔ علیزہ چپ کر گئی۔
 ”میں جانتا ہوں علیزہ میری اتنی اوقات نہیں ہے جتنی بڑی میں بات کہنے جا رہا ہوں مگر یہ جو دل ہے ناں یہ بس میں نہیں رہا اب۔“ علیزہ آگے کو آئی تھی۔

”حارث کیا ہوا؟“ حارث چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر آگے کو آیا۔

”علیزہ میں کئی راتوں سے سو نہیں سکا۔“ حارث کی آواز اسے بھرائی ہوئی لگی۔

”اتنا بے چین اتنا بے بس میں نے خود کو کبھی نہیں دیکھا۔ ماننا ہوں غلطی ہوئی ہے مجھ سے۔ سب کچھ جاننے کے باوجود میں خود کو روک نہیں پایا۔ علیزہ میں.....“ گارڈن کے گیٹ پر اس نے عمیر کی بائیک رکتے دیکھی تھی۔
 وہ علیزہ کے اور قریب ہوا۔ عمیر نے بائیک کھڑی کر کے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔
 ”میں نہیں رہ سکتا تمہارے بغیر۔ آئی لو یو۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے علیزہ کا چہرہ تھاما تھا۔ عمیر کے قدم انہیں دیکھتے ہی ایک دم رک گئے۔

”آئی لو یو علیزہ۔“ کہتے ہوئے اس نے بہت ہولے سے علیزہ کے لرزتے لبوں کو مقید کیا تھا۔

”حارث۔“ علیزہ کی سرگوشی حارث کی سانس میں ہی گم ہوگئی۔ بوجھ اتنا تھا کہ وہ اپنے سہارے پر کھڑی نہ رہ سکی اپنے پیچھے درخت کے تنے سے جا لگی۔
 ”حارث پلیز۔“ علیزہ بے بس تھی۔

”مرجاؤں گا میں۔“ علیزہ کو لگا وہ رو رہا ہے۔ حارث کے کندھے سے سر نکالے ہوئے ماس نے آنکھیں بند کی تھیں اور عمیر..... جہاں غصہ شدید ہو کہ ختم ہوتا ہے وہاں سے دکھ کی ابتداء ہوتی ہے۔ اس کی غصے سے سرخ ہوتی آنکھوں میں یکدم پانی بھرا تھا۔ دل سے چاہا تھا اس نے علیزہ کو۔ وہ اسے کسی اور کے ساتھ برداشت نہ کرتا تو یہ تو پھر حارث تھا۔ جو اس کے لیے نفرت کا دوسرا نام تھا۔ وہ لڑکھڑاسا گیا۔ پانی آنکھوں سے باہر آنے لگا تھا۔ اس نے زور سے ہاتھوں کی پشت سے آنکھوں کو رگڑا۔ دل خون خون ہو گیا تھا۔ اسے لگا جیسے حارث ہولے ہولے مسکرایا ہو۔ بمشکل قدموں کو کھینچتے ہوئے وہ بائیک نکالتے ہوئے گارڈن سے نکل گیا۔ حارث واقعی مسکرایا تھا۔

☆.....☆

وہ اور سلمان کچھ پوائنٹس ڈسکس کر رہے تھے جب دھاڑ سے کمرے کا دروازہ کھلا۔ رات کے دس بجنے والے تھے۔ عمیر تیر کی طرح اندر آیا۔ حارث اسے دیکھ کر رہ گیا۔ سرخ آنکھیں۔ بکھرا سا ٹوٹا سا۔
 ”میں سچ کہتا تھا ناں۔ حارث کو زمین پر رہنے والوں کی اوقات عرش پر رہنے کی نہیں ہوتی۔ وہ عرش تک پہنچ بھی جائیں تو کہیں نہ کہیں اپنی اوقات دکھائی دیتے ہیں۔ تم نے بھی دکھائی دی۔“ آج عمیر کی آواز میں غرور

رداڈ انجسٹ [119] دسمبر 2015ء

READING
Section

نہیں۔ دکھ بول رہا تھا۔ حارث کھڑا ہو گیا۔

”لگی ناں آج یہاں۔“ اس نے عمیر کے دل پر انگلی رکھی تھی۔

”ہواناں..... ہواناں دل کا خون آئے ناں آنکھوں میں آنسو، میرے دل پر بھی یونہی لگتی ہیں تمہاری باتیں، یونہی خون ہوتا ہے میرے دل کا بھی۔ یونہی درد ہوتا ہے مجھے بھی۔“ عمیر ایک دم چلایا تھا۔

”گوٹو ہیل یو اینڈ یور ہارٹ (بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا دل)۔ تمہاری جرأت کیسے ہوئی علیزہ کو چھونے کی۔“ عمیر کے دونوں ہاتھ اس کے گریبان تک پہنچ گئے۔

”حینیج لو جتنا مرضی۔ آج حق بنتا ہے تمہارا۔“ حارث کی بات اسے سلگا گئی۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔ یہ بھی میرا حق ہے۔“ کہتے ہوئے اس نے حارث کے پھٹ مارا تھا۔

”عمیر! اب تو حد سے بڑھ رہا ہے یار۔“ سلمان ا یکدم کھڑا ہوا تھا مگر عمیر شاید پاگل ہو چکا تھا۔

”یہ بھی میرا حق ہے۔“ عمیر کے دوسرے ہاتھ سے حارث کھڑا نہ رہ سکا۔

”رک جا عمیر!“ سلمان نے پھر روکا تھا مگر آج عمیر کو غصہ نہیں دکھ تھا۔

”یہ بھی میرا حق ہے۔“ اس کے مکے نے حارث کا ہونٹ پھاڑ دیا اور حارث کی بس ہو گئی۔ اس نے وحشیوں

کی طرح عمیر کو جھپٹا تھا۔ دونوں لڑتے ہوئے باہر نکل آئے۔

”قسم سے حارث آج یا میں، یا پھر تو۔“ عمیر کی سرخ آنکھیں اور گرجتی آواز حارث کو وحشی بنا گئیں۔ سلمان

نے حارث کے موبائل سے علیزہ کو فون کیا تھا۔

”بولو حارث۔“ علیزہ کی آواز ابھری تھی۔

”سلمان بات کر رہا ہوں۔ علیزہ جی آپ پانچ منٹ میں نہ آئیں تو شاید دونوں میں سے کوئی بھی نہ بچے آج۔

یہ دونوں یہیں گاڑھ دیں گے ایک دوسرے کو جلدی آئیں۔“ علیزہ ا یکدم پریشان ہو گئی۔ رات کے اس پہر وہ بوائز

ہاسٹل کیسے جائے۔ خود گاڑی چلاتے ہوئے وہ جناح ہال آئی تھی۔ سلمان نے اسے دور سے ہی دیکھ لیا۔

”وہ دیکھیں، لگ لگے بڑے لکھے۔“ علیزہ دنگ رہ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو خونم خون کر دیا تھا۔ وہ

بھاگتی ہوئی گراؤنڈ تک آئی تھی۔

”خدا کا واسطہ بس کر دو تم دونوں۔“ علیزہ کی آواز پر حارث نے عمیر کا گریبان چھوڑا جو تقریباً پھٹ چکا تھا۔

”آج اگر مجھے اس بات کا ذرا سا بھی یقین ہوتا ناں کہ دو خوب صورت ذہین اور ویل ایجوکیٹڈ لڑکے صرف

میرے لیے آپس میں لڑ رہے ہیں تو مجھے خوشی ہوتی۔ مگر میں جانتی ہوں میں تو صرف ایک بہانہ ہوں۔ یہ تو نہ

جانے کتنی پرانی نفرت ہے جو یوں نکل رہی ہے۔“ علیزہ کی آواز بھر آئی۔ تیزی سے آگے بڑھ کے اس نے عمیر کو

سیدھا کیا اور زانے دار پھٹر رسید کیا۔ پھر کھٹاک سے اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔

”یہ دیکھو میرے جڑے ہاتھ غلطی ہو گئی مجھ سے جو تم سے پیار کر لیا مگر اب معاف کر دو مجھے۔ نہیں جی سکتی میں

اس قدر گھٹن میں۔“ کہہ کر وہ حارث کی طرف مڑی۔ ویسا ہی ایک پھٹرا اس کے حصے میں بھی آیا۔

”کہا تھا ناں میں نے کہ تمہیں کبھی نہیں بھول پاؤں گی۔ واقعی میں تمہیں کبھی نہیں بھول پاؤں گی۔“ علیزہ کی

آنکھیں چمک گئیں۔

”پلیز بس کر دو۔ پلیز۔“ کہتے ہوئے وہ بھاگتی ہوئی گیٹ کر اس کر گئی۔

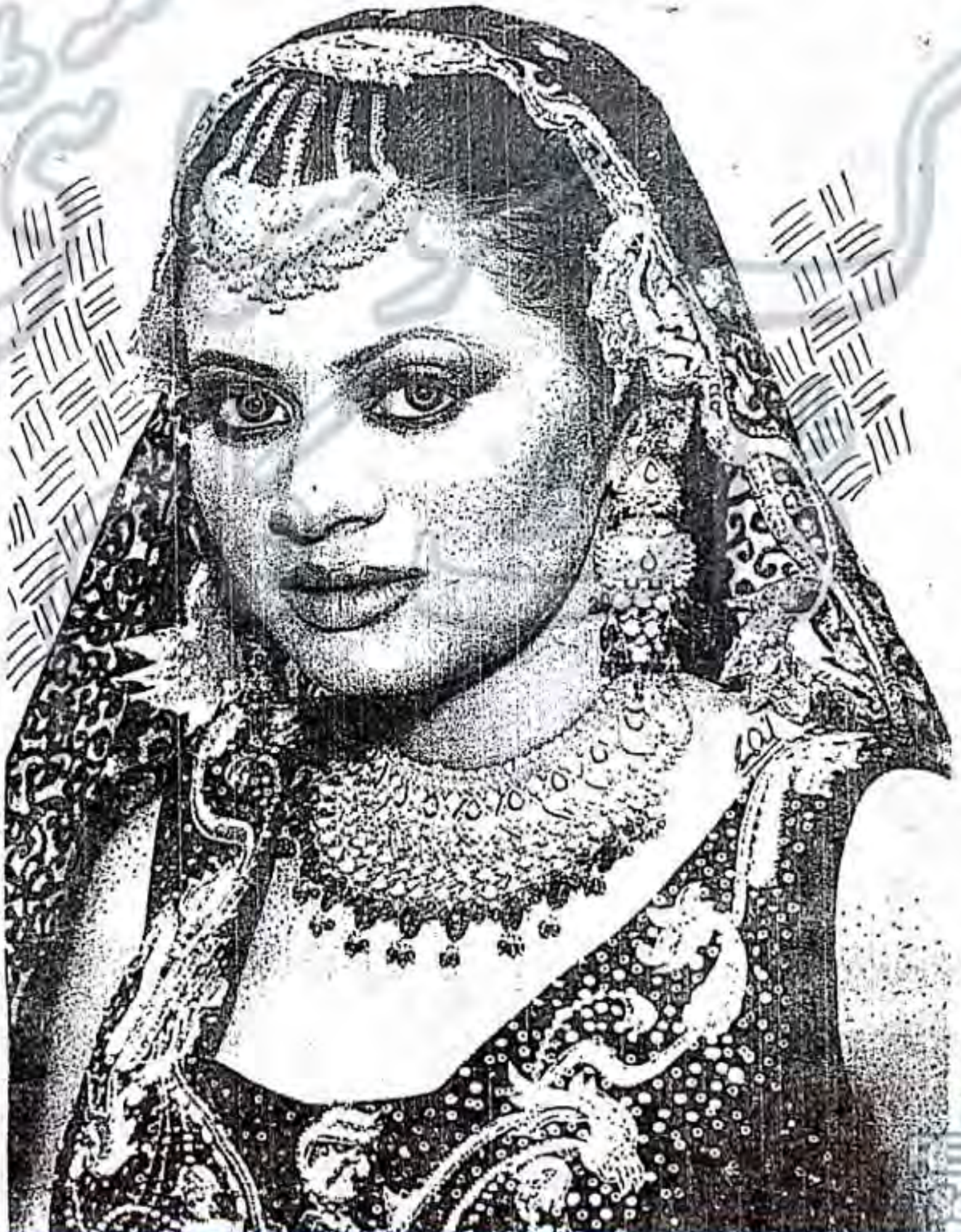
(جاری ہے)

فریدہ فرید

مکمل ناول

نقد نہیں تابعِ منطق

ڈھولک کی تھاپ نے اسے جیسے خواب سے بیدار کر دیا، بیٹھے بیٹھے کھو جانے والی اس کی عادت کوئی ہمیشہ سے نہ تھی، یہ تو چند ماہ کا کرشمہ تھا جس سے اس کی عادات میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی تھی، اس کے تخیل کی دنیا شور مہنگاے



READING
Section

سے متاثر نہ ہوتی تھی۔

خواب اور وہ بھی من پسند حسین، ان کے ٹوٹنے پر غصہ حد سے سوانہ ہو تو کیا ہو، حاضرین محفل اس کے چونکنے اور بڑبڑانے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنی شور و غل غپاڑہ میں مگن رہے۔
وہ باہر کی آوازوں کا گلا گھونٹی اپنے کمرے میں بند ہو چکی تھی، مگر اندر کیا طوفان برپا تھا کوئی نہیں جانتا تھا، ان ہنگاموں سے وہ خود کو کیسے آزاد کرے؟ یہ وہ نہیں جانتی تھی۔

.....☆.....

فجر شاہ، جہانزیب شاہ کی لاڈلی، کوئی اکلوتی بیٹی نہیں تھی، سجدہ اور ایمان کے بعد دنیا میں آنے کے باوجود اس نے محبت اور لاڈ میں کوئی کمی نہیں پائی۔
”ایمان! خود تو کیسا اسٹائلش سوٹ بنایا ہے اور میرا یہ کفن سی دیا“۔ فجر، ایمان کا حال ہی میں تیار ہو کر آیا سوٹ



READING
Section

ہاتھ میں لئے شکوہ کر رہی تھی۔

”اے فجر! تیرا داغ تو آسمان پر ہے، تین ہزار کے سوٹ کوکفن کہہ دیا اللہ تیری شان“۔ آمنہ بی ہمیشہ کی طرح اس کی بات پر کھس کر رہ گئیں۔

”اس کا دین ایمان تو ہے ہی نہیں، خود ہی کہا تھا میرا وائٹ کلر کا سوٹ لانا اور اب محترمہ کے ناک سے نیچے نہیں اتر رہا“۔

ایمان ماں کو مزید تاؤ دلاتے ہوئے بولی فجر تو بات کر کے پچھتا رہی تھی اور ہمیشہ کے لئے عہد کرنے لگی کہ پہلے سوچوں گی پھر بولوں گی۔

بڑی بہن سجدہ کی شادی پر اور گھر کی پہلی تقریب ہونے کے تحت اہتمام میں کیا کوئی کمی تھی، تیاریاں جو بن پر تھیں، تو ڈانٹ کا گراف بھی آسمان سے اترنے کو تیار نہیں تھا۔

لاڈلی فجر سب سے زیادہ عتاب کا شکار تھی۔

”بابا جان! دیکھیں ناں میرا جوڑا ایمان سے کم لگ رہا ہے، میری تو سبکی ہو جائے گی آپ کی سسرال والے کیا کہیں گے؟ کہ یہ تو ان کی سوتیلی بیٹی ہے“۔

زبردستی کے آنسوؤں اور دل چیرتی اطلاع پر بابا کی لاڈلی اپنے مقصد میں کیسے کامیاب نہ ہوتی۔

ڈارک میرون کلر کی ایمر ایڈری سے سجے گئے کلر کے لانگ کرنا پاجامہ پہنے، نیک سگ سے تیار فجر شاہ ہر نگاہ کا مرکز بنی لہک لہک کر گار رہی تھی۔

”آئی مہندی کی یہ رات

ہے لائی سپنوں کی بارات“

نگاہ خیرہ کرنے کے تمام لوازمات سے لیس یہ پری وٹس عباد احمد کی نگاہوں سے کیسے مخفی رہ سکتی تھی، امریکہ سے ایڈورٹائزنگ ڈگری لے کر لوٹنے والے عباد احمد، سجدہ کے ہونے والے دیور کے لئے مشرقی روپ کا یہ انوکھا انداز انتہائی جاذب نظر تھا، چلچلاتی گوریوں کا سحر، کھلکھلاتی ہنسی میں ڈول گیا، اس کی نگاہیں ہی نہیں سوچیں بھی اس کے قابو میں نہیں تھیں۔ وہ بات کرنے کے بعد سوچنے لگ پڑتا کہ ابھی کیا کہہ رہا تھا، اپنی کیفیت کو دوستوں کی شریر نگاہوں سے بچانے کے لئے وہ الگ تھلگ رہنے کی کوشش کر رہا تھا، دوسری طرف ہر بات سے بے نیاز فجر شاہ کی چیخ و پکار عروج پر تھی۔

”فجر! گھر جانے کا ارادہ نہیں ہے، ہمیں رہنا ہے کیا“۔ ایمان نے چڑچڑ باتیں کرتی فجر کو جھاڑ پلائی تقریب اختتام کو پہنچ گئی تھی، تقریباً کبھی مہمان رخصت ہو چکے تھے، مگر سجدہ کی نند سے مصروف گفتگو فجر کو دیکھ کر ایمان کا جل جل کے برا حال تھا۔

”ایمان! آرام سے بات کرو دیکھ نہیں رہی ہو، کتنے اہم مسائل پر ڈسکشن ہو رہی ہے“۔ فجر نے کمال لاپرواہی سے کہا۔

”تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے چارنج رہے ہیں اور صبح تمہارا اکنٹیکس کا ٹیسٹ ہے“۔ ایمان نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا، حربہ کامیاب رہا وہ فوراً سے پیشتر باہر کی طرف لپکی مگر آدھے ہی راستے میں ٹریفک پھر جام تھی۔

”اب کیا ہے“۔

”ایمان میرا دوپٹہ اوپر ہی رکھا ہے وہ تو لے آؤ“۔

”رہنے دو بعد میں مل جائے گا، دیر ہو رہی ہے“۔ ایمان نے اسے باہر کی طرف گھسیٹا، مگر وہ خود کو اس کے شکنجے سے

آزاد کرا کے واپس دوڑی، مطلوبہ کمرے تک پہنچی تو اندر سے نکلتے وجود اجنبی سے بمشکل خود کو نکرانے سے روکتے ہوئے دور ہوئی اجنبی کے لبوں کی مسکان اسے سراسیمہ کرنے کو کافی تھی۔
 ”ہیلو! اپنی پرابلم“۔ عباد احمد کے لہجے میں مٹھاس کی بھرمار تھی، جبکہ فجر کے ذہن پر عجلت سوار تھی۔
 ”وہ میرا دوپٹہ.....“

”رنگ دوں“۔ عباد نے شوخی سے جملہ مکمل کیا۔
 ”جی.....“ فجر کی آنکھیں پھٹ پھٹ پڑنے کے قریب ہو گئیں، عباد نے اس لنشین جملے سے بمشکل خود کو بچایا اور ادھوری بات سمجھتے ہوئے اندر پلٹ گیا، دوپٹہ تو سامنے ہی رکھا لگتا تھا مگر وہ کچھ سوچتا ہوا خالی ہاتھ لوٹ آیا۔
 ”سوری دوپٹہ فی الوقت دستیاب نہیں، شاید بھیڑ میں آگے پیچھے ہو گیا ہو آپ فکر نہ کریں، جیسے ہی مجھے ملا میں آپ تک پہنچا دوں گا“۔ وہ اردو دانی کے جوہر دکھاتا اسے اطلاع فراہم کر رہا تھا، جواز لی لا پرواہی سے آدھی بات سن کر واپس ہو چکی تھی۔

”ایکسکوز می، میم! یہ تو بتاتی جائیں دوپٹہ مل گیا تو پہنچاؤں کہاں؟“ عباد اس کے پیچھے چلاتا ہوا لپکا۔
 ”میرے گھر پہنچا دیجئے گا“۔ فجر بے تکابولتی ہوئی تیزی سے قدم اٹھا رہی تھی۔
 ”لیکن آپ کا گھر کراہ اراض کے کون سے خطے پر ہے؟“ عباد اردو دانی کے چکر میں بولنے لگا تھا۔
 ”ایڈھی سینٹر پہنچا دیں مگر اس وقت میری جان چھوڑ دیں“۔ فجر بیزاری سے گویا ہوئی۔
 ”اوکے میم! مگر یہ تو بتادیں آپ ہیں کون؟“ عباد کی ڈھٹائی بھی عروج پر تھی شاید وہ یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔

”میں آپ کی بہن ہوں“۔ فجر جان چھڑاتے ہوئے عجیب و غریب تعارف کراتی گیٹ عبور کر گئی، عباد آپ کی بہن کا نام پوچھنے کی حسرت دل میں لئے کھڑا رہ گیا۔

☆.....

”ماما! آج چھٹی کرنے دیں پراس آئندہ ڈیلی کالج جایا کروں گی“۔ وہ نیند سے بوجھل پلکوں کے ساتھ ماں کے کندھے پر سوار تھی، شادی گزرنے کے بعد اس کی تھکاوٹ جاگ اٹھی تھی وہ بھی نیند پوری نہ ہونے کے باعث مریل بکری کی طرح بیٹھی تھی۔
 ”کوئی چھٹی نہیں کرنی یہ تمہارا کالج ہے، یا مذاق دو دن پڑھائی تو چار دن چھٹی“۔ ایمان اس کی کوششوں پر پانی پھیرتے ہوئے بولی۔

”تم بی جھالو چپ رہو“۔ وہ بدتمیزی سے بولی۔
 ”اول ہوں، فجر! ایمان ٹھیک کہہ رہی ہے تم چھٹیوں میں خود کفیل ہوتی جا رہی ہو شادی میں تو تم سے زیادہ کوئی الرٹ اور چاک و چوبند تھا ہی نہیں اور اسٹڈی کا وقت آیا تو اتنی نقاہت بہت بری بات سے چلو اٹھو تیاری کرو“۔ ماں کے حتمی انداز نے اسے مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا، وہ بے دلی سے اٹھ کر تیاری کرنے لگی۔ ایمان کی مسکراہٹ الگ جلائے دے رہی تھی مگر فون کی بیل پر ایمان نے مزید ستانے کا پروگرام کینسل کر دیا۔
 ”ہیلو! ایمان نے فون ریسیو کیا۔“
 ”السلام وعلیکم!“

”وعلیکم السلام! آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟“

رواڈ انجسٹ 125 دسمبر 2015ء

READING
Section

”اس گھر میں جو سب سے زیادہ حسین ہستی ہیں مجھے ان سے بات کرنی ہے۔“ اجنبی مردانہ آواز سو بر انداز میں جواب دیا۔

”وہ تو آپ کر رہی رہے ہیں۔“ ایمان بھی اپنے نام کی ایک تھی۔

”لیکن مجھے جس سے بات کرنی ہے، وہ حسین کے ساتھ ساتھ معصوم، کیوٹ و سوئیٹ اور.....“

”اوہیلو ذرا بریکیں لگاؤ یہ شریفوں کا گھر ہے کوئی.....“ ایمان تکیے ترین لہجے میں مخاطب کو لتاڑتے ہوئے بولی اس نے ذرا سی بے تکلفی کیا دکھائی تھی، بدتمیزی کے ریکارڈ ٹوٹ گئے تھے (اور فری ہوا جنیوں سے) وہ دل میں خود کو کوسنے لگی۔

”او آئی ایم جو کنگ میں عباد بات کر رہا ہوں، سجدہ بھابھی کا دیور۔“ عباد فوراً سنبھل کر تعارف کروانے لگا، مزید عزت افزائی نہ ہو جائے۔

”اوسوری میں پہچانی نہیں آپ کو، بھئی سیدھے سبھاؤ سے بات کرنی چاہئے تھی۔“ ایمان نے بھی بہن کے سرال کا لحاظ کرتے ہوئے خوش اخلاقی کا پینتر ابدلا۔

”اصل میں روشنی کو فجر سے بات کرنا تھی، میں نے تو بس فون آپریٹر کا کام دیا ہے۔“ عباد نے اپنی بہن کے حوالے سے بات آگے بڑھائی جو فجر کی دوست بن چکی تھی، اور اس کے توسط سے وہ فجر کا نام جان گیا تھا۔ فجر کو وین کے انکل سے لیٹ ہونے پر سخت ست سننا پڑیں، دوسری طرف ایمان کی صدا میں آ رہی تھیں وہ تیز آندھی کی طرح اوپر آئی۔

”کیا مصیبت ہے نیچے انکل کا ہارن بج رہا ہے اور اوپر تمہارا۔“ فجر خود تو کہہ کر فون کی طرف بڑھ گئی مگر ایمان کا نظام ہاضمہ اس کی جلی کٹی بات ہضم کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔

”ہیلو۔“

”ہائے کیا حال ہے۔“ بھاری مردانہ آواز سے وہ حق دق رہ گئی (ہائیں یہ ایمان تو کہہ رہی تھی تمہاری دوست کا فون ہے، اس کی بھی کوئی گل سیدھی نہیں ہے)۔ وہ ریسور تھا مے ایمان کو کوسنے لگی، جبکہ عباد احمد اس کی ہیلو کے شمار میں بھٹک رہا تھا۔

”ہیلو! آپ کی بہن کیا کوئی اسٹاپ کر کے چلا گیا۔“ شوخی سے بھرپور آواز ابھری وہ چونک اٹھی۔

”آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟“

”آپ سے۔“ مختصر جواب حاضر خدمت تھا۔

”لیکن آپ ہیں کون؟“ اس نے کام کا سوال اب جا کر پوچھا۔

”ویری سیڈ! آپ مجھے بھول گئیں، جبکہ میں نے لمحہ بھر آپ کو فراموش نہیں کیا۔“ وین کے ہارن میں گم فجر نے اس کی بات کو بمشکل نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کو جو کہنا ہے کہیے مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

”او کے آپ کا دوپٹہ میرے ہاتھ میں ہے، کب تشریف لاؤں امانت پہنچانے کے لئے۔“ عباد نے بات سمیٹی مگر فجر چیخ کر رہ گئی۔

”حد ہو گئی آپ نے اتنی سی بات کہنے کے لئے اتنی صبح جاگنے کی، فون کرنے کی میرا وقت ضائع کرنے کی زحمت کی اسٹوپیڈ۔“

”کیا ہوا بھائی بات نہیں بنی شاید۔“ روشنی نے شرارت سے چھیڑا۔

”چھوڑو روشنی! اتنی صبح بے عزتی ہو گئی۔“ عباد منہ بسورتا ہوا بولا۔

☆.....

آج تو شاید دن ہی ڈانٹ کا تھا کالج لیٹ پہنچنے پر پرنسپل سے اور اب کلاس ٹیچر سے نوادرات کے وصول کے بعد وہ دل ہی دل میں ایمان کو کو سے جارہی تھی، جس نے آج صبح اسے نیند سے بیدار کیا تھا۔
”اوہو آگئی شہزادی شادیاں اٹینڈ کرنے کے بعد“۔ ثمن نے ٹیچر کے انداز کو برقرار رکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔

”اے ثمن! آج مجھ سے بات کم کرنا اور نہ نتائج کی ذمہ دار تم خود ہو گی۔“ وہ خونخوار لہجے میں غرائی۔
”واہ، اتنے دنوں کے بعد دوستوں سے یوں ملا جاتا ہے ناں شیم آن یو“۔ ثمن کے لتاڑنے پر وہ قدرے شرمندہ ہوئی۔

”سوری ثمن! آج اتنا کچھ ہوا کہ میرا موڈ انتہائی خراب ہے۔“ وہ دھیسے لہجے میں بولی۔
”اپنے موڈ کو درست کر لو آج اکناکس کے نئے ٹیچر تشریف لارہے ہیں، جو خیر سے کافی روڈ قسم کی شخصیت سمجھے جاتے ہیں، لہذا میری پیشگوئی تو یہ ہے کہ تمہارا زوال شاید مزید جاری رہے۔“ ثمن نے ایسے پراسرار ہو کر کہا کہ وہ واقعی میں دلی سی گئی، مگر دعا کلاس فیلو کی اچانک طبیعت خراب کا سن کر وہ اسے لئے میڈیکل روم کی طرف بڑھ گئی۔
”السلام علیکم“۔ اکٹڑ سے سلام پر سب اپنی اپنی نشست پر لوٹ سے بیٹھ گئیں، آنے والی شخصیت بھی تو خاصی جاندار تھی، لڑکیوں کے لئے ایسا تر ہونے کے تمام لوازمات موجود تھے، مگر صاحب کافی تک چڑھے سے معلوم ہوتے تھے لڑکیوں کی حس شرارت ڈری سہی ہوئی تھی اور لیکچر نے تو رہی سہی ہمت بھی توڑ دی۔

”آپ سب اچھی طرح جانتی ہیں ہمارا بہت ساقیتمی وقت ضائع ہو چکا ہے، لہذا ہمیں کافی شارٹ ٹائم میں ٹف ورک کرنا ہے، اس کے لئے میری رہنمائی اور آپ کی محنت و تعاون ضروری ہے، میرا ساتھ دیں گی تو بہترین رزلٹ میری گارنٹی ہے اور وائز مجھے آپ کی ناکامی پر دکھ نہیں ہوگا۔ ناؤ فرسٹ آف آل ریڈنگ سے اشارت کرتے ہیں۔“ لڑکیاں جو طویل لیکچر سے ہی دم بخود تھیں ریڈنگ کرنے کے فرمان نے تو انہیں ادھ مرا ہی کر دیا، کیونکہ یہ ہمارا تعلیمی الیہ ہے ایم اے کے اسٹوڈنٹ سے اگر مشکل ریڈنگ کرائی جائے تو تمام قابلیت سامنے آ جاتی ہے۔“ بارعب شخصیت کی حکم عدولی سے باز رہنے کے لئے ثمن نے ریڈنگ کرنے کا بیڑا اٹھایا مگر محترم کا غصہ تو اب سامنے آیا، جب ایک ایک کر کے کلاس دروازے سے آؤٹ ہوتی گئی، ”بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کچے سے ہم نکلے“ کا ورد زبان زد عام تھا۔ سر انتہائی غصے کے عالم میں کلاس سے نکلنے لگے، مگر اگلے ہی لمحے اندھا دھند بھاگ کے آتی فجر اس چٹان سے ٹکرا کر زمین بوس ہو چکی تھی۔

”آئی ایم سوری سر! آپ گرے کیوں نہیں؟ آئی میں آپ گرے تو نہیں۔“ فجر فوراً اٹھ کر بوکھلائی ہوئی بولی۔
”کیا آپ کو میرے نہ گرنے پر افسوس ہے۔“ خوفناک شخصیت کے چہرے پر پہلی بار نمودار ہونے والی مسکراہٹ نے زخم خوردہ لڑکیوں کو حیران کر دیا، ان کے نظر نہ آنے والے زخموں سے ٹھیس نکلنے لگی۔
”نوسر! آپ فکر نہ کریں میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ فجر نے یوں تسلی دی گویا وہ فکر سے مرے جارہے ہوں، لڑکیاں اس کی بوکھلاہٹ پر گھور ہی تھیں۔

”ایکسکو زمی مس! میں آپ کو فکر مند نظر آ رہا ہوں؟“ سر نے استہزائیہ استفہام کیا مگر اس کی شرمندہ ترین صورت پر ترس کھاتے ہوئے فوراً نرم لہجے میں استفسار کیا۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“

”سر! میں فخر ہوں۔“ وہ ایسے بولی جیسے سر کی لاعلمی پر افسوس کر رہی ہو۔
 ”اچھا آپ فخر ہیں ماشاء اللہ کافی پاپولر شخصیت ہیں آپ۔“ سر کی رگ شرارت کی موجودگی نے لڑکیوں پر حیرانگی کے پہاڑ توڑ دیئے تھے۔
 ”یانی داوے آپ کون سے ایر میں ہیں اور اتنی اسپید سے کہاں آرہی تھیں؟“ سر نے اس کی خاموشی پر اپنی بات جاری رکھی۔

”سر! میں سیکنڈ ایر میں پڑھتی ہوں، وہ دعا کی ٹریٹمنٹ کر رہی تھی۔“
 ”واٹ.....“ سر کی اچانک دھاڑ پر وہ ہم کرا نہیں دیکھنے لگی۔

”آپ اسی کلاس میں پڑھتی ہیں اور آپ نے میرا پیریڈ اٹینڈ نہیں کیا، واٹ نان سینس میں یہ حرکت قطعاً برداشت نہیں کر سکتا اور کون کون اسٹوڈنٹ کلاس روم سے باہر ہیں۔ آئندہ یہ سب اسٹوڈنٹ میری کلاس میں نہیں بیٹھیں گے ڈیش اٹ۔“

”نو، نو سر! میں پہلے کبھی بھی کوئی پیریڈ مس نہیں کرتی، وہ دعا کی کنڈیشن ایسی تھی کہ اور سر مجھے آپ کی کلاس میں آمد کا علم بھی نہیں ہوا آئی ایم سوری سر۔“ فخر معذرت کرتے ہوئے رو دینے کو بھی، سر کے غصے سے سرخ چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی وہ خلاف عادت نرم لہجے میں بولے۔

”او کے آئندہ ایسا نہ ہو، جائے کلاس میں اور آپ سب بھی۔“ رہائی کا فرمان پاتے ہی سب تیر کی طرح کلاس میں داخل ہوئیں۔

”فخر.....“ نرم سی ریکارڈ پر فخر ٹھٹک کے مڑی اور خوفزدہ نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی۔

”چوٹ تو نہیں لگی۔“ سر کے لہجے کی نرمی نے فخر کو الٹا ہراساں کر دیا۔

”نو سر!“ وہ سرخ ناک کے واضح ثبوت کے باوجود نفی میں بولی سر کچھ کہے بنا پلٹ گئے۔

”یہ کون تھے یار؟“ فخر نے کلاس میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔

”آدمی تھے۔“ ثمن نے جل کر کہا۔

”وہ تو مجھے لکراتے ہی پتہ چل گیا تھا اسٹوڈنٹ میں پوچھ رہی ہوں تھے کون؟“

”ڈریکولا تھے انتہائی بے مردت حد ہو گئی نہ سلام نہ دعا نہ تعارف نہ کچھ لے دے کے پہلے ہی دن کلاس سے نکال دیا، اتنی خوبصورت، معصوم سی صورتوں پر ذرا بھی ترس نہیں آیا۔“ ثمن کی دہائی جاری تھی وہ ہنسی دباتی سیٹ پر براجمان ہو گئی۔

.....☆.....

”یہ آپ کی دیور ہیں۔“ عباد احمد کو دیکھتے ہی اسے گزشتہ دن کی اپنے رویے کی بد صورتی یاد آ گئی۔ سجدہ کے سرال کی دعوت کے تحت فیملی ممبرز میں عباد کو دیکھ کر وہ ایمان کے کان میں منمنائی تھی۔

”عباد بیٹا! تمہارے آنے کی بطور خاص خوشی ہوئی ہے۔“ جہانزیب شاہ کے خوشدلا نہ انداز اور عباد سے حد سے زیادہ وابستگی اسے کھٹک رہی تھی، جیسے عباد زیر لب مسکراتا ہوا نوٹ کر رہا تھا۔

”مس فخر! آپ کا دوپٹہ تو میں اسپیشلی ساتھ لے کر آیا ہوں کافی کانٹشس تھیں آپ اس کے بارے میں۔“ فخر کو کھکتے دیکھ کر وہ فوراً سے پیسٹر بولا، اس دوپٹے سے تو اب فخر کو چڑھو چلی تھی۔ ”بیٹا! بلاوجہ تکلف کیا ذرا سا دوپٹہ ہی تو تھا۔“ آمنہ بی کے شہد آ گئیں لہجے کو بھی اس نے ناگوار نظروں سے دیکھا۔

”ذرا سا کہاں آئی! اس دوپٹے کے لئے تو انہوں نے کالز کی بھرمار کر دی تھی۔“ فجر حیرت زدہ سی اس کے ڈھٹائی سے پر جھوٹ کودیکھے گئی، جو اپنی غیر ضروری حرکت پر ہنس پڑا تھا، حاضرین مجلس کو بے موقع خواہ مخواہ کی ہنسی پر کوفت سی ہو گئی مگر وہی بیٹی کا سسرال، نازک معاملہ ہمارے ہاں کا معاشرتی تقاضہ ہے، خاموشی اختیار کرنا پڑی۔

”اچھی بات ہے بیٹا! اس بہانے آپ ہمارے گھر تو آئے۔“

”بس انکل! دعا کریں بہانے ملتے رہیں۔“ عباد نے زیر لب کہا فجر اس کی عجیب و غریب حرکات پر کلشی آمنہ بی کے اشارے پر اس کے ہاتھ سے دوپٹہ لینے لگی، احتیاط کی انتہا تھی کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ہاتھ چھوڑ نہ پایا۔ لڑکی عمر میں کم مگر شعور میں زیادہ تھی، اسے دل میں اعتراف کرنا پڑا۔ دوران چائے اسے شامل نہ دیکھ کر وہ موبائل سگنل نہ ملنے کا بہانہ بنائے باہر نکل آیا، سامنے ہی چھوٹے سے گارڈن میں لائٹ پینک کاشن کی شلوار قمیض میں بالوں کی چوٹی بنائے، چہرے پر آنے والی لٹوں کو بار بار کان کے پیچھے اڑکاتی دشمن جاں پودوں کو پانی دینے میں مصروف تھی اور لبوں پر کوئی نیا ہٹ سا نگ بھی جاری تھا۔ عباد اس کی بے خبری سے فائدہ اٹھا کر خوب تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد اس کے پاس چلا آیا۔

”ہیلو، آپ کی بہن۔“ فجر جھٹکے سے مڑی اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ناپسندیدہ تاثرات کے ساتھ مد مقابل ہوئی۔

”دیکھیں! آپ آپ کی دیور ہیں ٹھیک ہے اسی لئے ہمارے گھر میں آپ کا آنا جانا رہے گا، مگر آپ ناں مجھ سے بات مختصر اور ٹوڈی پوائنٹ کیا کریں، میں اجنبیوں سے زیادہ بات نہیں کرتی۔“ فجر نے طویل لیکچر میں وارن کیا، عباد تلخ الفاظ کے باوجود اس کی دھمکی پر نہیں چڑا۔

”ایک تو آپ ہتے بلا وجہ ہیں۔“ فجر نے مزید تبصرہ کشائی کی عباد کے لبوں کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

”آپ کو میری ہر بات پر اعتراض ہے۔“ عباد نے اس کی آنکھوں میں گہرائی تک جھانکتے ہوئے کہا۔

”جی نہیں مجھے آپ پر اعتراض کرنے کا کوئی شوق نہیں، آپ جیسے بھی ہیں جو بھی ہیں مجھے کیا؟“ فجر کی مختصر بات کا دورانیہ بھی کچھ کم نہیں تھا، وہ کاندھے اچکاتی اس کی طبیعت صاف کئے گئی۔

”مس! میں تو آپ کی دعوت پر آیا تھا، مگر آپ نے گھر آئے مہمان کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔“ فجر کالے پنے چبار ہی تھی، عباد کو لگا جیسے اسے چبار ہی ہو اسی لئے حفظ ماتقدم کے طور پر باور کروایا کہ آنے کا سبب اور رشتے کا لحاظ ملحوظ خاطر ہو، فجر یقیناً سنبھل گئی تھی۔

”ویسے اگر ہم سکون سے بیٹھ کر چند لمحے بات کر لیں، تو کوئی مضائقہ نہیں آفر آل میں آپ کی آپ کی کا دیور ہوں۔“ عباد اونٹ پہاڑ کے نیچے آتا دیکھ کر اڑ گیا، بار بار رشتے کا حوالہ دے کر وہ اسے زیر کرنا چاہتا تھا۔

جو مزید کچھ سخت کہنے سے خود کو روکتے ہوئے اندر دوڑ گئی تھی۔

”اوں لگتا ہے گھی سیدھی انگلی سے نکلنے والا نہیں ہے۔“ وہ خود سے کہتا کچھ سوچتا آگے بڑھ گیا تھا۔

☆.....

کالج کی کینٹین میں سمو سے، برگر، کولڈ ڈرنکس سے مشغول کرتیں وہ لوگ دنیا مافیا سے لے نیاز تھیں، سب سے زیادہ برجوش فجر شاہ تھی جس کی جیب نے ہلکا ہو کر باقی فرینڈ کے پیٹوں کو فل کر دیا تھا، ٹریٹ خوشی کی تھی اور خوشی بھی انتہائی انوکھی کوئی سنے تو یقین نہ کرے۔

خونخوار ٹیچر نے بیسٹ ویلکی برقرار منس بر فجر کو محض زبانی شاباش دی تھی، جو اس قدر حیرت انگیز واردات تھی کہ فجر سے باقاعدہ ٹریٹ وصول کی گئی تھی، جو اس گنجوس نے خوشدلی سے دے بھی دی تھی۔

فجر کا ایک اور کارنامہ دیگر اسٹوڈنٹس کی نظر میں یہ بھی تھا کہ اس نے سرائیکس سے نام بھی دریافت کر لیا تھا۔
اپنی شاندار شخصیت کے عین مطابق ”سرخان“ کا نام لڑکیوں کے نزدیک اسم باکمی تھا۔

”ایمان! سرخان نے پوری کلاس میں صرف میری تعریف کی اور میں ہی واحد لڑکی ہوں جن کو انہوں نے اپنے بارے میں تفصیل سے بتایا، حالانکہ وہ اتنے روڈ ہیں کہ بس پل بھر بس بے عزتی کر کے رکھ دیتے ہیں۔ کل لائبریری میں بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ اقصیٰ نے مخاطب کیا ”سر“ تو کہنے لگے ”ہاں دھاڑو“ بیچاری اتنا شرمندہ ہوئی، مجھے خود ان سے ڈر لگتا ہے، جب وہ میری طرف دیکھتے ہیں تو میری جان ہی نکل جاتی ہے، 45 منٹ کے پیریڈ میں میرا 45 کل خون خشک ہو جاتا ہے۔“

گھر آ کر بھی اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی، وہ مسلسل ایمان کے کان میں گھسی تعریفوں کے پل باندھ رہی تھی۔

”اس ساری تقریر سے میں نے جو باتیں اخذ کی ہیں وہ یہ ہیں کہ ایک تو تم سب ان سے بہت زیادہ ایمپریس ہو، دوسرا وہ کوئی ڈریکولانا چیز ہیں، تیسرا یہ کہ تمہارے اندر 50 کل خون ہے۔“ ایمان نے فجر کی زبان کو بریک لگاتے ہوئے گل افشانی کی لیکن اس پر مطلق اثر نہ ہوا۔

”اور ایمان! وہ تو اپنے کو لیگز کو بھی لفٹ نہیں کراتے اور۔“

”خدا کے لئے فجر! مجھے کسی نا دیدہ شخص کے بارے میں غائبانہ تعارف سے کوئی دلچسپی نہیں کوئی اور بات کرو۔“

”ایمان! ان کی آنکھیں تو بس۔ فجر سرگوشی میں بولی، مگر ایمان اس کے منہ پر تکیہ رکھ چکی تھی۔“

.....☆.....

”فجر.....“ دوڑ کے گیٹ کر اس کرتی فجر رک گئی۔

”جی سر!“ وہ جو بظاہر اسے روک تو بیٹھے تھے، مگر اب تذبذب کا شکار تھے کہ کیا کہنے کے لئے روکا تھا۔“

”سر! وہ میری گاڑی۔“ او کے تم جاؤ۔“

”سر! آپ کچھ کہنا چاہتے تھے۔“

”نتھنگ پھر کبھی سہی جاؤ خدا حافظ۔“ وہ حیرت سے انہیں تکتی دین میں جا بیٹھی وہ خاموشی سے پلٹ گئے۔

”شمن! سرخان اچھے ہیں ناں۔“ فجر دین میں بیٹھے ہی شمن سے مخاطب ہوئی، آج کل اسے سر کی قصیدہ گوئی کے

سوا کوئی کام نہ تھا۔

”ہاں اچھے ہیں مگر مجھ سے خواہ مخواہ کا بیر ہے۔“ شمن کا فرسٹ امپریشن کچھ اچھا نہیں پڑا تھا۔

”شمن! مجھے لگتا ہے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن کہہ نہیں پاتے۔“

”یقیناً گیٹ آؤٹ یا سٹاپ ہی کہنا چاہتے ہوں گے۔“ شمن غیر سنجیدگی سے بولی۔

”شمن! تم سے تو بات کرنا ہی بیکار ہے، ادھر ایمان بھی اسی طرح کرتی ہے میں کس سے بات کروں۔“ فجر بے بسی

سے بولی۔

.....☆.....

”آئیے، آئیے مستقبل کے دہشت گرد کیا حال ہیں؟“ ایمان نے شوخی سے کہا۔

”اللہ کا شکر ہے اور سہلا مل میرے ہاتھوں تمہارا ہوگا۔“ معاذ نے شگفتگی سے جواب دیا۔

”سوچ لو اگر مجھے قتل کر دیا تو میرے ماں باپ ایک بیٹی کے قاتل کو دوسری بیٹی کبھی نہیں دیں گے۔“ ایمان نے

انداز برقرار رکھا۔

”جو میری ہے وہ مجھے مل کے ہی رہے گی، کم از کم تم سے تو جان چھوٹ جائے گی۔“ معاذ نے بے رحمی سے کہا،

رواڈ انجسٹ 130 دسمبر 2015ء

READING
Section

ایمان مزید گل افشانی کرتی مگر آمنہ بی کی آمد نے زبان بندی پر مجبور کر دیا۔
 ”او میرا بیٹا! معاذ آیا ہے تم تو عید کا چاند ہو گئے ہو سال بعد نظر آتے ہو۔“
 ”بس چاچی آج محنت کروں گا تو کل کچھ بن سکوں گا۔“ معاذ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
 ”اور کتنا عرصہ لگے گا؟“

”چاچی! میڈیکل کالاسٹ ایئر تو کمپلیٹ ہونے ہی والا ہے، بس کچھ عرصے بعد میں ڈاکٹر ہوں گا۔“
 ”اور تو کیا اسلام آباد میں ہی مستقل رہو گے۔“ آمنہ بی نے بے صبری سے بات کائی۔
 ”نہیں چاچی! کراچی ٹرانسفر کراؤں گا ناں بھلا اسلام آباد میں کیا رکھا ہے؟“ معاذ نے ایمان کو دیکھتے ہوئے شوخی سے کہا۔

”امی! چھوڑیں اسے وہیں سٹل ہونے دیں، کراچی میں دہشت گردوں کی کمی ہے کیا؟“ ایمان ادھار رکھنے والوں میں سے نہ تھی۔

”سجدہ پلیز جب میں آؤں تو مجھے تم کہنی دیا کرو، اس چڑیل کو دوسرے باپردہ لوگوں کے پاس چھوڑ آیا کرو۔“ معاذ نے بدلہ چکانے میں آمنہ بی کا بھی لحاظ نہیں کیا۔

”ایمان! چائے بناؤ۔“ آمنہ بی نے شوہر کے بھتیجے کی خاطر مدارت کے خیال سے ایمان کو الٹ کیا۔ ”معاذ عبد الغازی کو اس گھرانے میں خاص اہمیت حاصل تھی، جہاں زیب شاہ کے بیٹے کی کمی اس نے ہمیشہ محبت و خدمت سے دور کی تھی، دل میں کیا کیا جذبے پنپنے لگے۔ وہ جان ہی نہ پایا دیدار کے شوق میں وارفتہ پا اس کے جلدی کے پھیرے بالا آخردل پر بیتی واردات سے واقف کرائے، مگر معاملہ ایک طرف ایک ہے یاد، ہنوز ناواقفیت تھی۔“

.....☆.....

”شکر ہے محترمہ کو بھی ہمارے گھر قدیم رنجہ فرمانے کا خیال آیا جب آئے آپ ہی آئے۔“ آج وہ امی کی زبردست جھاڑ کے بعد سجدہ کے گھر چلی آئی تھیں، جس نے شکوؤں کی ٹرین چلا دی تھی۔
 ”ارے آپ! آنے کی خوشی منا میں ناں، نہ آنے کا غم کیوں کر رہی ہیں؟“ ایمان نے پر جوش بغل گیری کے دوران عرض کیا۔

”تمہیں کیا پتہ تم لوگوں کے نہ آنے پر مجھے نند اور دیوروں کے سامنے کیسے کیسے جوابدہ ہونا پڑتا ہے۔“ سجدہ مسلسل شکوہ در شکوہ کناں تھی۔

”لیکن ہمارے نہ آنے سے نند اور دیوروں کے سامنے جوابدہی کی بات سمجھ نہیں آئی آپ!۔“ ایمان اوز فجر نے جانتے ہوئے بھی انجان مٹے ہوئے کہا۔

”بس وہ شادی میں تم لوگوں سے ملاقات رہی تھی ناں ان کی.....“
 ”السلام و علیکم!“ سجدہ کی وضاحت کو عباد کی آمد اور زوردار سلام نے منقطع کر دیا۔
 ”کیسی ہیں آئی آپ۔“ فجر کو دیکھتے ہوئے آمنہ بی کی خیریت دریافت کی گئی۔
 ”اللہ کا شکر ہے بیٹا! تم نے پھر کبھی چکر نہیں لگایا۔“ آمنہ بی نے بھی اخلاقتاً دریافت کیا۔
 ”کیسے آتا آئی! گھر آؤ تو چھوٹے غصے کرتے اور فون کر دو تو بڑے۔“ عباد نے راہ صاف کی۔
 ”نہیں، نہیں بیٹا کون ڈانٹتا ہے یا غصہ کرتا ہے، تم جم جم آؤ تمہارا اپنا گھر ہے۔“

”ایسا ہے آئی! تو میں آتا ہی رہوں گا۔“ عباد نے آتا پر زور دیا جبکہ فجر نے دل میں جس بات پر زور دیا، وہ بیان کے

لائق نہیں اس کی نگاہوں سے بیچ و تاب کھاتی فجر، سجدہ کے بیڈروم کو دیکھنے کا بہانہ کر کے وہاں سے کھسک گئی، مگر شوئی قسمت عباد نے کوریڈور سے گزرتے ہوئے جالیا۔

”فجر پلیز! میری بات سنو“۔ ان سنی کر کے گزرتی فجر کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

”فجر! میں اتنا برا تو نہیں کہ تم مجھ سے اتنی الرجک رہتی ہو، کم از کم شناسائی کا تعلق تو ہمارے بیچ ہے ناں“۔ عباد عاجزانہ لہجے میں بولا محبت انسان کو ایسا ہی عاجز کر دیتی ہے اور جب محبوب لا تعلق بھی ہو، پھر عاجزی بے بسی میں بدل جاتی ہے، عباد کا بھی یہی حال تھا۔

”فجر! میں نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی، جس سے تم پر آنچ آئے میں تو محض دوستی کا خواہشمند ہوں“۔ سدا کی ہمدرد فجر فوراً نرم لہجے میں بولی۔

”دیکھئے! مجھے آپ سے کوئی پر خاش نہیں، ان فیکٹ میں تو آپ کو اچھی طرح جانتی بھی نہیں ہوں، بس میرا مزاج اور میری تربیت ان دوستیوں کی متحمل نہیں ہو سکتی، اس لئے پلیز اپنے دل و دماغ کو امریکہ سے واپس بلا کر پاکستان میں سیٹ کیجئے۔“

”بٹ فجر.....“

”پلیز عباد صاحب، یوں سر راہ روک کر بات کرنا آپ کو معیوب نہیں لگتا، تو پھر آپ کی تربیت میں یقیناً کوئی کمی ہے۔“ فجر کے بجائے ایمان نے آ کر اس کی بات پوری کر دی تھی اور وہ اسے سمجھاتی فجر کو لئے آگے بڑھ گئی تھی۔

☆.....

”سر! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے سر، سر۔“ فجر نے لائبریری میں سر دباتے سرشان کو مخاطب کیا۔

”فجر! میرے سر میں شدید درد ہے۔“

”سر! آپ نے گولی کھائی؟“ سر کے نفی میں سر ہلانے پر وہ منٹوں میں میڈیکل روم سے ٹیبلٹ لے آئی تھی، مگر اب سرشان کو کھلانا ایک بڑا مرحلہ ثابت ہو رہا تھا۔

”رہنے دو میں گولیوں سے پرہیز کرتا ہوں۔“ وہ نفاست زدہ لہجے میں بولے، درد کی اگر حد نہیں تھی تو ضد بھی حد سے سوا تھی، اس کا ہر حیلہ ناکام ہو گیا اور سر نے ٹیبلٹ ہتھیلی سے نہ اٹھائی بالا آخر وہ ہار مانتے ہوئے بولی۔

”سر! آپ کو آپ کی امی نے اس حالت میں دیکھا تو پریشان ہوں گی۔“

”امی..... اوں..... وہ تمام فکروں، پریشانیوں سے آزاد ہو گئی ہیں۔“

”جی سر! میں سمجھی نہیں۔“

”شی از ڈیڈ۔“ سرشان نے دلگزر حکی سے کہا۔

”اوہ..... سر! آئی ایم سوری میں آپ کی امی تو نہیں بن سکتی، لیکن آپ بہن تو بن سکتی ہو، پلیز آپ بہن سمجھ کر

میری بات مان لیں۔“ فجر نے فوراً رشتہ جوڑا۔

”شٹ اپ فجر شٹ اپ! جاؤ یہاں سے میرا دماغ خراب مت کرو۔“ سرشان کے رویے کی اچانک تبدیلی نے اسے دم بخود کر دیا، وہ بنا بولے تیر کی طرح دوڑ لگا گئی۔

”خمن پلیز! تم ایک بار جا کر دیکھو تو سہی۔“ فجر مسلسل خمن کو مجبور کر رہی تھی کہ وہ لائبریری جا کر سر کی حالت دیکھ کر

آئے وہ ان کی طرف سے بہت فکر مند تھی، مگر خمن متوقع بے عزتی کے خیال سے انکاری تھی، اتنے میں علیزہ کی آمد نے دونوں کو متوجہ کیا۔

”فجر! تمہیں سرشان بلارہے ہیں۔“ وہ اطلاع ملنے پر سابقہ ڈانٹ بھلائے دوڑ پڑی، سر ہنوز لائبریری میں تھے اور قدرے نارمل حالت میں بھی۔

”سر! آپ نے بلایا؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا۔

”فجر پلیز! ایک کپ دودھ کے ساتھ سر درد کی ٹیبلٹ دے دو۔“ اس کے پلٹنے کے ارادے کو دیکھ کر وہ فوراً پکار اٹھے۔

”فجر! میں نے تمہیں ڈانٹا تم ناراض تو نہیں ہو۔“ سرشان نے اس کی آنکھوں میں جھانکا وہ آنکھیں جھکانے کے ساتھ سر بھی جھکا گئی۔

”نوسر، سر تو ڈانٹتے ہی رہتے ہیں۔“ وہ سر جھکائے جھکائے بولی۔

”لیکن اگر تم نے دوبارہ ایسی بات کی تو دوبارہ ڈانٹ پڑ سکتی ہے۔“ سرشان نے بدستور اس پر نگاہیں جمائے مسکرا کے کہا۔

”کون سی بات سر؟“ وہ حیرانی سے گویا تھی۔

”خود سوچو۔“ سر مسکرا کے اٹھ گئے جبکہ وہ بات سوچتی رہ گئی۔

.....☆.....

”ہیلو!“

”ہیلو، مجھے سمجھ نہیں آتا کہ ہمیشہ آپ ہی کیوں فون اٹھاتی ہیں۔“ عباد کی چڑچڑاتی آواز نمودار ہوئی۔

”تو آپ فون کرنے سے پہلے بتا دیا کریں کہ آپ کا فون ہے تاکہ میں نہ اٹھایا کروں۔“ ایمان طنزیہ بولی۔

”او کے اب تو پتہ چل گیا ہے پلیز ہیلپ می۔“ عباد نے اسے ہم خیال کرنا چاہا۔

”سوری عباد! ان ٹکوں میں تیل نہیں ہے، آپ کہیں اور ٹرائی کریں۔“ ایمان نے ہری جھنڈی دکھائی۔

”واٹ ڈویو مین کہیں اور ٹرائی کریں۔ آپ نے مجھے ایسا سمجھ رکھا ہے مجھے سمجھ نہیں آتا، ہماری پاکستانی لڑکیاں

ہر امریکن پلٹ کو فلرٹی کیوں سمجھتی ہیں، ہم بھی تو دل رکھتے ہیں اور کسی سے محبت بھی کر سکتے ہیں۔“ عباد نے تفصیلاً اپنا موقف واضح کیا۔

”عباد! ہم آپ کو غلط نہیں سمجھتے، لیکن محبت کا یہ انداز کم از کم ہمارے ماحول سے میچ نہیں کرتا، ہم محبت کو شادی کا دوسرا نام

سمجھتے ہیں، اگر آپ اپنی محبت میں سچے ہیں، تو حیلوں بہانوں کے بجائے سیدھا راستہ کیوں نہیں اختیار کرتے۔“ ایمان نے

بھی آج ٹھان ہی لی تھی۔

”لیکن ایمان! محبت کو دل میں دفن کر دینا بھی تو اپنے ساتھ دشمنی ہے، جب کوئی دل کی بات سمجھ نہ رہا ہو تو اسے

سمجھانے کی سعی تو کی جاسکتی ہے۔“ عباد ٹس سے مس ہونے کو تیار نہ تھا، وہ جانتا تھا کہ یہ باتیں ایمان سے نہیں فجر

سے ہی کر رہا ہے، کیونکہ دونوں بہنیں ایک دوسرے کا پر تو ہی تو تھیں۔

”لیکن مجھے سمجھ نہیں آتی کہ ہر سعی شادی سے قبل کرنا ہی کیوں لازم ہے؟ دل کی بات بنا کسی رشتے کے کیوں

اتنی اہمیت رکھتی ہے۔ عباد جی میرا خیال ہے ہمیں آپ کنویں کا مینڈک سمجھ کر اگر انور ہی کر دیں تو عین عنایت

ہوگی۔“ ایمان نے دو ٹوک موقف کے ساتھ فون بند کر دیا تھا، عباد کے لئے سوچ کا نیا دورا ہوا تھا۔

.....☆.....

”میں گیارہ سال کا تھا جب امی کا انتقال ہوا آخری وقت ان کے پاس صرف میں ہی تھا، میں نے ماں کی تکلیف

رواڈ انجسٹ [133] دسمبر 2015ء

READING
Section

نزع محسوس کی ہے، سمجھو کہ وہ موت میری ماں کی نہیں میری تھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ماں کے بعد مجھے کسی نے سہارا نہیں دیا۔ مجھے پیار کرنے والوں کی کمی نہیں لیکن میری حساسیت نے میرے گرد ایک خول بنا دیا۔ پتہ نہیں میں نے دوست بنائے نہیں یا میرے دوست بنے نہیں، حقیقت یہ ہے کہ میں نے ماں کے بعد کسی سے محبت کی ہی نہیں مگر اب مجھے لگتا ہے کہ ایک ہستی وہ محبت جو میرے اندر دفن ہے وہ پالے گی، وہ ذیشان احمد خان کو پالے گی۔ فجر خاموشی سے ان کی بات سماعت کر رہی تھی، اس ہستی کے متعلق جاننے کے لئے چل اٹھی مگر ان سے کچھ پوچھنا مناسب معلوم نہیں ہوا۔

”سر!“

”ہوں۔“ وہ جیسے خواب سے چونک اٹھے اور جلدی سے بولے۔

”سنو! میں نے کہیں نام تو نہیں لیا۔“

”نہیں سر! میں تو خود پوچھنا چاہ رہی تھی۔“ فجر نے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا، انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ وہ مزید کچھ بتانے کے موڈ میں نہیں لگ رہے تھے، اس لئے فجر نے بھی مزید نہیں کریدا۔ وہ اس وقت کالج کے تھرڈ فلور کے نسبتاً کونے کے کمرے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے، درمیان میں میز بھی سر نے مارک شیٹ تیار کرنا تھی اور فجر کا پیریڈ فری تھا، اس لئے انہوں نے فجر کو اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا تا کہ جلد کام ہو سکے شور سے بچنے کے لئے وہ اوپر چلے آئے تھے۔ سرشان کام کے ساتھ آج بات چیت کے موڈ میں تھے اچانک ہوا کے زور سے کمرے کا دروازہ بند ہو گیا، دن کا وقت تھا اندھیرا تو نہ تھا مگر روم کا باہر سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔

”فجر! تم کچھ کہہ رہی تھیں۔“

سیم اندھیرے میں سر کی آواز گونجی۔

”سر! وہ دروازہ کھول دوں روشنی کم ہو گئی ہے۔“ فجر نارمل انداز میں بولی۔

”رہنے دو خاموشی اچھی لگ رہی ہے۔“ سرشان تو آج سرخونناک لگ ہی نہیں رہے تھے، فجر چونکہ ٹیچر کو نامحرم کا درجہ نہ دینے والوں میں سے تھی اور آئیڈیل شخصیت پر اعتماد بھی حد سے زیادہ تھا، لہذا اسے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا، اس لئے اس نے مزید اصرار نہیں کیا اور اپنے کام میں لگ گئی، لیکن سرشان بہر حال ایک مرد تھے ان کے جذبات فجر سے مختلف تھے، وہ فجر کی مانگ پر نظریں جمائے ہوئے تھے، بے اختیار ہی ان کا ہاتھ فجر کی شفاف مانگ پر جاٹکا تھا، فجر نے چونک کر نگاہ اٹھائی اس نگاہ کی حیرانی نے سرشان کے ہاتھ کو کپکپا دیا، فوراً سنبھل کر بولے۔

”فجر دروازہ کھول دو۔“ وہ فوراً دروازے کی طرف لپکی اور قسمت کے بند دروازے کو کھول دیا۔

”جاؤ تم اب میں خود کام کر لوں گا۔“ وہ ابھی اس کیفیت سے نکلے نہیں تھے۔ فجر جو خود بھی یہی چاہتی تھی، فوراً نیچے کی طرف بڑھ گئی، وہ اپنے ہاتھ کولہوں سے لگا گئے جو اس کے سر سے مس ہوا تھا۔

☆.....

”اے معاذ! کن سوچوں میں گم ہو۔“ ایمان نے معاذ کو ایریل کی مانند گھما دیا۔

”او کے تم آؤ بیٹھو آج کیسے رستہ بھول گئیں؟ ویسے نہ ہی بولتیں تو اچھا تھا۔“ معاذ اس کے خوفناک جھنجھوڑنے پر کچھ زیادہ ہی ہل گیا تھا۔

”کیا مطلب نہ بولتی یعنی کہ نہ آتی۔“ ایمان اکلوتے تایا کے گھر بے دھڑک آنے میں پہلی بار تپ اٹھی تھی۔

”نہیں میرا مطلب اکیلی کیوں آئیں کسی اور کو بھی ساتھ لے آئیں ناں۔“ معاذ بات بتاتے ہوئے بولا۔

”کس کو ماما کو وہ مارکیٹ گئی ہیں، سجدہ کو ارے وہ اپنے گھر کی ہو گئی ہیں، بابا کو وہ آفس میں ہوتے ہیں۔“ ایمان اسے رنج کر رنج کر رہی تھی، اصل مدعا جان کر بھی آئیں بائیں شائیں کئے جا رہی تھی۔
 ”بائی داوے تم سے کب تک جان چھوٹے گی۔“ معاذ اچھا خاصہ گرم ہو چکا تھا جل کر بولا۔
 ”برکی بات معاذ! بہنوں کو مصیبت نہیں کہتے۔“ شمع بی نے داخل ہوتے ہوئے گھر کا ان کے پیچھے سمیہ چائے کی ٹرے کے ساتھ داخل ہوئی۔

”امی! میں کوئی دل سے تھوڑی کہہ رہا تھا، ویسے ہی جھوٹ بہت بولتا ہوں۔“ معاذ نے صفائی دیتے ہوئے اسے مزید چڑایا، جو تائی کے سامنے شرافت کے جامے میں تھی۔

”اوہ ہاں فجر کارزلٹ آ گیا؟“ سمیہ کو اچانک یاد آیا۔
 ”ہاں کل ہی آیا ہے تمام پیپرز کلیئر کر گئے ہیں اس نے۔“ ایمان نے جواب دیتے ہوئے معاذ کی طرف دیکھا، جس کے ہونٹوں نے مبارک باد کی شیب بنائی تاکہ ایمان فجر تک اس کی وش پہنچا دے ایمان نے سر ہلا کر تسلی دی تھی۔ شمع بی کے اٹھتے ہی معاذ نے جھٹ ایمان سے آہستگی سے کہا۔

”رات میں فون کروں گا کوشش کرنا وہ ہی اٹینڈ کرے۔“
 ”مشکل ہے تم یہاں ہو تو وہ فون کم ہی اٹینڈ کرتی ہے۔“

”بھائی! آپ فون پر فجر کی آواز پہچان لیتے ہیں۔“ سمیہ نے سوال داغا۔
 ”آواز تو نہیں پہچانتا انداز سے سمجھ آ جاتی ہے، اگر چاچی اٹھا میں تو تعارف کراتے ہی دعائیں دینے لگتی ہیں، ایمان، سجدہ اٹھا میں تو فوراً کہتی ہیں ”ہاں معاذ کیا حال ہے؟“ اور جب وہ اٹھائے تو کہتی ہے، ”جی فرمائیے کس سے بات کرنی ہے۔“ پتہ چل جاتا ہے محترمہ آن لائن ہیں۔“ معاذ نے تفصیل سے بتایا جس پر ایمان اور سمیہ ہنسنے لگیں، فجر کزین ہونے کے باوجود معاذ سے زیادہ بات نہیں کیا کرتی تھی، ایمان کی طرح دونوں میں بے تکلفی برائے نام بھی نہ تھی، وجہ کیا تھی کوئی نہیں جانتا تھا، ہاں معاذ کے اس کی طرف جھکاؤ سے ہر کوئی واقف تھا۔

.....☆.....

”دیکھئے انکل! عباد میرا چھوٹا بھائی ہی نہیں بیٹا بھی ہے، ہم نے اسے ناز و نعم میں رکھا ہے اس کی کسی خواہش کو کبھی رو نہیں کیا، پھر زندگی کے اتنے اہم معاملے میں اس کی مرضی کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے اور ویسے بھی وہ کوئی غلط مطالبہ نہیں کر رہا۔“ سجدہ کے شوہر غیاث احمد، عباد احمد کا پروپوزل لئے اس وقت فجر کے چھوٹے سے گھر کے خوبصورت ڈرائنگ روم میں براجمان تھے۔ جہانزیب شاہ کے عباد احمد کی طرف رجحان نے انہیں خوب امید بھی دلارکھی تھی اور پھر عباد کی قابلیت اور اعلیٰ معاشی حالت بھی نظر انداز کئے جانے کے لائق نہیں تھی، یہ سب وہ عوامل تھے، جو غیاث احمد کے لب و لہجے میں بول رہے تھے۔

”عباد بلاشبہ ہر لحاظ سے قابل اور بہترین لڑکا ہے، اسے گھر کا داماد بنا کر ہمیں بھی اتنی خوشی ہوگی جتنا تمہیں اپنا داماد بنا کر۔“ جہانزیب شاہ کے پرمسرت جواب نے ماحول کو خوشگوار کر دیا، جس طرح غیاث اس رشتے کے خواہاں تھے، وہیں جہانزیب شاہ بھی متمنی تھے، عباد کی طرف ان کا جھکاؤ بے سبب نہ تھا، سجدہ زیادہ خوش دکھائی نہ دیتی تھی بلکہ وہ غیاث احمد کے یہاں آنے کے مقصد سے اس سے قبل آگاہ بھی نہ تھی اور پھر جہانزیب شاہ کے اثبات نے تو اسے اور بھی حیران کر دیا تھا۔

”بابا! آپ اس رشتے کے لئے ہاں کہہ رہے ہیں۔“ سجدہ نے بے یقینی سے دریافت کیا، پردے کے پیچھے سے

رواڈ انجسٹ [135] دسمبر 2015ء

READING
Section

جھانکتی ایمان کی پھیلتی نگاہیں بھی وہ دیکھ سکتی تھی، خود آمنہ بی کی خاموشی بھی معنی خیز تھی۔
 ”ہاں بیٹا! عباد احمد اچھا لڑکا ہے اور پھر تم دونوں بہنیں ایک ہی گھر میں ایک دوسرے کے ساتھ رہو، اس سے بڑھ کر خوشی کی کیا بات ہو سکتی ہے۔“ جہانزیب شاہ اپنی ہی جون میں کہے جا رہے تھے۔
 ”تو پھر انکل! منگنی ابھی کئے دیتے ہیں، شادی فجر کی اسٹڈی کمپیٹ ہونے کے بعد کر لیں گے۔“
 ”فجر.....“ اب کے جہانزیب شاہ بھی چونک اٹھے تھے، نجانے فریقین کے دماغ کس کے لئے پرسوج رہے تھے؟

”فجر نہیں بیٹا ایمان تم غلط نام لے گئے ہو۔“ اصل مدعا تو اب سامنے آیا تھا، جہانزیب شاہ کا اثبات ایمان کو لے کر تھا جبکہ غیاث عباد کے لئے فجر کا پروپوزل لایا تھا، سجدہ اور آمنہ بی کی بے تابی یونہی نہ تھی۔ دوسری طرف اپنا نام سن کر ایمان کی پھیلتی آنکھیں مزید پھٹ پڑیں تھیں ہاں ایک سکون کی سانس فجر کے سینے سے ضرور خارج ہوئی تھی، وہ ایمان کے برابر ہی دہک کے ساری صورتحال ملاحظہ کر رہی تھی۔

”انکل! میں آپ سے فجر کے رشتے کے سلسلے میں بات کر رہا ہوں۔“ غیاث نے فوراً تصحیح کی۔
 ”نہیں بیٹا! فجر تو ابھی بچی ہے، ایمان بڑی ہے اور عباد کے لئے بالکل مناسب بھی اس کے رشتے کے لئے ہاں کر رہا ہوں۔“ جہانزیب شاہ نے بھی وضاحتی بیان دیا، عجیب کشمکش ہو چلی تھی۔
 ”لیکن عباد کی خواہش فجر کے ساتھ کی ہے اور میرے یہاں آنے کا مقصد بھی یہی تھا۔“
 ”غیاث بیٹا! فجر کے متعلق ایسی بات ممکن نہیں ہے۔“

”کیوں انکل۔“ غیاث کے لہجے میں روایتی داماد کا ساتیکھا پن در آیا، سجدہ کی اصل پریشانی تو اب شروع ہوئی۔
 ”آپ فجر کے لئے ہاں کہتے، ایمان ماشاء اللہ سے قابل بچی ہے، اس کے لئے اور رشتے آ جائیں گے۔“ غیاث اپنے موقف سے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔

”نہیں بیٹا! آپ پر کوئی زبردستی نہیں کہ آپ ایمان کا رشتہ لیں، ماشاء اللہ میری بچی کے لئے واقعی رشتوں کی کمی نہیں مگر فجر کے لئے معذرت۔“ جہانزیب شاہ بھی اب دو ٹوک جواب پر اتر آئے تھے۔
 ”انکار کی کوئی وجہ تو ہو۔“ غیاث نے سجدہ کو گھورتے ہوئے دریافت کیا، اسے اب سبکی محسوس ہونے لگی تھی وہ تو عباد کو 100 پرسنٹ رزلٹ کی امید دے کر آیا تھا، آخر داماد تھا ہمارے معاشرے میں داماد کب سسرال سے خالی لوٹتے ہیں؟
 ”وجہ یہ ہے کہ فجر میرے بھتیجے سے انگیج ہے۔“ جہانزیب شاہ نے جو وجہ بتائی، اس نے غیاث کے ساتھ ساتھ فجر کو بھی حیرت زدہ کر دیا، یہ اطلاع اس کے لئے بھی نئی تھی، معاذ کا اپنے گھر میں مقام وہ اچھی طرح جانتی تھی، مگر اندرون خانہ کیا کچھڑی پک چکی تھی اس سے وہ ہنوز ناواقف تھی، مطمئن سانسوں میں پھر طغیانی در آئی تھی، کشتی پھر طوفانوں کی زد پر تھی۔

.....☆.....

”مس فجر! دودن کی غیر حاضری کی وجہ عنایت فرما سکتی ہیں آپ۔“ سرشان کے ٹھنڈے لہجے نے اسے اور بھی مضمل کر دیا، تین دن تک خود کو حقیقت باور کرانے میں لگے تھے کہ اس کا فیصلہ مستقبل، ماضی بعد میں ہی کر دیا گیا تھا، اس شخص کے ساتھ جسے آج تک اس نے اچھا تو کیا برا تکلم بھی نہیں کیا تھا، دو گھرانوں کا واحد چشم و چراغ گھر کے ہر فرد سے وابستگی کے باوجود نہ تو معاذ نے اسے کبھی خود سے مخاطب کیا تھا اور نہ ہی فجر نے کبھی غیر ضروری بات کی تھی۔ معاذ دل کے جذبات دل ہی میں رکھنے کا قائل تھا، اس کے برعکس عباد احمد نے پل بھر کی دیر بھی نہ کی تھی،

حکایت دل عیاں کرنے میں اور وہ خود تھی کہ دونوں کے نقطہ نظر سے متفق نہ تھی، آخر اس کی بے چینی کا سبب کیا تھا؟
 ”سر! میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“ پتہ نہیں کیا بات تھی دل تو پہلے بو جھل تھا، سر کے سر دروئے نے کیوں اتنی تکلیف دی تھی؟

”اور دودن میں طبیعت ٹھیک ہو گئی، آپ لوگوں کا بخار بھی تو جادو کی طرح ہوتا ہے چھڑی گھمائی حاضر، چھڑی گھمائی غائب۔“ سر بھگو بھگو کے تیر چلا رہے تھے، کیونکہ ان کے نزدیک یہ اسٹوڈنٹس کا کامیاب ترین بہانہ تھا۔ ”نو سر! طبیعت تو اب بھی خراب ہے، زبردستی چلی آئی ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں پانی بھرنے لگ گیا تھا، اگرچہ اسے دودن بخار نہیں تھا، مگر سر شان نے دومنٹ میں بخار کر دیا تھا۔

”اچھا ذرا دکھاؤ میں تمہارا بخار تو چیک کریں۔“ سر شان تو آج کسی مروت کے موڈ میں تھے ہی نہیں، فوراً اسے طلب کر لیا شاید دودن کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کا ارادہ تھا، وہ مارے باندھے اپنے منج سے سر کے قریب چلی آئی تھی، تمام کلاس اس کی کلاس ہوتے دیکھ رہی تھی اور محفوظ بھی ہو رہی تھی، کیونکہ یہ پہلی بار تھا جب سر شان نے اسے کھڑا کیا تھا ورنہ بریلیئنٹ Breliant اسٹوڈنٹ کے تحت وہ ہمیشہ سر کی شفقت وصول کنندہ رہی تھی۔ مگر دوسرے ہی لمحے ساری کلاس آنکھیں پھاڑے سامنے کا منظر تک رہی تھی۔ سر شان نے فجر کی کلائی تھام کر نبض ہی چیک نہیں کی، ماتھے پر انگلیاں ٹکا کر حرارت بھی نوٹ کی تھی، خود فجر سر کے پرفیوم کی مہک سے پزل ہو رہی تھی، جنہیں دور سے دیکھ کر لڑکیاں آہیں بھرتی تھیں، وہ اس کے اتنا قریب کھڑے تھے کہ اس نے سر کی ناک پر تل کا نشان تک دیکھ لیا تھا، جو دور سے واضح نہیں ہوتا تھا وہ جھینپ کر نگاہیں جھکا گئی۔ سر شان کے لبوں پر بڑی جاندار مسکراہٹ تھی۔

”او کے تمہاری نبض بتا رہی ہے کہ تمہیں واقعی دودن قبل بخار تھا، او کے جاؤ اور اپنی سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔“ وہ گرتے پڑتے کلائی کے آزاد ہوتے ہی اپنی سیٹ پر آگری، باقی کلاس تو ابھی تک اس سعادت سے محروم ہونے کا دکھ منا رہی تھی، کسی عقل ماری کو یہ تک خیال نہیں آیا کہ بھلا نبض دیکھ کر دودن قبل بخار ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کون سے میڈیکل میں ہوتا ہے۔

.....☆.....

”اکیسویں صدی میں رہتے ہوئے تم لوگ سترہ، اسی دہائی سے نکل نہیں پائے، اس دور میں بچپن کے رشتوں کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے، اب وہ دور کہاں ہے؟ جہاں داد دادی کے بنائے اصول آخری سل تک چلتے تھے۔“ غیاث لاوہ کی طرح سجدہ کے سر پر چڑھے جاتے تھے، آج تیسرا دن تھا جہانزیب شاہ کے واضح انکار کے بعد غیاث اور عباد نے سجدہ کی ناک میں دم کر دیا تھا۔ کبھی دلائل کے انبار لگائے جاتے تو کبھی دھمکیوں سے قائل کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی، وہ بے چاری تو مفت میں پس گئی تھی۔

”لیکن غیاث! فجر کا رشتہ بچپن میں نہیں چند سال قبل طے ہوا ہے، اور پھر آپ کے بھائی کی پسند یکطرفہ ہے فجر اس میں انوالو نہیں۔“ وہ یہ بات کوئی اٹھارہویں مرتبہ کہہ رہی تھی، مگر وہی بھینس کے آگے بین بجانے والا حساب تھا۔

”میں نہیں مانتا تمہاری بہن کی مرضی کے بنا عباد کبھی پروپوزل لے جانے کی بات نہیں کر سکتا تھا، وہ تمہاری فیملی کی طرح 70 کا بدھو نہیں، آج کا پریکٹیکل نوجوان ہے، اس نے پہلے سب معاملات کلیئر کر کے ہی ہمیں بات بڑھانے کا کہا ہوگا۔“ غیاث کسی طور مان کے نہیں دے رہے تھے دوسری طرف عباد نے خود کو کمرے میں بند کر کے

انگ پوری فیملی کو پریشان کر رکھا تھا، تبھی تو سجدہ کو پریشان کیا جا رہا تھا۔
 ”لیکن فجر ایسا نہیں کر سکتی، وہ ماں باپ کے فیصلے کے خلاف کبھی کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی“۔ سجدہ بھی اپنا کیس لڑنے کی پوری سعی کر رہی تھی۔

”بس سجدہ! میں کچھ نہیں جانتا اپنی ماں کے کان میں بات ڈال دو، فجر کا رشتہ صرف عباد سے ہوگا ورنہ کوئی رشتہ باقی نہیں رہے گا“۔ غیاث نے ماں کی بڑھائی پٹی انتہائی بے دردی سے سجدہ کے کان میں انڈیلی، وہ دل میں سوچتی رہ گئی کہ اکیسویں صدی کی ویل آف فیملی کہلانے کا دعویٰ کرنے والوں کا مینٹل لیول ایک جاہل چنے فروش سے زیادہ نہیں تھا۔

.....☆.....

”چپ چپ بیٹھے ہو ضرور کوئی بات ہے“۔ کان کے بہت پاس گنگناہٹ نے اسے حقیقت کی راہ دکھائی، جانے کن بھول بھلیوں میں بھٹکا پھر رہا تھا۔ ایمان کی شرارتی صورت اور بے سری آواز اسے ستانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔

”اے کیا پوچھا ہے میں نے؟“ ایمان نے وار خالی جانا دیکھ کر یاد دہانی کرائی۔ بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی“۔ معاذ بالا آخر میدان میں اتر ہی آیا۔
 ”اوائے، ہوئے دس سال گزر گئے، ابھی تک جناب کی مشکل حل نہیں ہوئی“۔ ایمان نے اس کی طویل خاموشی پر جی بھر کے مذاق اڑایا۔

”بات تھی بھی ایسی معاذ کی فجر میں دلچسپی کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی، وہ بچپن سے ہی فجر کو بہت عزیز رکھتا تھا، اس کی ضروریات کو اس کے گھر والوں سے زیادہ سمجھتا تھا۔ زیادہ تر وقت اس کے گھر میں گزارتا، اپنے تمام کھلونے اس کی نذر کر دیتا، اس کی ذرا سی فرمائش پر بھاگ بھاگ کر جانا اس کا ہمیشہ سے وطیرہ رہا تھا، عمر کے ادوار کے ساتھ انداز شوق پہلے سے نہ تھے، مگر دل کی دھڑکنیں آج بھی اسی ساز پر دھڑکتی تھیں، فجر اس کے برعکس ہمیشہ سے لئے دئے انداز رکھتی تھی، نہ تغافل تھا نہ وابستگی، معاذ نے بھی اس کے گرد خول کو توڑنے کی کبھی کوشش نہیں کی، اپنی ہی چاہت کی دنیا بسائے خود ہی اس میں رنگ بھرے جاتا تھا۔ ان کی نسبت طے پانے میں بھی معاذ کے کسی عمل کا دخل نہیں تھا، یہ سراسر بھائیوں کے آپس کی صلاح تھی، جو رشتوں کو استحکام بخشنے کی ایک کوشش تھی، یوں اس کی خوشی خود بخود اس کا نصیب بننے جا رہی تھی۔

”سمیہ! فجر تمہیں اچھے رزلٹ کی مبارک باد دے رہی تھی“۔ ایمان کی آواز نے ایک بار پھر اسے جھنجھوڑا، کب سمیہ اور شمع بی ان کی محفل میں شریک ہوئیں اسے تو پتہ ہی نہ چل سکا۔

”مجھے نہیں چاہئے اس کی مبارک باد سے کہنا خود آ کر دے گی تولوں گی“۔ سمیہ نے پیار بھری خفگی کا اظہار کیا۔
 ”وہ نہیں آئے گی جب تک محترم یہاں ہیں“۔ ایمان نے سمیہ کے کان میں سرگوشی کی، معاذ اشاروں کی زبان سمجھ گیا تینوں ہنس پڑے۔

”معاذ! پھو ہڑ کم سے کم اس سے ایک بار بات کر کے تو دیکھو وہ تو جب سے خبر سنی ہے سکتے میں گھوم رہی ہے، مجھ سے تو بات ہی نہیں کرتی سمجھ نہیں آتا خوش ہے کہ ناخوش“۔ ایمان نے شمع بی کے اٹھتے ہی اسے ایک بار پھر گھیرا، وہ یہ کوشش پچھلے کئی سالوں میں کئی بار کر چکی تھی، مگر معاذ کے چپ ٹوٹتے ہی نہ آئی تھی وہ ایک دوسرے کے حسین رازوں کے امین تھے۔

”ایمان! بڑے راضی ہیں تو پھر کیا مسئلہ ہے؟ وہ من پسند نتائج کے بعد لا پرواہ انداز میں گویا تھا، بغیر ہلے جلے کام جو بن گیا تھا۔“

”اتنا آسان مت سمجھو سجدہ آپنی کے سرال میں اچھی خاصی پرابلم چل رہی ہے، صورتحال ہاتھ سے نکل بھی سکتی ہے، فجر کا تم سے متفق ہونا ضروری تھا۔“ ایمان نے بالا آخروہ بات کہہ ہی دی جسے کہنے کے لئے آج آئی تھی وہ ہر طرح کے حالات سے آنکھیں بند کئے بیٹھے شخص کو آگاہ کرنا چاہتی تھی، مگر کچھ خاص اثر ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

”اگر تم چاہتی ہو کہ میں اس سے بات کروں تو وہ میں کروں گا نہیں۔“ معاذ نے بھی صاف صاف جواب دیا۔

”کیوں.....؟“ ایمان اور سمیہ کی بیک وقت کیوں برآمد ہوئی۔

”یار! وہ اتنی نادان ہے مجھے ڈر لگتا ہے اگر میں اس سے کچھ کہوں گا تو یا اس کا ہارٹ فیل ہو جائے گا، یا وہ ایسی شکل بنائے گی جیسے دیکھ کر میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔“ معاذ کی بات پر فکر میں کھلتی ایمان کی ہنسی چھوٹ گئی، بات کسی حد تک سچ بھی تھی دونوں اس کے مزاج سے واقف تھے۔

”لیکن معاذ! اگر فجر نے تمہیں اس معاذ پر تنہا کر دیا تو پھر۔“ ایمان کے خدشات اپنی جگہ ڈٹے ہوئے تھے۔

”میں بلا وجہ کے وہموں میں نہیں پڑنا چاہتا، مجھے صرف اتنا پتہ ہے کہ اگر میری چاہت میں سچائی ہے تو کاتب تقدیر نا انصافی نہیں کرے گا۔“ وہ پر عزم تھا ایمان اس کے چہرے پر بکھرے محبت کے رنگ دیکھے گئی۔

☆.....

فون کی بیل نے نیند میں ہلکولے لیتی فجر شاہ کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

”ہیل.....“ ہیلو کا ”و“ اس کی جمائی میں ڈوب گیا۔

”و علیکم ہیل“ دوسری طرف بھر پور صبح کا تاثر لئے بغیر ہیلو برآمد ہوا۔

”کون؟“ وہ ہنوز نیند کے اثر میں تھی، ایک سنڈرے ہی تو ملتا تھا دیر تک سونے کے لئے اسے بھی برباد کرنے کوئی چلا آیا تھا، یہ اور بات ہے اگر وہ آنکھ کھول کر گھڑی دیکھتی تو گیارہ بجے صبح کے دوپہر میں بدلنے والے تھے۔

”کیسی ہیں آپنی کی بہن۔“ عباد احمد کے مخصوص انداز نے اس کی آنکھیں پٹ سے کھول دیں، یہ پہلی مرتبہ تھا جب عباد نے پروپوزل کے انکار کے بعد اس سے رابطہ کیا تھا، وہ اس ناگہانی کے لئے قطعاً خود کو تیار نہ پائی تھی۔

”خوب میزبان ہیں آپ لوگ، ہمیشہ مہمانوں کو نامراد ہی لوٹاتے ہیں۔“ عباد نے اس کی مسلسل خاموشی پر گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھایا بلکہ فوراً مطلب تک لے آیا۔

”دیکھئے! آپ آپنی کے دیور ہیں اس لئے میں.....“

”آپنی کے دیور کی خوب کہی انکار کرتے وقت یہ بات پیش نظر نہیں تھی۔“ عباد نے اس کی تنبیہ کورستے میں ہی کاٹ کر خوب چبا کر معاملے کی نزاکت کی طرف اسے متوجہ کیا۔ وہ واقعی کچھ کہنے کے لائق نہ تھی، عجب دھونس تھی نئے رشتے کی خاطر پرانے رشتے کو سولی پر چڑھایا جا رہا تھا۔

”فجر.....“ عباد اپنے لہجے کی بد صورتی پر یکدم شرمندہ سا ہو گیا، شہد آگئیں تنفس کے ساتھ اسے پکارا۔

”فجر میری خامیاں تو گنوا دو، کوئی فرد جرم ہی عائد کر دو، کوئی دفعہ نافذ کر دو کم مائیگی کے اس احساس سے نکال دو بہت تکلیف دہ ہے۔“ اس کے ہر لفظ سے اس کی تڑپ عیاں تھی، فجر سنگ پرست تو نہ تھی کہ کسی کو مٹی میں رول کر خوشیاں مناتی، شیشہ دل پر درد دستک دیتے تھے، مگر پارسانی صنف کو ہر آنسو پر پھل جانا گوارا نہ تھا۔

”عباد صاحب! انکار کاریزن میرے بابا بتا چکے ہیں، خواہش کرنا آپ کا حق تھا، تو میرے لئے بہتر سے بہتر

سوچنا میرے والدین کا حق ہے، اگر ایک کی حق رسائی سے دوسرے کی حق تلفی ہو تو طرف کا دامن وسیع کر لینا ہی سکون دیتا ہے۔ جوڑ توڑ کرنے کی سوچ رکھنے والے سکون کی نعمت کسے پاسکتے ہیں؟“ وہ ٹھہر ٹھہر کر بولتی اپنا مطمع نظر، عباد کے متعلق اپنی سوچ حتیٰ کہ آئندہ کا اپنا فیصلہ تک اس پر واضح کر چکی تھی، جواباً کچھ کہنے کی حسرت وہ دل میں لئے رہ گیا کیونکہ وہ معذرت کر کے فون بند کر چکی تھی، عجیب شش و پنج اسے گھیرے میں لئے ہوئے تھی، اپنی خواہش تک رسائی یا محبوب کے دل میں کسک بن کر قیام آئندہ کا لائحہ عمل کیا ہو؟

.....☆.....

آج کانج رنگوں سے نہایا ہوا تھا سفید کپڑوں کی اپسرائیں رنگین تیلیوں کی مانند یہاں سے وہاں سرگرداں تھیں، لانگ شرٹس کی دراہنی آنکھ کو خیرہ کئے دے رہی تھی، اسٹوڈنٹس ہی نہیں ٹیچرز کے بھی رنگ نرالے تھے، عام دنوں میں ڈھنگ سے بال بھی نہ بنانے والی ٹیچرز کے ہیئر اسٹائل اور میک اپ لڑکیوں میں مستقل زیر بحث تھے۔ کانج کے سالانہ مینا بازار کے انعقاد میں سب کی جان توڑ کاوش تھی، اسٹوڈنٹس کی مختلف ٹولیوں نے مختلف اسٹالز لگا کر شرکاء کو لوٹنے کے تمام انتظامات مکمل کر لئے تھے کون کتنے کا ہدف حاصل کرے گا باقاعدہ شرطیں باندھیں گئی تھیں۔ لائٹ پنک کلر کے پلین جار جٹ کی لانگ شرٹ پر شاکنگ پنک اسٹالر گلے میں ڈالے ڈھائی انچ کی سلور بالیاں پہنے، بالوں کو ننھے سے کچر میں ذرا سا سامنے کولا پوری چپل میں فجر شاہ کے رنگ روپ کی الگ ہی چھب تھی، مگر چونکہ آج ہر ایک دوسرے سے بڑھ کر بناؤ سنگھار کئے تھا۔ سو کسی ایک کو داد دینا مشکل تھا چائے کا اسٹال لگا کر اس نے اپنی دانست میں سب سے ہلکا اور کم بجٹ والا کام چنا تھا، مگر چائے کے شوٹین کراچی والوں نے اسے اچھا خاصہ ہلکان کر دیا تھا، نتیجتاً اس نے ٹمن کو بھی اپنی مدد کے لئے شامل کر لیا تھا۔

”اے فجر مس! انعم کو دیکھا ہے یا وہ تو کپڑے پہننا بھول ہی گئی ہیں“ ٹمن کے پراسرار طریقے سے اطلاع دینے پر اس کی آنکھیں پھٹی اور سانسیں ٹھم سی گئیں۔

”کیا کپڑے؟“

”ارے نہیں پاگل میرے کہنے کا مطلب تھا لباس میں بہت کچھ لیس ہے؟“ ٹمن نے اس کی غیر ہوتی حالت دیکھ کر اپنی تصحیح کی مبادادہ گر کر بے ہوش ہی نہ ہو جائے۔

”کیا مطلب کیا اول فول بول رہی ہو؟“ فجر کی جیسے جان میں جان آئی تھی، بھلا استاد کے بارے میں ایسی بات کا تصور بھی کیسے کیا جاسکتا ہے؟

”اور کیا میض سلیز لیس، دوپٹہ غائب شدہ ہنخوں پر شلو اور نادر گلے پر سے.....“

”ارے تو تجھے کیا ہے، پہننے دے جو پہنتی ہیں“ فجر نے اس کی نامعقول تفصیلات کو بریک لگائے۔

”کیا مطلب پہننے دیں، ارے وہ ہماری ٹیچر ہیں ہمارے سامنے ان کا ایک امیج ہے، یہ ہماری تربیت گاہ ہے، انہیں اپنے پہناوے میں اس بات کا لحاظ رکھنا چاہئے“ ٹمن اپنے موقف سے ہٹنے کے لئے تیار نہ تھی۔

”لیکن وہ ایک عورت بھی تو ہیں اپنی مرضی سے جیسے چاہیں رہیں یہ ان کا حق ہے اب ٹیچر ہو کر وہ ہماری پراپرٹی تو نہیں بن گئی ناں“ فجر بھی اس کو قائل کرنے کے لئے شروع ہو گئی۔

”تو اس طرح سے اپنے حق کا استعمال کر کے وہ اپنے اسٹوڈنٹس کو کیا تعلیم دے رہی ہیں کہ بس اپنے دل کی کرو کسی کی نہ سنو نہ سمجھو“ ٹمن اسے ہم خیال کئے بغیر چھوڑنے والی نہیں تھی۔

”نہیں وہ اس طرح کر کے اپنا معاشرتی حق استعمال کر رہی ہیں“ فجر اپنے خیال کی عینک آنکھوں پر چڑھائے

ہوئے تھی۔

”مثلاً کون سا معاشرتی حق.....“ سرشان کی بھاری آواز سے دونوں کئی فٹ اونچا اچھلی تھیں۔ آس پاس کے اسٹالز پر بھی لڑکیاں پوری طرح ان کی طرف متوجہ تھیں، ہجوم میں سر کی آمد اور بطور خاص فجر کے اسٹال پر شریف آوری کسی کی نظر میں نہیں آ پائی تھی۔

”سر آپ..... آئیے چائے لیس گے آپ۔“ فجر کی بوکھلاہٹ اس کے اسٹال کے لئے خطرہ ثابت ہو سکتی تھی، مگر اسے ہوش کب تھا؟

”ہاں کیا کہہ رہی تھیں تم معاشرتی حق کچھ وضاحت کرو گی۔“ سر نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا، ثمن اور وہ ایک دوسرے کو تنگے جا رہی تھیں، وہ تو بس بات برائے بات کا ایک ذریعہ تھا، سر کب سے ان کی باتیں سن رہے تھے اور کیا کیا سنا تھا ثمن کو تو اپنی ابتداء بات کی شرمناکی ہی غرق کئے دے رہی تھی۔

”سر! ہم تو بس ایسے ہی فضول سا بول رہے تھے، بس یونہی۔“ فجر کی گرامر تازہ توڑ جا رہی ہو گئی، سر کے سامنے ضروری بات بھی دس بار سوچ کر بولنے والوں کے لئے غیر ضروری بولنا کس قدر محال تھا صاف نظر آ رہا تھا۔

”یقیناً تم لوگ پرسنلی ڈسکس کر رہے تھے، مگر بحیثیت ایک استاد کے تمہاری سوچ کو واضح سمت دینا میرا فرض ہے، تم نے کہا معاشرتی حق، کیا تم بتا سکتی ہو اپنے لباس کی بے احتیاطی سے کسی عورت کا کون سا حق متعین ہوتا ہے؟ اگر ایک عورت کو ہر قسم کے پہناوے کا حق حاصل ہے، تو کیا یہ حق تم اپنی ماں کو دینا پسند کرو گی، وہ بھی ایک عورت ہے۔“ سر فجر کو نشانے پر لئے تھے، گویا انہیں فجر کے نقطہ نظر سے اختلاف تھا ثمن کی جان میں جان آئی تھی۔

”نہیں سر! میرا کہنے کا مطلب تھا ہمیں کسی پر اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟“ فجر نے مسناتے ہوئے بات مکمل کی۔

”نہیں ہمیں کسی کے جائز فعل پر اعتراض کا کوئی حق نہیں اور ایسا فعل جو انفرادی نوعیت کا ہو، جس سے کسی دوسرے پر اثرات مرتب نہ ہوں، وہ فعل تنقید کے لائق تو ہیں مگر اختلاف کی گنجائش نہیں، مگر ایک ماں اور ایک استاد کا کوئی بھی عمل انفرادی نہیں ہوتا، کیونکہ وہ تربیت گاہیں ہیں، وہ نمونہ عمل ہیں انہیں دیکھ کر بچے سیکھتے ہیں، ان کے عمل کی لا پرواہی پر اعتراض تربیت پانے والوں کا حق ہے اور جہاں تک معاشرتی حق کے حوالے سے بات ہے، تو کیا ہم نشہ کرنے والوں کو یہ کہہ کر اگنور کر دو گی کہ اس کا معاشرتی حق ہے، جو چاہے کھائے پئے، چور، ڈاکو، دہشت گرد اس بنا پر نظر انداز کر دیئے جائیں کہ یہ ان کا معاشرتی حق ہے جیسے چاہیں رہیں۔“ سرشان نے اپنے منصب کا فریضہ سر انجام دیتے ہوئے ان کی صحیح کی تھی، سوچ کو درست سمت کی طرف موڑنے کی سعی کی تھی۔

”ثمن! ٹھیک کہتی ہے انسان کو اپنے مرتبے اور مقام کو سامنے رکھ کر اپنی پسندنا پسند کو متعین کرنا چاہئے، کتاب رٹو ادینا، امتحان پاس کر ادینا استاد کا فریضہ نہیں، اپنے ہر عمل سے اعلیٰ نمونہ پیش کرنا اسٹوڈنٹس کو صحیح غلط کی تمیز کرانا اصل مقصد ہے، خواہ اس کی تکمیل میں اسے اپنی نفسیاتی خواہشات کا گلا گھوٹنا پڑے۔“ گھول کر دماغ میں ڈال دینا شاید اسی لئے کہتے ہیں وہ اپنے مطمع نظر کو دلائل کے ساتھ ان کے ذہنوں میں انڈیل کر ذہن و دل کو شفافیت پہنچا چکے تھے۔ ثمن کے چہرے کے ایکسپریشن سے فجر کو اپنی جیت کا مرثوہ سنایا، جو ہر بات سے متفق ہونے میں کوئی سکی محسوس نہیں کر رہی تھی۔

”وہی اچھی چائے پینا میرا معاشرتی حق ہے۔“ سرشان نے ماحول کو خوشگوار بنانے کے لئے سر جھکائے فجر کے سر پر انگلی بجائی اور مسکرا کر بات کا رخ موڑ دیا۔

”جی سر! ابھی بناتی ہوں۔“ وہ فوراً ایکٹیو ہو گئی، سر کے ہاتھ میں کپ تھماتے ہوئے آس پاس کی کھڑی لڑکیوں کو اپنے اپنے کام سے لگو کا اشارہ دے چکی تھی۔ سرنے چائے کا ایک ہی گھونٹ لے کر واپس رکھ دیا، وہ وجہ دریافت کرنا ہی چاہتی تھی کہ سرنے اسٹال کے بورڈ پر لگی قیمت اس کی طرف بڑھائی وہ شپٹا گئی۔

”نوسر! اس کی ضرورت نہیں آپ نے چائے پی ہی کب ہے؟“

”یہ قیمت اس بات کی ہے کہ تم نے مجھے چائے کے ذائقے سے روشناس کر دیا ہے، یہ ایک گھونٹ میری زندگی کا پہلا Sip of tea ہے۔“ سر کی بات نے اسے حیران کر دیا، دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو چائے نہیں پیتے اس کے تودن میں پئے گئے چائے کے کپ گننے میں بھی نہیں آسکتے تھے۔

”سر! چائے کیسی تھی؟“ سر کو مڑتے دیکھ کر وہ بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

”اثریکٹو تمہاری طرح۔“ سر کہہ کر جا چکے تھے مگر ”تمہاری طرح“ کی صدائیں اسے حصار میں لئے ہوئے تھیں شمن کی تو معنی خیز مسکراہٹ ہی ختم ہونے کو نہ آ رہی تھی، جبکہ وہ خلاء میں تھی یا زمین پر اسے کچھ خبر نہ تھی۔

☆.....

”سجدہ! خود ہی سوچ یہ کیسے ممکن ہے؟“ آمنہ بی پریشانی سے بولیں، بالا آخر بات قابو میں نہ آتی دیکھ کر سجدہ والدین کے آگے دست سوال دراز کئے ہوئے تھی۔

”ماما! میں نے انہیں سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر ان پڑھے لکھے جاہلوں پر کچھ اثر نہ ہوا آپ بتائیں میں کیا کروں؟“ سجدہ کی اضطرابی کیفیت سے اسے پریشانی سے بھر پور اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

”ہم نے تو اپنی دانست میں تمہیں ایک پڑھی لکھی، معاملہ فہم فیملی میں بیایا تھا، کیا معلوم تھا خدا اور انسان کو ایک ہی لائن میں کھڑا کر دیتی ہے۔“ آمنہ بی کا تفکر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا، بیٹی کا بسا بسا گھرا جڑا کون ماں دیکھ سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ سجدہ کے لئے ایک بہترین سنرال تھی، مگر لاڈلے بیٹے کی مجھے چاند چاہنے کی فرمائش پر وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھے۔

”بابا جان! میں نے انہیں سمجھانے کے ساتھ ساتھ ٹالنے کی کوشش بھی کی ہے، یہ کہہ کر عباد اپنا بزنس سیٹل کر لے تب تک فجر کی اسٹڈی بھی کپلیٹ ہو جائے گی، سوچیں گے مگر عباد کچھ سننے کو تیار نہیں، وہ انہی دنوں میں منگنی کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔“ سجدہ نے کافی دیر سے خاموش بیٹھے جہانزیب شاہ کو مخاطب کیا، جن کی دلی اذیت سے وہ خوب واقف تھی، دنیا میں فقط ایک ہی بھائی کا وجود موجود تھا، جسے خود سے مزید جوڑنے رکھنے کے لئے انہوں نے یہ رشتہ استوار کرنا چاہا تھا، اور سب باتوں کی ایک بات معاذ ان کا ہر دل عزیز تھا۔ شروع ہی سے اسے جان سے بڑھ کر چاہتے تھے بھائی کو رشتے سے انکار گویا دلوں میں فصیلیں بنانے کے مترادف تھا، دوسری طرف سجدہ کے ساتھ نا انصافی بھی انہیں کھائے جا رہی تھی۔

☆.....

”ایمان تمہیں کیا بتاؤں؟ وہ جب بات کرتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ وہ بات کرتے رہیں اور ہم سنتے رہیں۔“

”کون کس کی بات کر رہی ہو؟“ ایمان جو گھر میں پھیلی کشیدگی کے زیر اثر تھی، ہر بات سے لاعلم فجر کی آواز پر چونک اٹھی جو کافی دیر سے بیڈ پر لیٹی چھت کو تک رہی تھی جب بولی تو معلوم ہوا سوچ کیا رہی تھی؟

”کالج کی ہر لڑکی کے فیورٹ نیچر ”سرشان“۔ وہ ہنوز اسی کیفیت میں بولی چہرے پر شوق کا جہان آباد تھا۔

”ایک تو تم سب سرشان سے کچھ زیادہ ہی امپریس ہو۔“ ایمان اس کی حالت سے چڑتے ہوئے بولی۔

”ایمان! وہ اتنی ماورائی سی شخصیت معلوم ہوتے ہیں، کہ مجھے لگتا ہے وہ اس جہان کی مخلوق ہی نہیں ہیں۔“

”فجر! کنٹرول یور سیلف اتنی انسپائریشن اچھی نہیں۔“ ایمان نے بڑی بہن ہونے کا حق ادا کیا۔

”ایمان! وہ بوائے فیس جتنے اچھے ہیں، بوائے نیچر اس سے بڑھ کر ہیں، وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے اور.....“

فجر پر تو کچھ اثر دکھائی نہ دیتا تھا۔

”فجر میں تمہارے سرشان پر کتاب لکھنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی، تم اپنی تفصیلات بند کرو۔“

”ایمان! وہ لڑکیوں سے ذرا بھی فری نہیں ہوتے، حالانکہ سب ان سے بات کرنے کے لئے کیا کیا جتن کرتی

ہیں وہ مونا ہے ناں وہ۔“

”فجر! میں مونا کی بے وقوفی پر داد دینے والی نہیں، تم بھی ایسی احمقانہ حرکتوں پر توجہ نہ دیا کرو۔“

”ایمان وہ جس دن کلاس میں نہیں آتے لڑکیاں اتنی اداس ہوتی ہیں، بلکہ مونا کا گروپ کہہ رہا تھا، سر کی ڈانٹ

سننے کی عادت پڑ گئی ہے، اب جس دن ڈانٹ نہ پڑے کھانا ہضم نہیں ہوتا۔“

”فجر کی بچی بس کرو یہ قصہ اب کوئی اور بات کرو۔“

ایمان! ان میں ایک کشش ہے وہ سب سے جدا لگتے ہیں۔“

”فجر خدا کے لئے بس کرو اگر میرے پاس سونے کے لئے کوئی اور جگہ ہوتی تو کب کی تم پر لعنت بھیج کر جا چکی

ہوتی، میری مجبوری کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ۔“

”ایمان! تم ان سے ایک بار مل کر دیکھو، میں دیکھتی ہوں تم کیسے اس ذکر میں دلچسپی نہیں لیتیں۔“ اب فجر کو اس کی

بیزارگی نے متوجہ کر ہی لیا۔ وہ آئیڈیلزم کی انتہا پر تھی، سرشان کی مینا بازار والی استاد کے مقام و مرتبے والی تقریر نے تو

اسے اور بھی ان کا گرویدہ بنا دیا تھا، پتہ نہیں وہ اپنے دل میں انہیں کیا مقام دیئے ہوئے تھی؟

”ایمان! سر کی آنکھیں بھی اتنی خوبصورت ہیں، ان آنکھوں کا بند ہونا ان کا حسن نہیں بلکہ ان کا شرافت سے

بھر پور ہونا ان کی خوبی ہے۔“

”فجر! کیا سرشان کی آنکھیں معاذ کی آنکھوں سے زیادہ حسین ہیں؟“ ایمان کا تیرنشانے پر لگا، وہ جو اس کی

ہر بات سے بے نیاز اپنی ہی کئے جا رہی تھی، تھم ہی گئی، اس کی آنکھیں ایمان کے چہرے پر جم گئیں اور ہاتھ آپس

میں جڑ گئے ایمان اپنی ترکیب پر خوش تو تھی، مگر وہ اندازہ نہ لگا سکی کہ آیا فجر کی یہ کیفیت کیا معنی رکھتی ہے؟

☆.....

جہانزیب فیملی کے لئے اگلی صبح مزید دشواری لئے نمودار ہوئی، جب علی الصبح شاہ زیب شاہ بھائی کے گھر تشریف

لے آئے، جانے انہیں کچھ بھنک پڑی تھی یا حفظ ماتقدم تھا چھوٹے بھائی نے باقاعدہ طور پر معاذ کے رشتے کو نہ

صرف پیش کیا بلکہ فوری منگنی کی استدعا بھی کر دی۔ جہانزیب شاہ کے لئے عجیب دورا ہا تعمیر کر دیا گیا تھا سجدہ تین

دن سے میسے میں تھی، بھائی کے پھیلے دامن کو خالی لوٹانا بھی ان کے بس میں نہ تھا۔ جہانزیب شاہ جہانزیب شاہ اور زیرک

انسان تھے، جذباتی اور فوری فیصلے کس قدر غیر مستحکم ثابت ہوتے ہیں، وہ بخوبی واقف تھے بیٹیوں کو کالج کی طرح

سنبھال کر رکھنے والے والدین رشتوں اور ضدوں کے قلعوں میں انہیں کیسے قید کر سکتے تھے۔ سوا یک طویل سوچ بیچار

ہر اونچ نیچ کے لئے خود کو تیار کرنے کے بعد انہوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ غیاث احمد کو طلب کر کے عندیہ سنا دیا گیا۔

”غیاث! مجھے زندگی میں بیٹے کی کمی کبھی محسوس نہیں ہوئی، میں نے اپنی بیٹیوں کو سیپ میں موتی کی طرح سجا کر

دکھا ہے۔ میرے آنگن کی کلیاں قدموں تلے روندنے کے لائق نہیں ہیں، جب تک میں زندہ ہوں میری بچیاں

کھلکھلائیں، نہ رہوں تو میری تربیت انہیں مضبوط بنانے میں مدد دے گی، تم کو بیٹا بنا کر اپنا قیمتی موتی تمہاری گود میں ڈالتا تھا، کیونکہ حکمِ ربی اور سنتِ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

”تم میری بیٹی کو چاہیے دنیا کا کوئی سکھ نہ دیتے، مگر اس کی عزت نفس کا لحاظ کرتے تو میرے نزدیک سجدہ سے زیادہ خوش بخت کوئی بیٹی نہ ہوتی، تم نے میری بیٹی کا ہاتھ مانگا تھا، بھائی کی خواہش کے تحت جائز تھا، میں نے اپنے مجبوری کے تحت انکار کیا مصلحت کا تقاضا تھا، مگر تم لوگوں نے شطرنج کی بساط بچھادی، اگر کھیلنا میرے لئے لازم ہے تو ٹھیک ہے میں ایک بیٹی ترازو میں رکھنے والوں کو دوسری بیٹی کا ساتھ نہیں دے سکتا، آگے تمہاری مرضی سجدہ کو لے کر اپنا گھر بسانا چاہو تو میری دعائیں، تمہارے ساتھ ہیں اور عباد کی ہٹ دھرمی پر مہر لگانا چاہو، تو میری سجدہ تاحیات میرے گھر کی بہار ہے اور رہے گی۔“

جہانزیب شاہ کہے جاتے تھے اور غیاث احمد کی خاموشی گہری ہوتی جا رہی تھی، نامعلوم اس خاموشی میں غضب پوشیدہ تھا یا ہوش و حواس کروٹ لے رہے تھے۔ بہر حال جہانزیب شاہ کے فیصلے سے اختلاف صرف فریقِ مخالف کو ہی ہو سکتا تھا، ان کے آنگن کی چڑیاں آنکھوں میں اشک لئے اپنے بابا کے پر عزم چہرے کو تگے جا رہی تھیں۔ اپنے گھر کی تباہی کے خوف کے باوجود سجدہ کے لبوں پر اپنے پیار لٹاتے بابا جان کے لئے شکرانہ مسکراہٹ تھی۔

.....☆.....

معاذ کے خیالاتی محل میں بھی دراڑیں پڑ چکی تھیں۔ جہانزیب شاہ نے شاہ زیب شاہ سے بھائی مان کے ساتھ معذرت کر لی کہ منگنی شادی ایک طرف وہ فی الحال اس رشتے کے استحکام کی بھی یقین دہانی نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے چند ماہ کی بیاہتا بیٹی کو گھر بیٹھا کر دوسری بیٹی کی خوشی کے شادیاں کیسے بجائے جاسکتے تھے اور پھر دل میں ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید اس ضرورت سے زیادہ پڑھی لکھی فیملی کے اندر انسانیت جاگ جائے اور وہ ہٹ دھرمی سے باز آجائیں، شاید سجدہ پھر سے اپنے گھر جاسکے، مگر فجر شاہ کی کہیں اور نسبت طے کرنا گویا سجدہ کے مقدر میں آخری کیل ٹھوکنا تھا، ضد اور خود سری سے بھلا بعد بھی کیا کیا جاسکتا ہے۔

جہانزیب شاہ نے ہر مسئلہ کا حل فی الوقت خاموشی کو گردانا اور اپنی نازک چڑیوں کو خود میں چھپائے زمانے کے سرد و گرم سے بچانے کی سعی کرنے لگے، کیونکہ جب فیصلہ انسان کی استطاعت سے باہر ہو جائے تو تقدیر اور حکمِ الہی کا منتظر ہو جانا ہی ہر مسئلہ کا حل ہے۔

.....☆.....

”فجر! آج ناشتہ نہیں کیا۔“ سرشان کی طرف سے غیر متوقع سوال پر وہ حیران و پریشان انہیں تنگے گئی، کلاس روم میں دورانِ پیریڈ اس کی مستقل دماغی غیر حاضری کو نوٹ کرتے ہوئے سر نے اپنے انداز میں دریافت کیا۔

”سر کیا تھا۔“ وہ منمنائی۔

”کیا کیا تھا؟“ مختصر سوال حاضر تھا۔

”سر ناشتہ۔“

”اول ہوں سر ناشتہ نہیں سرشان تم نے میرا نام بدل دیا۔“ سر نے شگفتہ پیرائے میں اس کی کھینچا تانی جاری رکھی۔

”نوسر!“ وہ پھر سے من من کرنے لگی۔

”کیا نوسر! اب تم مجھے نوسر باز کہو گی؟“

”نہیں سر! جی سر، وہ سر، اصل میں سر۔“ اس کی گردان سر اشارت ہو چکی تھی۔

رداڈ انجسٹ [144] دسمبر 2015ء

READING
Section

”بس کر دو میرا سر دکھنے لگ گیا ہے۔“ سر نے بک میز پر بجا کر تقریباً دھاڑتے ہوئے کہا، وہ جو پہلے ہی حراساں تھی، ساون بھادوں برینے لگی، سرشان پوری کلاس سمیت اس کی نین برسات دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ سے ہنس مکھ اور لا پرواہ سی رہی تھی آج ذرا سی بات پر کیا تم ہوا کہ ضبط کے بندھ ہی ٹوٹ گئے۔ ٹمن سر کی موجودگی کی پروا کئے بغیر اسے گلے سے لگائے تسلی دینے لگی، خود سر بھی ذرا سی ڈانٹ پر ایسا رد عمل دیکھ کر سوچ میں پڑ گئے تھے کہ اچھی خاصی ڈانٹ پر بھی کوئی اسٹوڈنٹ ایسے چھا جوں نہ برسی تھی۔

”فجر! کنٹرول یور سیلف جاؤ پانی پی کر آؤ، ہری اپ۔“ سر نے سخت لہجے میں اسے خاموش کرایا، پانی پی کر آؤ وہ لوٹنے لگی تو سر کی لائبریری میں طلبی کا آرڈر ملا، وہ آج کے دن کو منحوس ترین دن قرار دیتے ہوئے سر کی خدمت میں حاضر تھی۔

”جی فرمائیے۔“ سر خود ہی طلب کرنے کے بعد خود ہی وجہ آمد دریافت کرنے لگے۔

”سر! آپ نے بلایا تھا۔“ وہ دل کی بھڑاس نکل جانے کے بعد قدرے نارمل حالت میں تھی اعتماد سے بولی۔
 ”ہاں وہ میں نے کہنا تھا کہ آج گھر میں پانی نہیں آ رہا۔“ سر کی ایک اور انوکھی اطلاع نے اسے پھر اعتماد سے محروم کر دیا۔

”جی سر پانی۔“

”لو میں اب سر پانی ہو گیا، کل کو سر جا پانی بنا دو گی یا پھر سر ایرانی۔“ سرشان آج طنز و مزاح کا ناول رٹ کر آئے تھے، اور اس کی ہکلاہٹ انہیں موقع بھی خوب فراہم کر رہی تھی۔ اب اس نے دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

”میں کہہ رہا تھا، میرے گھر پانی نہیں آ رہا تم اپنے واٹر پلانٹ سے واٹر سپلائی کر دو عین نوازش ہوگی۔“ سر کی دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ دی گئی وضاحت اسے آنسوؤں سے نہیں شرم سے پانی پانی کر گئی۔
 ”سیر! وہ میں ایسے ہی رو پڑی تھی۔“ وہ قدرے مطمئن انداز سے بولی سرشان کے لبوں کی مسکراہٹ بھی غیر معمولی تھی۔

”اسی بات کا تو شکوہ ہے تم ایسے ہی رو پڑیں، اگر بتا کر رو تم تو میں یہ موتی Save ضرور کر لیتا۔“ سرشان کی بات سے وہ قطعاً اخذ نہ کر پائی کہ اب کے پیرائے گفتگو طنز یہ تھا کہ فکر یہ البتہ اپنی جانب متوجہ ان کی آنکھوں میں رنگ پہلے سے مختلف تھے۔

”سر! وہ کچھ گھریلو مسائل کی وجہ سے الجھن کا شکار ہوں۔“ وہ ناچاہتے ہوئے بھی سچ کہہ اٹھی یہ دیکھے بنا کہ سر اپنی بات کے نظر انداز کئے جانے پر برہم ہو چکے تھے۔

”ابھی سے الجھنوں اور مسائل کے رونے، یہ سب زندگی کے ساتھ چلتے ہی نہیں بڑھتے بھی رہیں گے، آج کچھ سے تو کل کچھ اور ہوگا لیکن تمہاری لائف کا یہ اپورٹنٹ اور گروتھ فل پیریڈ پھر نہیں آئے گا، اس لئے کبوتر کی طرح آنکھیں موندے ہر بات سے بے نیاز صرف اپنی اسٹڈی پر توجہ دو۔“ سر نے نہ تو کھوجا نہ اندر کا بھید جانا اور اسے بے فکری کا سبق رٹا کے اپنے حصے کا فرض ادا کر دیا، وہ بتانا چاہتی تھی کہ سجدہ آپی کی بے رنگ زندگی اور بابا جان کی بے تکمیل خواہشات کا بوجھ لادے، وہ آنکھیں بند کئے کیسے اپنے لئے جی سکتی تھی۔

☆.....

گھر اس کے ماں باپ کی بنائی جنت جس کے ذرے ذرے سے سکون کی آبشاریں بہتی تھیں، جہاں ہر دم بہار

مسرت کا ڈیرا تھا، کیوں جنم لیا؟ اس نے یہاں کہ، جنت کی ہمیشگی باقی نہ رہی، کیوں عمر کے اس دور میں داخل ہوئی؟ کہ جہاں خزاں میں ڈھل گئی، سجدہ آپی کی خاموش ذات میں کوئی شکوہ نہ تھا، تو پھر وہ کیوں خود کو کٹھنرے میں پاتی تھی؟ بابا جان کی کمزور ہستی جس مضبوط سہارے کی متلاشی تھی، وہ کیوں اس کی وجہ سے سراب میں بدل گیا تھا، دن رات اپنے جرائم شمار کرتی، ان کے لئے سزائیں تجویز کرتی، وہ کیسے اپنے پیاروں کے مسائل سے آنکھیں چراکتی تھی۔ سرشان نے کتنی آسانی سے حل تجویز کیا تھا، شاید کسی نے سچ ہی کہا ہے جس تن لکیاں اوہی جانے۔

”ایمان! کیا اب تم سے بات کرنے کے لئے اپائنٹ لینا پڑے گی۔“ وہ کچن میں چپ چاپ ہانڈی میں چج چلاتی ایمان کے گلے کا ہار ہوئی، گھر کے کھنچے ماحول سے کوئی بھی محفوظ نہ تھا۔

”نہیں اوپن ڈور ہے جب چاہے آؤ مگر شو آف لکھا، ہوا ضرور پڑھ لینا۔“ ایمان اور مست خرام ہوا میں کیا فرق تھا؟ فجر کو تازگی کا احساس ہوا۔

”ایمان! کیا ہم بابا جان کے گرد لیٹی الجھنوں کی ڈور کاٹ نہیں سکتے ان کے آنگن کی چڑیاں کیا فکروں سے لدھے ان کے مہربان پہلو میں دیک کر آنکھیں موند سکتی ہیں۔“ فجر دلگڑھنگی کے ساتھ گویا بھی آنکھوں کی کمی یکساں تھی تو دل کی تڑپ بھی ایک سی تھی، دونوں کچھ کرنے کی خواہاں تھیں مگر کیا؟ کس راہ پر قدم رکھیں کہ منزل ملے نہ ملے مگر گھٹنایاں ضرور آسان ہو جائیں۔

”کاش کہ میرے پاس کوئی اسم، کوئی طلسم وغیرہ ہوتا۔“ ایمان بلاوجہ کے استعارات کو دامن سے جھاڑتی فکر مندانہ شوخی سے روبرو تھی۔

”اگر معاملات کو سلجھانے کے لئے ہمیں اپنی دل و دماغ اور ان کی خواہشات کو بین Bane لگانا پڑا تو کیا کر سکو گی؟“ فجر نے کیا دریافت کیا اور ایمان نے کیا اخذ؟ کچھ بھی واضح کئے بغیر دونوں چڑیاں اپنی مہربان چھت کی خاطر کمر بستہ ہو گئی تھی۔

☆.....

”فجر! تمہارے گھر کا مہمان اور تمہارے دل کا مکین بننا چاہتا ہوں۔“ وہ سن دماغ اور بے حس وجود کے ساتھ یک ٹک نہیں تک رہی تھی، حیرت حد سے سوا تھی تو اندر کے شور نے الگ ہلکان کر دیا تھا۔ اظہار محبت کر کے کسی نے دل کی تھکن اتار دی تھی تو کسی کے اندر بوجھ طاقت سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔

وہ جو پہلے کئی چاہتوں کے انبار اٹھائے ہوئے تھے، ایک نئے امتحان سے دوچار تھی عباد احمد کی چنگھاڑتی محبت ہو یا معاذ کی سلگتی چاہت، وہ تو اس راہ کی متمنی تھی جہاں اس کے مہربان باپ اور پیاروں کے مسائل کا حل تھا، وہاں وہ اس نئی خواہش کا حیر مقدم کیسے کر سکتی تھی؟ پر ایک ٹائم میں سر کا بلاوا اس کے لئے حیران کن تھا۔ وہ خیالات کی گھٹن کے ہمراہ سرشان کے روبرو تھی، کتنی خواہش تھی اس کے اندر کہ وہ اپنے آئیڈیل ٹیچر کے منہ سے تعریفی کلمات سنے ان کے سامنے اپنے حالات رفتہ بیان کرے اور جو ابا وہ اپنی دھیسے پھوار برساتے لہجے میں اسے تسلی کے چند بول عطا کریں۔ لیکن کیا ہوا کہ اس کے آئیڈیل سانچے میں لکیر آگئی، جس میں وہ سرشان کے دو چہرے دیکھنے لگی، وہ کوئی غلط کام نہیں کر رہے تھے، محض دل کی خواہش کا اظہار ہی تو کیا تھا، لیکن شاید حالات مناسب نہ تھے۔ دوسری طرف ان کی ہر ادا پر فدا فجر شاہ سے وہ ایسے جواب کی توقع نہیں رکھتے تھے۔

”سر! میں پہلے ہی مشکل میں ہوں، میرے لئے میرے پیاروں کی خواہش امتحان بنی ہوئی ہے۔ آپ مجھے خواہش کے نئے ٹھنور میں مت اتاریں۔“ فجر کی دلگڑھنگی سر کے لئے تعجب خیز تھی، ایسا کیا کہہ دیا تھا انہوں نے کہ وہ

پہیلیاں بھجوانے لگ پڑی تھی، لا ابالی کم عمر اسٹوڈنٹ سے وہ کچھ اور ہی رسپانس کے متمنی تھے۔
 ”فجر! میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا، اکھنوں کے دھاگے جینے کی راہیں تنگ کر دیتے ہیں، مگر خود کے لئے جینے کی کشش گرہیں کاٹ لیتی ہے، گرچہ وقت کا زیاں ناگزیر ہے مگر کامیابی کا حصول یقینی ہے۔“
 کچھ بھی تو غلط اور نیا نہیں تھا ان کی باتوں میں، عام حالات میں وہ کیا کچھ نہ کر جاتی مگر اس وقت اس کے لئے سب کچھ بے معنی تھا۔ سو وہ سر کی بات اور خواہش دونوں کو ادھورا چھوڑے یہ کہہ کر جا چکی تھی۔
 ”لیکن سر! میں اپنوں کے لئے جینا چاہتی ہوں اپنے لئے نہیں۔“

☆.....

”فجر! کیا کرنے لگی ہو؟“ اسے آدھی رات کمرے میں نہ پا کر ایمان ٹیرس پر چلی آئی تھی، جہاں وہ موبائل تھا مے گہری سوچ میں مگن لگتی تھی۔ ایمان کو اس کی بات کا کیا جواب دیتی، جبکہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ اس کی انگلیوں نے یہ نمبر کیسے ڈائل کر لیا تھا؟ آدھی رات کو کئے گئے فون کو جتنی دیر میں ریسو ہونا تھا، وہ جانتی تھی سو کسی کی نیند ٹوٹنے کا سکون سے انتظار کرتی رہی اور ایمان اس کے منہ کھولنے کا انتظار کرتی جا چکی تھی۔
 ”ہیلو کون؟“

”فجر! جہاں زیب شاہ۔ نیم خوابیدہ آواز تعارف کے بعد کس حد تک بیدار ہو چکی تھی، یہ وہ بنا دیکھے بتا سکتی تھی۔
 ”فجر! اس وقت، سب ٹھیک تو ہے؟“ اضطرابی پریشانی میں جتلا سوال حاضر تھا۔
 ”ٹھیک کچھ ٹھیک رہنے دیا ہے آپ نے ہمارے گھر میں۔“ وہ ادھر ادھر کی تمہید میں وقت ضائع کرنے کی بجائے دو ٹوک انداز اپنانا چاہتی تھی، مگر مخاطب کے لہجے کی حلاوت اور انداز فکر مندی میں کیا اسرار تھا؟ کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ کرانٹھی، عجب ہے کہ وہ الزام دھر رہی تھی اور مخاطب کو سراہنا ہی محسوس ہو رہی تھی۔
 ”فجر! جانے انجانے میں کیا خطا سرزد ہوئی، ہنوز لاعلم ہوں۔“ اس لب و لہجے کی وارفتگی سے وہ آج سے قبل انجان تھی، سو کچھ لمحوں کے لئے چپ سی ہو گئی۔

”فجر! تمہارے لئے کسی تکلیف کا باعث بنا ہوں، تو ازالے کی صورت کیا ہوگی نہیں جانتا۔“
 ”لیکن میں جانتی ہوں کہ مجھے اپنے پیاروں کے لئے جینا ہے، اسی لئے ایک عرض لانی ہوں ایمان میرے بابا کے آنگن کا کھلکھلاتا پھول ہے، اسے اپنا گھر میرے بابا کے دل کی ازلی خواہش کو پورا کر دیں۔“ فجر بالا آخرد عازبان پر لے آئی، مان و استحقاق ہر لفظ سے عیاں تھا۔ اظہار چاہ کے عدم خطا وار سے برسوں سے ستمیت کر پروان چڑھائی چاہت کی قربانی طلب کی گئی تھی۔

”فجر! ان پیاروں میں، میرا کہیں شمار نہیں ہے؟“ حسرت و شوق کا جہان آباد کئے سوال حاضر تھا، اگرچہ خواہش و قربانی غیر متوقع تھی مگر اس کی سانس تو پیاروں کے ذکر پر ہی اٹک گئی تھی، کیا سننا چاہتا تھا وہ ان لبوں سے جنہوں نے کبھی مخاطب کا دامن نہ تھامنا تھا، گرچہ ٹھٹھیاں وا ہوئی تھیں، تو کس خواہش کے تحت تقدیر کا انوکھا مذاق تھا۔

”میں نہیں جانتی میری انگلیوں نے آپ کا نمبر کیوں ڈائل کیا، ہاں مگر یقین ہے کہ یہ عرض اس دل سے ہے جہاں سے خالی لوٹنے کی امید نہیں ہے۔“ سزا سنا کر قلم تو زردیا گیا تھا، اپنا کہہ کر لوٹ لیا گیا تھا کچھ کہے تو مان ٹوٹ جاتا نہ کہے تو عشق سے امان ہو جاتا، خوابوں کے خریدار کو خواب بیچنے کی راہ دکھادی گئی تھی، ہمیشہ کی طرح اس نے اپنا معاملہ کاتب تقدیر کے سپرد کر دیا۔

☆.....

آسمان زمین پر کیسی صبح طلوع ہوئی تھی، وہ بیک وقت کئی آزمائشوں کی لپیٹ میں تھی۔ جہانزیب شاہ، شاہ زیب شاہ اور لاڈ لے بھتیجے کے ساتھ خوش وگمن تھے، تو آپلی سجدہ اپنے بسیرے کی سلامتی کی گارنٹی دینے غیاث احمد کے ساتھ روانگی کی تیاریوں میں تھیں۔ معاذ عبدالغازی اور ایمان کی شوخ گفتگو پہلے ہی نہ تھی، معاذ کی تکلیف دل سے واقف ایمان کے لئے فیصلہ سہل نہ تھا، تو دوسری طرف اپنے پیار کے پیاروں کی خاطر گردن معاذ نے بھی جھکائی تھی، مگر وہ کیوں دلگرفتہ تھی؟

تقدیر اور تدبیر کا فرق یہیں سے شروع ہوتا ہے یہ ایک دوسرے کی خاطر جینے والوں کی تدبیر تھی، تو کہیں تقدیر بھی تھی جو اٹل تھی، عین اس وقت جب معاذ، ایمان کے لئے پروپوزل دیتا اور غیاث عباد اور فجر کی بات طے کر کے تقاضاً واپس گھر لوٹتے کہ عباد احمد کی فون کال نے سب کو انگشت بدنداں کر دیا۔

عباد نے فجر کے رشتہ کے بابت اپنی ضد سے رجوع کر لیا تھا اور اس نے جہانزیب سے معذرت کرتے ہوئے اپنے فیصلے کو جذباتی قرار دیا۔ سب اس اچانک رویے سے متعجب تھے، غیاث سجدہ کو لئے ہر بات سے کنارہ کشی اختیار کرتے اپنے گھر لوٹ گئے اور شاہ زیب شاہ کے ایمان کے لئے سوال اٹھاتے لبوں نے فجر شاہ سے منگنی کی رسم کے لئے بھائی سے التجا کی جسے بخوشی قبول کر لیا گیا۔ کیا معجزہ ہوا؟ کیا عجب تماشا تھا کہ اگر بنتی بگڑی تھی، تو کاتب تقدیر نے بگڑی بنا بھی دی تھی۔ سب کے دلوں میں ابہام تھا عباد احمد کے اچانک رویے کے متعلق سب حیران تھے سوائے ایمان کے۔

”ایمان! تم نے یہ سب کیسے کیا اور مجھے بتایا بھی نہیں؟“ فجر اپنی چیخ بہن کے چپکتے چہرے کو آنکھوں میں سموئے حیرت سے بولی۔

”کیوں تمہیں کیوں بتاتی تم نے معاذ کو فون کرتے وقت مجھے بتایا تھا، جب ہمارے درمیان طے ہوا تھا کہ تم عباد احمد سے رشتہ کے لئے بات کرو گی اور میں معاذ سے بابا جان کی خواہش سے متعلق تو پھر تم نے معاذ کو کال کیوں کی؟“ ایمان ہنسنے لگی۔

”مجھے نہیں پتہ میں نے انہیں کال کیوں کی؟“ فجر متمناتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

”میں بتاتی ہوں تم نے انہیں“ کال کیوں کی، کیونکہ معاذ عبدالغازی کی پرسکون لہروں کو مانند راہ بناتی چاہت کب تمہارے دل میں طغیانی برپا کر گئی، تمہیں معلوم بھی نہ ہو سکا۔ اس دن مجھے میرے سوال کا جواب ملا کہ تمہاری چاہت کیا ہے؟ سو میرے لئے فیصلہ کرنا اور بھی دشوار ہو گیا تھا، اسی لئے میری انگلیوں نے عباد احمد کا نمبر کیسے ڈائل کیا تھا، تمہاری طرح میں بھی ناواقف تھی زیادہ بحث نہیں کی میں نے، بس اس شخص کی ایگو کوچ کر کے اتنا کہا کہ (اس وقت فجر اس سے عرض کر رہی ہے، جس کی چاہت پر اسے مان ہے عباد صاحب اگر یہ مان آپ پر ہوتا تو اس وقت آپ سے میں نہیں فجر مخاطب ہوتی)۔ ایمان تفصیلاً آگاہ کرتے بولی۔

”پھر کیا ہوا؟“ فجر نے کریدا۔

”پھر کیا اتنا کہنا اس کے لئے کافی تھا کہ فجر کے دل کا مکین کون ہے؟ سو اس عقلمند شخص نے قدم پیچھے ہٹا لینا مناسب سمجھا اور پھر جو ہوا وہ تمہارے سامنے ہے۔“ ایمان اس کے چہرے کو ہاتھوں میں لئے بولی جو اس انکشاف پر سر جھکائے اپنے ہی دل میں جھانک رہی تھی، جس کی اسے پہلے خود بھی خبر نہ تھی۔

”تو نے بلا وجہ میں افسانہ بنا دیا بات اتنی نہیں تھی جتنی.....“ فجر کھیلاتے ہوئے بولی۔

”اچھا تو ذرا بتا تو سر شان کے پروپوزل سے انکار کیوں کیا، جنہیں تو آئیڈیلز کرتی تھی؟“ ایمان آج اسے کٹہرے سے

ہٹانے کو تیار نہ تھی ہر طرف سے گھیر رہی تھی۔

”پتہ نہیں ایمان! مجھے سرشان کی ہر ادا اٹریکٹ کرتی ہے، ان کا بولنا، چلنا، پڑھنا، سمجھنا، مجھے ہر بات ان کا گرویدہ بناتی تھی مگر چاہت کیا ہے؟ وہ ان باتوں سے ماوراہ ہے دل کے چاہتا ہے، اور نگاہ کے پسند کرتی ہے یہ سب کچھ میں نے اب جا کر جانا سرشان کو میری نگاہ سراہتی ضرور تھی مگر میرا دل.....“ وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔ نگاہ کا سراہنا اور دل کا چاہنا دو الگ باتیں ہیں، دیر بدیر سمجھ آ رہی جاتی ہے۔

.....☆.....

معاذ عبد الغازی کے بیڈروم میں اس کی زندگی و چاہت کی شراکت دار بنے آج وہ روم سجائے اس کی منتظر تھی۔ ایک طویل مدت پر سکون نرمی کی مانند چاہت سجائے بیٹھے معاذ نے یکنخت وہ اندھیر مچائی کہ فجر جہانزیب شاہ کو باضابطہ طور پر اس کی زندگی میں آتے ہی بنی۔ ریڈروایتی شرارے میں روایتی ہتھیاروں سے لیس منفرد مین نقوش کی حامل فجر کو بہاروں کی نوید سنانے، وہ سب قدموں کے ساتھ اس کے مد مقابل آن بیٹھا، کتنا مشکل تھا گلاب کی بکھری پتیوں میں سے اپنے گلاب کو الگ کرنا، مگر استحقاق سے بھرپور بھاری ہاتھ یہ کام انجام دے چکے تھے۔

”فجر! اس رات کو وجود میں گزاروں کہ حاصل وجود کے پہلو میں کوئی مشورہ دو“۔ معاذ کی کم گوئی کے لئے جذبات کا اظہار کسی امتحان سے کم نہ تھا، برسہا برس کی چاہت کو اظہار کا پیرھن پہنانا سہل نہیں تھا، مگر مسرت اور ملن کا خمار جرات گویائی کا سبب ٹھہرے وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی، جذبات سے منتشر بانہوں میں مغلوب ہستی کو جرات کون دے؟

”حسن بہار کیوں کہ برگ گلاب“۔

”فجر معاذ شاہ کہنا کافی ہے“۔ وہ اس کے اصرار لپی اور شدت گرفت میں منمننا کے بولی، معاذ کی بھرپور مسکراہٹ اس کی انتہائے مسرت کی عکاس تھی۔

”خوبصورت لبوں کی حسین گفتگو دل میں اتار لیتی ہے، مگر جب یہ لب دوریوں کا زہر پلا میں تو دل بکل مت پوچھو“۔

”مت بتائیں“۔ معاذ گزری بات دہرانا چاہتا تھا، مگر فجر کٹہرے میں آنے سے کترائی آنے والے وقت سے خوفزدہ ہر نی بے دھیانی میں اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ گئی، معاذ کی جوابی شرارت ایسے ہی تھی گویا آغاز گفتگو سے ہی رد عمل کے لئے موصوف تیار تھا، اس کی کپکپاہٹ معاذ کے جذبات میں اور بھی ارتعاش لانے لگی۔

”ہمارے رشتے کے بیچ گزرے وقت کونہ لائے“۔ وہ دھیرے سے بولی نظریں جھکائے جانے کس خوف و دسو سے زیر اثر تھی۔

”اچھا تو ابتدا بھی سے کرتے ہیں تمہارے اور میرے درمیان سے پہلی ریکاوٹ ہٹائے دیتے ہیں“۔

معاذ کی شوخی کچھ تو فطری کچھ فجر کے دسوے کو زائل کرنے کے لئے بھی تھی، اس نے فجر کے کامدار دوپٹے اور زیورات کو ریکاوٹ قرار دے کر اس کے وجود سے جدا کرنا شروع کر دیا۔

”میں تمہیں اپنے پیار کے زیور سے مزین کر دوں گا، تم سر تا پیر میری چاہت سے سج جاؤ گی“۔ معاذ اس کی بندیا، نتھ، چوڑیاں، اتار تے اپنے کس کے زیور سے آراستہ کرتا گیا، اس کی پرحدت بانہوں میں وہ نکھرتی گئی، ایک روپ تھا جو اس کے لئے سنوارا تھا اور ایک روپ یہ تھا، جو اس نے سنوارا تھا ہر روپ اسی کا تو تھا، سو اسی کے ہاتھوں نکھر گیا۔ کاتب تقدیر پر بھروسہ کرنے والے اور پیار کی تدبیر کی قدر کرنے والے کے لئے جیت مقدر کر دی گئی تھی۔

.....☆.....

لہو کی ساری لہروں سے جہان کا

”بڈھ پیر ایئر بیس پر فجر کی نماز کے وقت دہشت گردوں کا حملہ“ کیپٹن اسفندیار بخاری فرنٹ لائن پر جواں مردی سے دشمنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جام شہادت نوش کر گئے ہیں۔ مسز اظہر نے ابھی ٹی وی



READING
Section

گے۔ بلاشبہ شہادت ایک عظیم رتبہ ہے مگر دل کا خالی پن تو کبھی نہیں جاتا۔ انہیں اپنی آنکھوں کے گوشے نم ہوتے محسوس ہوئے۔

اسفند سے کوئی رشتہ نہ سہی مگر دکھ تو مشترک تھا۔ اعزاز بہت بڑا تھا مگر ساتھ کھونے کا احساس بھی حاوی تھا، بس نام اور چہرے بدلتے ہیں باقی تو ہر احساس ایک جیسا ہوتا ہے، خوشی اور غم کا ملا جلا احساس۔ مسز اظہر نے خود کو بمشکل رونے سے روکا۔

.....☆.....

آن کیا ہی تھا کہ یہ دل دہلا دینے والی خبر ان کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

اس خبر نے جیسے ان پر بجلی گرا دی تھی، وہی دن پلٹ کر آ رہے تھے۔

”ستائیس سالہ اسفندیار بخاری پاکستان ملٹری اکیڈمی سے اعزازی شمشیر حاصل کر چکے تھے۔“ نیوز کاسٹر مسلسل بول رہی تھی۔

اور وہ سوچ رہی تھیں کہ آج پھر ایک ماں کا جگر گوشہ دہشت گردی کی نظر ہو گیا۔ کیا کیا خواب نہ دیکھے ہوں



”کوئٹہ شہر میں خودکش دھماکہ“۔ عائرہ ٹاک شو دیکھ رہی تھی جب یہ ہولناک بریکنگ نیوز آگئی۔ وہ بے اختیار کانپ اٹھی۔

”نا جانے اس ملک کے حالات کب ٹھیک ہوں گے، اتنی بے شمار قربانیاں دینے کے باوجود کبھی کہیں امن قائم ہوتا نظر نہیں آ رہا“۔ عائرہ کا دل گہرے دکھ سے بھر گیا۔

”آج پھر نجانے کتنے سہاگ اجڑے ہوں گے، کتنی ماؤں کی گودیں ویران ہوئی ہوں گی۔ غموں کی آندھی نے نجانے کتنے خاندانوں کی معصوم بے ضرر خوشیاں چھینی ہوں گی“۔ عائرہ کی آنکھیں بے اختیار نم ہو گئیں۔

”کیا اس ملک کے باسیوں کی جان اتنی ارزاں تھی کہ کوئی چنگیوں میں ان کو خاک و خون میں نہلا دے“۔ عائرہ نے بے بسی سے سوچا۔

لیکن امید کا ایک دیا ابھی بھی اس کے اندر روشن تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایک دن امن ضرور قائم ہوگا، اس قوم کی اتنی قربانیاں رائیگاں نہیں جاسکتیں۔

عائرہ کی آنکھوں میں ایک پرانا منظر اتر آیا۔ کیا کچھ نہ یاد آیا تھا۔

”عائرہ کن سوچوں میں کھوئی ہوئی ہو؟ کب سے آوازیں دے رہی ہوں“۔ امی نے عائرہ کا کندھا ہلایا۔

”کچھ نہیں امی! بس یونہی“۔ عائرہ نے اپنی نم آنکھیں صاف کیں۔

اسی دوران ان کی نظر ٹی وی پر چلتی خبر پر پڑی اور اس کے ساتھ ہی انہیں عائرہ کے کم صم ہونے کی وجہ سمجھ آ گئی۔

”عائرہ بیٹا! کیوں خود بھی پریشان ہوتی ہو اور مجھے بھی کرتی ہو، تم تو خوش قسمت ہو کہ تمہارا بھائی اس پاک دھرتی پر قربان ہوا ہے“۔ امی نے نرمی سے سمجھایا۔

”امی! میں کم ہمت نہیں ہوں بس کبھی کبھی بے بس ہو جاتی ہوں“۔ عائرہ آہستگی سے بولی۔

”بیٹا! تم بہن ہو تو میں ماں ہوں لیکن شہیدوں کو روپا نہیں کرتے، کیا تمہیں یقین نہیں ہے کہ شہید ہمیشہ زندہ جاوید رہتے ہیں۔“ امی نم سے آنکھوں سے مسکرائیں۔

عائرہ بس انہیں خالی خالی نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔

.....☆.....

”عائرہ! اٹھو بچے نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے“۔ امی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”امی! ابھی سونے دیں نا“۔ عائرہ ابھی نیند کے خمیر میں تھی۔

”دیکھو نا! چرند، پرند سب اپنی اپنی زبان میں اللہ کی حمد و ثناء بیان کر رہے ہیں، کیا تم اللہ کے شکر گزار بندوں میں شامل نہیں ہونا چاہتیں؟“ امی نے عائرہ کے بال سنوارے۔

”جی اٹھنے لگی ہوں“۔ وہ کسلمندی سے بولی۔

”تو پھر فائٹ اٹھ جاؤ، نماز ہمیشہ وقت پر ادا کرنی چاہئے“۔ وہ سختی سے بولیں تو عائرہ جھٹ سے اٹھ بیٹھی۔

”اتنے میں باہر سے گاڑی کا ہارن سنائی دیا“۔

”ارے اتنی صبح صبح کون آ گیا“۔ امی حیرت سے بولیں اور پھر دیکھنے چلی گئیں۔ عائرہ نماز ادا کر کے باہر آئی تو بھائی کو دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑی۔

”رافع بھیا! آپ اتنی صبح صبح کیسے آ گئے؟ سی او صاحب نے آنے دیا؟“ عائرہ خوشی اور حیرت سے بولی۔

”اف لڑکی! بیٹھو تو کیا ایک ہی سانس میں سب پوچھ لو گی؟“ رافع بھائی ہنسنے لگے۔

اس دفعہ تو زیادہ دن کے لئے آئے ہیں؟“ عائرہ نے ایک اور سوال دعا۔

”عائرہ اٹھو! پہلے بھائی کے لئے ناشتے کا انتظام

کرو، آتے ساتھ ہی سرکھانا شروع ہوگئی ہو۔ امی نے ڈپٹا۔

”امی! رہنے دیں نا یہ تو ہماری مینا ہے، اسی کی وجہ سے تو گھر میں رونق ہے۔“ رافع بھائی کے لہجے میں عازرہ کے لئے پیار ہی پیار تھا۔

”ہائے تو ناشتہ نہیں کرو گے؟ باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔“ امی مسکرائیں۔

”رہنے دیں نا پھر نجانے کب ساتھ بیٹھنے کا موقع ملے اور نہ جانے ملے بھی یا نہیں۔“ رافع بھائی آہستگی سے بولے تو امی ان کی شکل دیکھنے لگیں، جبکہ عازرہ بھی حیرت زدہ تھی۔

”رافع! سب خیریت تو ہے نا؟“ امی نے فکر مندی سے پوچھا۔

”سب ٹھیک ہے امی! آپ پریشان نہ ہوں۔“ رافع نے لاڈ سے بازو امی کے گرد جامل کئے۔

”تو بے لڑکے جان نکال کے رکھ دیتے ہو۔“ امی نے رافع کے سر پر چیت رسید کی۔

”احد نہیں آیا؟“ رافع نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں اس کے امتحانات قریب ہیں جی نہیں آیا، لیکن اب سنتے ہی بھاگا چلا آئے گا۔“ عازرہ ہنسی۔

☆.....

موسم سرما اپنے عروج پر تھا۔ یہ 16 دسمبر 2014ء کا ایک سرد دن تھا۔ فضا میں بے پناہ خنکی تھی، انسان تو انسان پرندے تک باہر نکلنے کی ہمت نہیں کر پارہے تھے۔ ایسے میں مسز اظہر رافع کو جگانے کے لئے اٹھیں کیونکہ اسکول جانے کا وقت قریب تھا۔

”رافع! ماما کی جان اٹھو اسکول نہیں جانا کیا؟“ مسز اظہر نے رافع کے پاؤں میں گدگدی کی تو وہ جھٹ سے اٹھ بیٹھا۔

”اونو ماما! آپ نے مجھے جلدی کیوں نہیں جگایا، میرا

اتنا اہم ٹیسٹ ہے اور مجھے صبح صبح پڑھنا تھا۔“ رافع فکر مندی سے بولا۔

”بیٹا! آپ رات اتنی دیر تک پڑھتے رہے ہو اسی وجہ سے نہیں جگایا۔“ مسز اظہر نے پیار سے رافع کے بال بکھیرے۔

”اف ماما! آپ بھی نا۔“ رافع نے منہ بسورا۔

”چلو پھر اب جلدی سے تیار ہو کر ٹیبل پر آ جاؤ، میں سعد کو تیار کر لوں۔“ مسز اظہر نے پیار بھری نظروں سے رافع کو دیکھا۔

”او کے ماما! وہ سعادت مندی سے بولا۔

مسز اظہر سعد کو تیار کر کے ڈائننگ ٹیبل پر آئیں تو رافع ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔

”رافع بیٹا! آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟“ مسز اظہر نے رافع کو آواز دی۔ سعد چھوٹا ہونے کے باوجود ناشتے میں اتنے نخرے نہیں کرتا تھا، جتنے لاڈ رافع دیکھاتا تھا۔

”ماما! تیار ہو رہا تھا۔“ آرمی پبلک اسکول کے یونیفارم میں ملبوس رافع عجلت سے کرسی کھینچ کر بیٹھا۔

”بیٹا جی! آپ کی تیاری کچھ زیادہ لمبی نہیں ہوتی جا رہی لڑکیوں کی طرح۔“ میجر اظہر نے بیٹے کو چھیڑا۔

”بابا! آپ بھی ماما کے ساتھ مل جاتے ہیں۔“ رافع مصنوعی حنفی سے بولا۔

”بس، بس اظہر میرے بیٹے کو تنگ نہ کریں، ماشاء اللہ شہزادہ لگ رہا ہے۔“ مسز اظہر نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اچھا بھئی جیسے آپ کا حکم، اور پھر رافع اس دفعہ کیسے رزلٹ کی امید رکھیں؟“ میجر اظہر نے مسکراہٹ دہائی۔

”انشاء اللہ اے پلس آئے گا۔“ رافع عزم سے بولا۔

”او کے جلدی سے ناشتہ ختم کریں، آپ کو اسکول چھوڑ کر مجھے آفس بھی جانا ہے۔“ میجر اظہر ناشتہ ختم

کے بعد رافع کو اسکول بھیج دیا۔

کر کے اٹھ گئے۔

”بابا، بس ہو گیا، میں بیگ لے کر آتا ہوں۔“ رافع جلدی سے کھڑا ہوا۔ جبکہ مسز اظہر سعد کو لے کر گاڑی کی طرف آگئیں اور تینوں کو خدا حافظ کہنے لگیں۔

.....☆.....

”امی! آپ کو پتا ہے بھیا نے ہمیں بہت ساری شاپنگ کروائی ہے۔“ احد آتے ہی صوفے پر گر گیا۔
”اور آئس کریم تو بہت ہی مزے کی تھی۔“ عائرہ بھی چبکی۔ وائٹ لانگ فرائک میں ملبوس عائرہ کا گلانی چہرہ خوشی سے دھمک رہا تھا، وہ ابھی بازار سے لوٹے تھے۔

”رافع بیٹا! کچھ کھاؤ گے؟“ امی نے پیار سے تینوں بچوں کو دیکھا۔

”نہیں امی! آپ میرے پاس بیٹھیں نا مجھے آج واپس بھی جانا ہے۔“ رافع نے پیار سے ماں کو دیکھا۔
”کیا اتنی جلدی واپس جا رہے ہیں۔“ عائرہ حنفی سے بولی۔

”اور کیا اتنے مہینوں بعد تو آپ آئے تھے۔“ احد نے بھی منہ بنایا۔

جبکہ امی حیرت زدہ ہو گئیں کیونکہ رافع اتنی کم چھٹی لے کر بھی نہیں آیا تھا۔

”لیکن اتنی جلدی کیوں؟ میرا تو خیال تھا کہ تم رکو گے۔“ بابا نے حیرت سے کہا۔

”بابا! میرے وطن نے مجھے پکارا ہے تو میں کیسے اس پکار پر لبیک نہ کہوں؟“ رافع دھیرے سے مسکرایا، جبکہ اس کے چہرے پر انوکھی سے چمک تھی۔

”کیا مطلب کھل کر بتاؤ نا؟“ امی بے چینی سے بولیں۔

”امی! بابا میری پوسٹنگ اگلے محاذ پر ہو گئی ہے، مجھے اپنا فرض نبھانا ہے، اپنے وطن کو دشمنوں کے ناسور سے نجات دلانی ہے۔“ رافع کے چہرے پر پختہ عزم تھا۔

”رافع! تم ہمارا فخر ہو، مجھے امید ہے تم ہمیں کبھی شرمندہ نہیں ہونے دو گے اور دشمن کو ناکوں چنے چبواؤ گے۔“ بابا کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔

”ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں، اللہ تمہیں کامیاب کرے۔“ امی نے رافع کا ماتھا چوما۔

عائرہ نے خوفزدہ نظروں سے بھائی کو دیکھا۔
”بھیا! آپ کو کچھ ہوگا تو نہیں نا؟“ عائرہ کے لہجے میں اندیشے تھے۔

”یا گل تمہارا بھائی بزدل تھوڑی ہے، جو کچھ ہوگا، تم بس دعا کرنا۔“ رافع ہنسا۔

”میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں لیکن آپ جلدی آئیں گے نا؟“ عائرہ نے یقین دہانی چاہی۔
”انشاء اللہ۔“ رافع مسکرایا۔

اور پھر ڈھیروں دعائیں لئے وہ واپس لوٹ گیا جدھر منزل اس کی منتظر تھی۔

.....☆.....

عائرہ بی ایس سی فائنل ایئر کی طالبہ تھی۔ اس کی فیملی امی بابا جان اور دو بھائیوں پر مشتمل تھی، عائرہ کے بابا ایک کامیاب بزنس مین تھے اور وہ بلیو ایریا کے ایک خوبصورت اور پرسکون گھر کی مالکین تھی۔ عائرہ کے امی اور بابا مذہبی اور محبت وطن تھے اور انہوں نے بچوں کی تربیت بھی انہی اقدار پر کی تھی۔ عائرہ اور رافع کی بچپن سے ہی بہت دوستی تھی اور احد کے بجائے عائرہ رافع کے ساتھ کھیلنا پسند کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب رافع بھائی پاکستان ملٹری اکیڈمی چلے گئے تو عائرہ نے رورو کر برا حال کر لیا، لیکن رفتہ رفتہ وہ ٹھیک ہونے لگی۔ اور بھائی سے دوری کی عادی ہوتی چلی گئی، رافع کی جاب خاصی ٹھن تھی اور وہ ترقی کی منازل طے کرتے کیپٹن کے عہدے تک پہنچ چکے تھے، اور اب رافع بھائی ایک نئے محاذ پر چلے گئے تھے۔

بی ایس سی کی طالبہ ہونے کے باوجود عائرہ کی

طبیعت میں بے پناہ بچپنا تھا، اور بھائی کے لئے اب بھی وہ پہلے جیسی جذباتی تھی، مگر بے پناہ اداسی کے باوجود بھی وہ دل سے بھائی کی کامیابی کے لئے دعا گو تھی۔

اے وطن خون میں ڈوبے تیرے پرچم کی قسم
تو نے جینا ہے قیامت کی سحر ہونے تک

.....☆.....

مسز اظہر رافع کا کمرہ سمیٹ رہی تھیں، جب فون کی گھنٹی ان کے کام میں مغل ہو گئی وہ شدید کوفت کا شکار ہوئیں اور پھرنا چاہتے ہوئے بھی فون اٹینڈ کر لیا۔

”بھابھی! رافع اور سعد کدھر ہیں؟“ دوسری طرف ان کی نند تھیں جو بغیر سلام دعا کے انتہائی بے چینی سے بچوں کا پوچھ رہی تھیں۔

”دونوں بچے تو اسکول گئے ہیں۔“ مسز اظہر حیرت سے بولیں۔

”آپ نے ابھی نیوز دیکھی ہے؟“ انہوں نے دوسرا سوال کیا۔

”نہیں نی وی تو بند پڑا ہے مگر ہوا کیا ہے؟“ مسز اظہر کو کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔

”بھابھی اے پی ایس میں دہشت گردوں نے فائرنگ کر دی ہے، آپ ذرا نی وی آن کریں۔“ وہ بول رہی تھیں۔ اور اتنا سنتے ہی مسز اظہر کے ہاتھ سے موبائل چھوٹ کر گر گیا۔ اور وہ بھاگتی ہوئی لاؤنج میں آئیں۔ نی وی آن کرتے ہی ایک قیامت ان کی نظر تھی۔

مسز اظہر کو لگا کہ آج ان کا دل پھٹ جائے گا، ان کے حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے، آنسو تھے کہ زار و قطار بہتے جا رہے تھے اور پھر وہ بے اختیار ہو کر باہر کی طرف بھاگیں۔

ان پر بس ایک ہی سوچ غالب تھی کہ انہیں اپنے بچوں کو بچانا ہے۔ ظالم درندوں سے محفوظ رکھنا ہے، وہ

دیوانہ وار اسکول کی طرف بھاگتی جا رہی تھیں۔ تبھی انہوں نے ایک گاڑی کو اپنے پاس رکھتے دیکھا۔ وہ میجر اظہر تھے جو شدید پریشانی کے عالم میں تھے۔

”میرے بچے اظہر میرے بچوں کو بچالیں۔“ وہ زار و قطار روتی ایک ہی بات کہے جا رہی تھیں۔

اے پی ایس پشاور کے باہر بہت سے بچوں کے پریشان حال والدین پھر رہے تھے اور اپنے بچوں کے لئے بے قرار تھے۔

”اظہر! یہ میرے بچوں کو نکال کر کیوں نہیں لاتے؟ آپ بھی تو فوجی ہیں آپ کیوں نہیں جاتے میرے بچوں کو بچانے؟“ مسز اظہر سخت بے چین تھیں۔

اور پھر کئی گھنٹوں کے صبر آزما انتظار کے بعد ننھے ننھے بچوں کو باہر نکالا گیا، ان کی نگاہیں ہر طرف سعد کو ڈھونڈ رہی تھیں، مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تبھی انہیں میجر اظہر سعد کے ساتھ آتے دکھائی دئے۔ وہ بے قراری سے سعد کی طرف بڑھیں، ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور وہ پاگلوں کی طرح سعد کو چومے جا رہی تھیں۔

ننھا سعد بری طرح سے خوفزدہ تھا، لیکن ماں کی آغوش میں آتے ہی اس کا محسوم چہرہ پرسکون ہو گیا۔

”اظہر! رافع کدھر ہے؟ آپ رافع کو کیوں نہیں لائے؟“ مسز اظہر نے رافع کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا۔

”ابھی آجائے گا۔“ میجر اظہر نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے تسلی دی۔

.....☆.....

رافع بھائی کے جانے کے بعد زندگی میں جیسے ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ ان کو گئے پندرہ دن ہو چکے تھے مگر پتا نہیں کیوں عائرہ کے دل کو دھڑکے سا لگا رہتا تھا۔ اور آج تو صبح سے ہی دل کچھ عجیب سا ہو رہا تھا، لگتا تھا

جیسے کچھ ہونے والا ہے مگر وہ اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتی تھی۔

لیکن شام کے قریب آنے والی کال نے اس کے ہر وہم کو حقیقت میں بدل دیا۔ امی نے بہت سکون سے بات سننے کے بعد الحمد للہ کہہ کر کال بند کر دی تھی۔ عائرہ نے حیرانگی سے امی کو دیکھا تھا جن کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

”مجھے شکرانے کے نوافل ادا کرنے ہیں۔“ وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولیں۔

”وہ کیوں اور امی کس کا فون تھا؟“ عائرہ نے پریشانی سے پوچھا۔

”فون رافع کے سر کا تھا الحمد للہ رافع اپنی منزل پا چکا ہے، اس نے شہادت کا رتبہ حاصل کر لیا ہے۔“ وہ خوشی اور غم کی ملی جلی کیفیت میں بول رہی تھیں۔

عائرہ کو لگا اس نے غلط سنا ہے۔ رافع بھائی اتنی جلدی کیسے جاسکتے تھے۔ وہ سکتے کی سی حالت میں تھی۔

”عائرہ! رونا نہیں ہے صبر سے کام لو۔“ امی کمال ضبط سے بولیں۔

”جن کے ایسے بیٹے ہوں وہ کر کے سر اونچا چلتے ہیں۔“

پھول ضروری تھے کچھ جانے، تب جا کر گلشن کھلتے ہیں۔

عائرہ بے تحاشا رو رہی تھی اس کو کسی پل قرار نہیں تھا، بچپن سے لے کر اب تک کا ساتھ گزرا وقت یاد آ رہا تھا اور وہ مزید شدت سے رو پڑی۔

امی، بابا، احد سب ہی اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے، مگر جب اگلے دن رافع بھائی کا تابوت آیا تو عائرہ ایک دفعہ پھر صبر کا دامن چھوڑ بیٹھی۔

سب کی آنکھیں نم تھیں۔ البتہ احد کی آنکھیں بھی شدت ضبط سے سرخ پڑ گئی تھیں، وہ آنسو روکتے روکتے تھک گیا تھا۔ اور پھر ہزاروں افراد کی موجودگی میں رافع

کو ایک شان سے سپرد خاک کر دیا گیا۔
”جس دھج سے کوئی مقتل گیا وہ شان سلامت رہتی ہے۔“

یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں“ لوگ کہتے تھے کہ جوان بیٹے کا جنازہ دیکھ کر ہی باپ بوڑھا ہو جاتا ہے لیکن بابا کے چہرے پر ایک سکون تھا۔ ان کا بیٹا مر اٹھوڑی تھا وہ تو شہید ہوا تھا پاک وطن پر جان دار گیا تھا، اور شہید تو ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

تو وہ کیوں دکھ کرتے بابا کو تو اس آزمائش میں پورا اترنا تھا اور وہ اتر بھی رہے تھے اور باقی سب کو بھی صبر کی تلقین کر رہے تھے۔ رافع اللہ کی امانت تھا اس نے واپس لے لیا اور اتنا بڑا اعزاز عطا کیا تو پھر وہ کیوں ناشکری کرتے۔



میجر اظہر اسپتال میں زخمی بچوں کو دیکھ رہے تھے، مگر رافع کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسکول میں بھی رافع کا کچھ پتا نہ تھا، بھی ایک آفیسر نے میجر اظہر کو پکارا، وہ انہیں رافع کو شناخت کرنے کا کہہ رہا تھا، دوسرے بہت سارے شہید بچوں میں ان کا رافع بھی شامل تھا، میجر اظہر کم ہمت نہیں تھے۔ وہ مضبوط اعصاب کے مالک آرمی آفیسر تھے انہوں نے بہت حوصلے سے اپنے معصوم شہید کو دیکھا جو پرسکون نیند سو رہا تھا۔

میجر اظہر شہید رافع کو بازوؤں میں اٹھائے گھر پہنچے تو مسز اظہر ساکت رہ گئی ان کا پیارا بیٹا رافع جس نے اے پلس حاصل کرنا تھا ان کے ذہین شہزادے کو ظالموں نے شہید کر دیا تھا۔ انہیں لگا کہ دل کی دھڑکن آج کھتم جائے گی۔ وہ ایک ٹک رافع کو دیکھتی جا رہی تھیں۔

یہ منظر ان کے لئے نیا نہیں تھا، اسی طرح ایک دن رافع کے ماموں بھی سبز ہلالی پرچم میں لپٹے گھر پہنچے تھے اور اب ان کے بھائی رافع کے بعد ان کا بیٹا رافع

بھی شہید ہو چکا تھا۔ یہ صدمہ چھوٹا نہیں تھا۔ ان کا ہر زخم ہرا ہو گیا تھا۔

رافع بھائی کا صدمہ ان کے دل پر لگا تھا، احد رفتہ رفتہ انہیں زندگی کی طرف واپس لایا تھا، مگر عازہ کی دلچسپی ہر شے سے ختم ہو چکی تھی، وہ بالکل گم صم ہو کر رہ گئی تھی۔ بھائی کی شہادت پر فخر کرنے کے باوجود بھی وہ جدائی کا صدمہ سہہ نہیں پار رہی تھی۔ عازہ کی زندگی میں تبدیلی لانے کے لئے بابا جان نے عازہ کی شادی کا فیصلہ کیا۔

اور پھر وہ امی بابا کی ڈھیروں دعائیں سنگ لئے اظہر کے آنگن میں اتر آئی۔

میجر اظہر تب کیپٹن اظہر تھے، وہ عازہ کے لئے بہت اچھے شوہر ثابت ہوئے مگر عازہ کی خاموشی نہ توڑ سکے۔

عازہ کی خاموشی کو رافع کی آمد نے توڑا، یہ رافع ہی تھا جو اسے زندگی کی طرف واپس لایا۔ اس نے اپنے پہلے بیٹے کا نام اپنے شہید بھائی کے نام پر رکھا تھا۔ گوکہ رافع کی یاد اب بھی عازہ کو بے چین کرتی تھی، مگر رافع اور پھر سعد نے حقیقی معنوں میں اس کی زندگی کو ہنسی سے بھر دیا تھا۔ ان کی معصوم شرارتوں میں اداسی بھول گئی تھی مگر وقت نے آج پھر سے عازہ کو اسی مقام پر لاکھڑا کیا تھا۔ لیکن آج وہ ایک جذباتی لڑکی نہیں تھی، بلکہ وہ ایک بہادر ماں تھی۔ ”رافع اظہر“ کی ماں ایک شہید کی ماں اسے ثابت قدم رہنا تھا، اپنے معصوم شہید پر فخر کرنا تھا۔ مگر دل دکھی تھا آنکھوں کی نمی وہ روک نہیں پار رہی تھی۔

”وہ عازہ اظہر تھی ایک بہادر فوجی کی بیوی، شہید فوجی کی بہن اور ایک معصوم شہید کی ماں“ اتنے سارے اعزازات پا کر وہ کیسے روکتی تھی۔

اس کا دل غمگین تھا، آنکھیں اشکبار ہونا چاہتی تھیں مگر وہ صبر کئے ہوئے تھی۔ میجر اظہر کو بھی اپنے بیٹے کی

شہادت پر فخر محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اللہ کے شکر گزار تھے کہ اللہ نے رافع کو اپنے پاس بلا لیا تو کیا ہوا سعد تو ان کے پاس تھا نا۔

ان کو وہ ماں یاد تھی جو اپنے بچوں کو ڈھونڈ رہی تھی اور پھر باری باری اسے اپنے تینوں بچوں کی ممتیں ملی تھیں۔ کیا ان کا دکھ اس ماں سے زیادہ بڑا تھا؟ ایسی باحوصلہ ماںیں کیا کسی قوم کے پاس ہو سکتی تھیں۔ یقیناً نہیں۔

”یہ حوصلہ صرف میرے وطن کی ماؤں میں ہے جو ایک بیٹا شہید کروا کر دوسرا اس نیت سے آرمی میں بھیجتی ہیں کہ یہ بھی وطن کی حرمت پر قربان ہو جائے۔“

میجر اظہر کو یقین تھا کہ یہ قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی اور ایک دن امن ضرور قائم ہوگا۔

آج 16 دسمبر 2015ء کا آغاز ہو چکا ہے۔ ایک اور سرد دن کا آغاز..... وہی دن پھر سے پلٹ آئے ہیں، رافع کو شہید ہوئے ایک سال کا عرصہ بیت چکا ہے، آج ہی کے دن رافع ہنستا کھیلتا اسکول گیا تھا مگر واپس نہ آ سکا۔

رافع کے ساتھ ہی عازہ کو دوسری بے شمار ماؤں کے جگر گوشے یاد آئے جو اس دھرتی پر اپنی جان نچھاور کر چکے تھے۔ ٹھیک دو دن بعد کیپٹن اسفندیار بخاری کو بھی شہید ہوئے پورے چار ماہ ہو جائیں گے۔ یہ وہ قوم کا بہادر سپوت تھا جس نے پشاور میں ایک اور بڑا سانحہ ہونے سے بچا لیا تھا۔

16 دسمبر 2014ء کے سانحے کے بعد پورا پاکستان ہل کر رہ گیا تھا اور شدید غم کی لپیٹ میں تھا۔ اس نازک موقع پر چیف آف آرمی اسٹاف جنرل راحیل شریف نے آپریشن ضرب عضب کا اعلان کیا اور دہشت گردوں کو نیست و نابود کیا جانے لگا۔

کیپٹن آکاش ربانی شہید آپریشن ضرب عضب کا پہلا شہید تھا، وہ بارش کا پہلا قطرہ بنا تھا، ان ہی جیسے

ہزاروں شہیدوں کے لہو سے یہ دھرتی شاداب ہے، ان ہی عظیم قربانیوں کے صلے میں آج پاکستان کے عوام بے خوف و خطر زندگی گزارنے کے قابل ہوئے ہیں۔

اس المناک سانحے کے نتیجے میں اختلافات میں گھری پاکستانی قوم ایک ہو گئی۔ یہ آپریشن ضرب عضب ہی تھا، جس کے نتیجے میں خودکش دھماکے تقریباً نہ ہونے کے برابر ہو گئے۔ دہشت گردوں اور مجرموں کو پھانسیاں دی جانے لگیں۔ جیلوں سے مجرموں کا صفایا ہونے لگا، فوجی عدالتوں کے قیام سے مجرموں کے گرد گھیرا مزید تنگ کر دیا گیا۔ یہ سب ان قربانیوں کا انعام تھا جو پاکستانی قوم نے دی تھیں۔ اپنے جگر گوشوں کی جان کے بدلے وطن عزیز میں امن قائم ہو گیا تھا، ہزاروں زندگیاں محفوظ ہو گئی تھیں۔ یہ سودا مہنگا نہیں تھا۔ ”کچھ لوگ اپنا آج قربان کرتے ہیں تو بے شمار لوگوں کا کل محفوظ ہو جاتا ہے۔“

”ایسے لوگ بہت خاص ہوتے ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس عظیم قربانی کے لئے چنے جاتے ہیں اور ان کا حوصلہ پہاڑوں سے زیادہ بلند ہوتا ہے۔“

عائزہ کو یقین تھا کہ آج رافع بھائی کی روح یقیناً سرخرو ہوگی۔ دشمن نے سقوط ڈھاکہ کے زخم اڈھیڑنے کی غرض سے معصوم پھولوں پر کاری ضرب لگائی تھی اور اس دن کا انتخاب کیا تھا، مگر دشمن کا یہ وار اسی پر الٹ گیا، پاکستانی قوم تو قربانیاں دینا جانتی ہے، ہمیشہ سے اپنا تن من دھن اس پاک وطن پر نچھاور کرتی آئی ہے، اس عظیم قوم کی عظیم پاؤں نے صدمہ بھی حوصلے سے برداشت کر لیا مگر یہ سانحہ دشمن کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا اور نام نہاد تحریک طالبان (ٹی ٹی پی) پاکستان چھوڑ کر بھاگ جانے پر مجبور ہو گئی۔ یہ سب ان معصوم بچوں کے خون کا اعجاز تھا۔

”وطن کی خاطر قربانیاں تو ہر قوم ہی دیا کرتی ہے مگر تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسی قوم گزاری ہو، جس نے

اپنے معصوم پھول تک وطن پر قربان کر دیئے ہوں۔“

عظیم قومیں یقیناً عظیم قربانیاں دیا کرتی ہیں۔

”آرمی پبلک اسکول کے معصوم شہید اور ان کی بہادر نسل شجاعت کی ایک نئی داستان رقم کر گئے ہیں۔ یہ عظیم لوگ کبھی واپس نہیں آسکتے مگر دلوں کی دھڑکنوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔“

عائزہ کو کوئی ایسا لمحہ یاد نہیں تھا جب اسے رافع کی کمی محسوس نہ ہوئی ہو۔

رافع تو وہ طوطا تھا جس میں عائزہ کی جان تھی، مگر اب اسے ہمیشہ رافع کے بغیر ہی رہنا تھا، ان معصوم پھولوں کی یاد میں بے شمار تقاریب ہونے والی ہیں۔ میجر اظہر اور وہ بھی رافع کے والدین کی حیثیت سے مدعو کئے گئے ہیں۔

”16 دسمبر کا دن دشمن کی بزدلی کی علامت کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔“ عائزہ نے نم آنکھوں سے میجر اظہر کو دیکھا جو پرسکون نیند سو رہے تھے۔ دور کہیں موذن اللہ کی بڑائی بیان کر رہا تھا، فجر کا وقت ہو چکا تھا عائزہ ایک نئے عزم کی ساتھ اٹھی اور وضو کرنے چل دی۔

”اللہ تعالیٰ نے اس ایک سال میں پاکستانی قوم پر پاکستان پر بے شمار رحمتیں برکتیں نازل کی تھیں۔ شکر ادا کرنا تو بنتا تھا نا۔“ عائزہ نے تشکر سے سوچا۔

”رافع نے اپنے ماموں کے نام کی لاج رکھی تھی اور بہادری سے موت کو گلے لگایا تھا۔ بہادر فوجی کا بیٹا ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ دشمن کتنے رافع، بسین، آکاش ربانی اور اسفند شہید کرے گا ایک کے بدلے میں دس بیٹے میدان میں اتریں گے۔ تعلیم کا حق کا یہ سفر ہمیشہ جاری و ساری رہے گا اور یہ لازوال قربانیاں تاریخ میں ہمیشہ سنہرے حروف سے لکھی جائیں گی۔“ عائزہ کا چہرہ امید کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔

☆.....

شمینہ فیاض

افسانہ

گہروں پہیلی

الایم کی رنگ سے اس کی آنکھ گھلی فجر کی اذانیں
ہورہی تھیں، رات شادی کی اک تقریب سے دیر سے
آنے کی وجہ سے اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی اور اٹھنے کی
ہمت نہیں ہو رہی تھی، مگر کچھ دیر اٹھ کر بیٹھنے کے بعد وہ نماز



READING
Section

سے محظوظ ہو رہی تھی، کہ اسے یاد آیا آج تو احمد کو جلد آفس جانا تھا اس نے جلدی کچن کا رخ کیا اور ناشتہ بنانے میں محو ہو گئی۔ ناشتہ تیار ہوا تب تک احمد تیار ہو چکے تھے تینوں بچے ابھی تک سو رہے تھے، اس لئے وہ بھی احمد کے ساتھ ہی ناشتہ کرنے بیٹھ گئی، نادیا اور احمد کی شادی کو بارہ سال گزر چکے تھے مگر آج بھی دونوں اک ساتھ ہی ناشتہ کرتے اور ڈنر بھی ہاں احمد کی آفس کے سلسلے میں کوئی میٹنگ ہوتی یا شہر سے باہر گئے ہوتے، تو الگ بات تھی ورنہ ان کے درمیان اتنی محبت تھی کہ احمد کو نادیا کے بغیر

پڑھنے اٹھ گئی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تو چڑیوں کی چچہاہٹ نے اسے صبح نو کا پیغام دیتے ہوئے تازگی کا اک احساس سا اس کے اندر سمودیا۔ سردیوں کے موسم میں نکلتی ہلکی ہلکی دھوپ کی نرمی گرمی صاف نکھرا آسمان گھر کی کھڑکی سے نظر آنے والے پبلک پارک میں واک کرتے لوگ شبنم سے دھلی تازہ سبز گھاس بڑے بڑے درخت جن کے پتے زرد ہو کر گرنا شروع ہو چکے تھے۔ اس کی زندگی کتنی خوبصورت تھی ہر طرف امن چین سکون کا راج تھا، ہر لمحہ اپنے رب کا شکر ادا کرتی نادیا ان لمحات



READING
Section

چمن ملتا اور نہ ہی نادیا کو احمد کے بغیر یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے میسے بھی رہنے کے لئے کم ہی جاتی تھی، ان پچھلے پارہ سالوں میں ان کے درمیان کبھی تو تو میں میں نہیں ہوئی تھی دونوں ہی سلجھے ہوئے انسان تھے۔ ان کی شادی ان کے بزرگوں نے بہت سوچ سمجھ کر رینج کی تھی اور وہ بھی اپنے بزرگوں کے فیصلے کا احترام کرتے ہوئے اس شادی کو بہت خوبصورتی سے نبھا رہے تھے۔ دونوں ہر لحاظ سے اک دوسرے کے ساتھ مناسب تھے۔ دل سے دونوں ہی اک دوسرے کو چاہتے اک دوسرے کی عزت کرتے۔ اک دوسرے کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے۔ بڑوں کے کئے گئے فیصلوں میں مصلحت اور دانشمندی کے وہ اصول تجربوں کے خزانے چھپے ہوتے ہیں جن کے نتائج بعد ازاں نمایاں ہوتے ہیں۔ احمد آفس جانے لگے تو وہ روزانہ کی طرح ان کو چھوڑنے دروازے تک آئی اور پھر احمد کے جاتے ہی گھر بھر کی صفائی اور کاموں میں لگ گئی بچوں کو اس لئے نہیں اٹھایا کہ ان کی سردیوں کی چھٹیاں چل رہی تھیں گھر بھر کے کاموں سے فارغ ہی ہوئی تھی کے بچے اٹھ گئے وہ ان کے لئے ناشتہ بنا کر بیٹھی ہی تھی کہ پڑوسن جو ابھی چند دن پہلے ہی اس گھر میں شفٹ ہوئیں تھیں اس سے ملنے چلی آئیں۔

”جی ہم یہ آپ کے سامنے والے گھر میں شفٹ ہوئے ہیں ابھی ہفتہ بھر پہلے۔“

اس نے بھی بڑے پرتپاک انداز میں استقبال کیا۔

”آئیے آئیے جی میں نے دیکھا تھا جب آپ کے گھر کا سامان اتر رہا تھا، سوچا تھا کہ ملنے جاؤں گی لیکن ایک تو گھر کے کاموں سے فرصت نہیں ملتی پھر بچوں کی چھٹیاں بھی ہیں تو نکلنا ہی نہیں ہوا۔ اور آپ سنائیں کیسی ہیں کیا نام ہے آپ کا؟“

نادیا نے پوچھا۔

”جی لبتی نام ہے میرا۔“

یوں ان کی دوستی کا آغاز ہو گیا لبتی بہت ہی ملنسار خاتون تھیں، ان کے یہاں کوئی بچے نہیں تھے شادی کو دس سال

ہو رہے تھے وہ اکثر اپنے کاموں سے فارغ ہو کر نادیا کے پاس چلی آتیں اپنی تنہائی کو دور کرنے اور وقت گزارنے کا اک اچھا ذریعہ انہیں مل گیا تھا ایسے دھیرے دھیرے دونوں بہت اچھی سہلیاں بن گئیں۔ اک دوسرے کو اپنی ہر پریشانی اور تکلیف یوں بیان کر دیتیں جیسے کوئی بات ہی نہیں لبتی اپنے شوہر کی طرف سے اکثر شک میں مبتلا رہتیں کہ ان کے آفس میں فلاں لڑکی سے کوئی تعلق ہے یا کوئی محلے کی لڑکی ان سے بات کر رہی تھی کبھی ان کی کسی کزن کو لے کر پریشان رہتی اور نادیا انہیں تسلی کے ساتھ ساتھ اک دوست ہونے کا حق ادا کرتے ہوئے اس پریشانی سے نکلنے میں مدد کرتی ہشاپنگ پر جانا ہو یا گروہری لینے دونوں اک ساتھ ہی جاتیں، جو نادیا احمد کے بغیر گھر سے باہر قدم نہیں رکھتی تھی اب اک میسج کر کے اکثر ہشاپنگ پر چلی جاتی اور چونکہ لبتی کے فیملی نمبرز کم ہونے کی وجہ سے ذمہ داریاں اور خرچہ بھی کم تھا، تو نادیا بھی اسی کی طرح آزاد رہنا چاہتی بچوں کے ساتھ اسے الجھن ہوتی۔ احمد کو نادیا کے رویہ میں اک غیر معمولی تبدیلی سی محسوس ہو رہی تھی، جو کسی حد تک اسے کھل بھی رہی تھی لیکن نادیا کو خوش دیکھ کر وہ چپ ہو جاتے اور اس سے کچھ نہ کہتے۔ نادیا کی زبان پر لبتی کے قصے ہوتے ان کے گھر میں کیا ہوتا ہے وہ میاں بیوی فلاں جگہ کھانا کھانے گئے، اس نے آج یہ پکایا تھا ہمارے گھر بھی دے کر گئی میں آج لبتی کے ساتھ فلاں جگہ گئی تھی۔ یا کل ہمیں پارلر جانا ہے جب کہ اس سے پہلے نادیا کی زبان پر صرف بچوں کی باتیں ہوتیں تھیں، مستقبل کے سہانے خواب ہوتے اور آنے والے دنوں کے کاموں کا ذکر ہوا کرتا تھا۔ جبکہ اب اکثر احمد کے کام پورے نہیں ہوتے تھے اسے اکثر کپڑے استری شدہ نہیں ملتے، تو کبھی رات کا کھانا جلا ہوا ملتا، گھر کی طرف بھی نادیا کی توجہ کم ہو گئی تھی، جس کا جواز نادیا بچوں کے امتحان بتاتی احمد کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوتی کیونکہ اس سے پہلے بھی بچوں کے امتحان ہوا کرتے تھے اور اسے کبھی کسی بات کی شکایت کا کوئی موقع نہیں ملا تھا، لیکن وہ پھر بھی خاموش رہا کہ ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو بچوں کے امتحان ہو جائیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا اسے بچوں کی صحت پر بھی اثر پڑتا دکھائی

دے رہا تھا، اس کے تینوں بچے قدرے پتلے دبلے ہوتے جا رہے تھے، وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ آج شام جب احمد آفس سے گھر آئے بچوں کے امتحانوں کا نتیجہ آیا ہوا تھا جو کوئی خاص نہ تھا سب پیمیکس میں بس شاپنگ مارکس تھے، احمد کو بلاوجہ غصہ کرنے کی عادت نہیں تھی۔ لیکن اسے اس بات پر واقعی بہت غصہ آیا اور اس بار اس نے بچوں کو تو بہت ڈانٹا ہی نادیا یہ کو بھی دو چار سنا دیں۔

”تم تو کہہ رہی تھیں سارا دن بچوں کو پڑھانے میں نکل جاتا ہے اس لیے کاموں کی فرصت نہیں ملتی، تو یہ پڑھایا ہے تم نے کیا خوبصورت نمبر آئے ہیں میرے بچوں کے! بس اب اک سہلی جو مل گئی ہے اب بچے اور میاں کی کیوں فکر ہوگی، گھر کی حالت بھی خراب ہے کوئی ہوش ہی نہیں ہے جب دیکھو بیگم صاحبہ اپنی سہلی سے جڑی بیٹھی ہیں اور کوئی کام ہی نہیں وہ تو بے کار ہے کوئی کام نہیں تمہارے تو تین بچے ہیں ہوش کرو ذرا۔“

اور اس کا اتنا کہنا بھی بہت تھا، کیونکہ اس نے آج تک نادیا کو اک لفظ بھی نہیں کہا تھا آج نادیا کو احمد کا رویہ بہت بدلا ہوا لگا، اسے اپنے اندر کوئی چیز ٹوٹی ہوئی محسوس ہوئی، ڈنر پر سب ساتھ تو بیٹھے تھے لیکن اک خاموشی تھی جو ان کا حصار کئے ہوئے تھی نادیا کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ کھانا کھائے لیکن احمد کی خاطر بیٹھ گئی اور دو چار نوالے لے کر اٹھ گئی۔ احمد کو بھی اس کا یہ رویہ تکلیف دے رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اک تو اس کی غلطی ہے کہ بچوں کو ڈھنگ سے پڑھایا نہیں اور اوپر سے نہ معافی مانگی اور کھانا چھوڑ کر اکڑ دکھا رہی ہے۔ حالانکہ بھوک اس کی بھی مر چکی تھی وہ چیخ کر کے بغیر کوئی بات کئے کمرے میں چلے گئے وہ برتن اٹھا کر پچن صاف کرتی جاتی اور آنسو تھے کہ تمہنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے، اک سیلاب تھا جو آنکھوں میں امنڈ آیا تھا پر احمد جو اس کی آنکھوں سے کبھی آنسو نہ نکلنے دیتے تھے، آج اپنی انا میں اس سے بات کئے بغیر ہی سو گئے تھے، وہ سارے کام ختم کر کے جب کمرے میں آئی تو احمد سو چکے تھے وہ ہانے کب تک ہی پہر سوچتی اور روتی رہی

یہ سوچیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں، انسان اگر غلط نہیں کا شکار ہو جائے دل بدزن ہو جائے، تو ہمیں دکھ اور منگی سوچوں کی دلدل میں کھینچتی چلی جاتیں ہیں وہ سوچتی چلی گئی۔

”کہیں واقعی احمد کا کوئی افیئر تو نہیں چل رہا جو بچوں کا غصہ بھی مجھ پر نکال دیا، انہیں میری ہر بات بری لگ رہی ہے لہذا ٹھیک کہتی ہے مرد ذات کا کوئی بھروسہ نہیں کب بدل جائے، جیسے جیسے عورت کی عمر ڈھلتی ہے مرد اپنے پروفیشن میں ترقی حاصل کرتا جاتا ہے، یہ وقت دونوں میں فرق پیدا کر دیتا ہے ایسے میں عورت بوجھ لگنے لگتی ہے۔“

سوچتے سوچتے روتے روتے پوری رات گزر گئی فجر پڑھ کر وہ لیٹی ہی تھی کہ نیند نے ایسا دبوچا کہ اسے ہوش ہی نہ ہوا کہ وہ سوئی رہ گئی اور جب اس کی آنکھ کھلی تو بچے اسکول اور احمد آفس جا چکے تھے، ڈائیننگ ٹیبل پر پڑے دودھ کے خالی گلاس اور بریڈ اور جیم کی بوتل اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ احمد نے انہیں ناشتہ بھی کرا دیا تھا۔ دس بج رہے تھے اس کی سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیا کرے ہاتھ پیر کا نیتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے، یہ بھوک کی وجہ سے تھا یا اس سٹینشن کی وجہ سے کہ احمد مجھ سے ناراض تھے اور بنا بات کئے چلے گئے مجھے اٹھا ہی دیتے بچوں نے بھی پتا نہیں کچھ کھایا کہ بس ایسے ہی دودھ پی کر چلے گئے۔ اس کا سردرد سے پھٹا جا رہا تھا چائے بنا کر اک ٹوس کھانے کے بعد وہ کچھ بہتر محسوس کر رہی تھی اور اتنے میں لہنی اس کے پاس چلی آئی۔ وہ پہلے تو کترانے کی کوشش کرتی رہی لیکن اس کی سوچھی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ روتی رہی ہے اور لہنی کے اصرار پر اسے سب کچھ بتانا ہی پڑا لہنی نے دل کا بوجھ ہلکا کر کے اسے اب بہتر محسوس ہو رہا تھا۔ لہنی نے اس سے پوچھا۔ ”احمد کے آفس میں کوئی لڑکی تو نہیں جو احمد کو اب تمہاری پروا نہیں دے رہا ہے تمہیں اک لفظ بھی نہیں کہتا تھا اس کے بدلے رویہ پر نظر رکھو ایسا نہ ہو کہ وہ ہاتھ سے نکل جائے، ویسے ہی مرد ذات کا کچھ بھروسہ نہیں ہوتا۔“

نادیا دھیمے لہجے میں ہلکے سے مسکرانے کی ناکام

بھی ان کے ساتھ ہی تھی پیٹرز پر بیٹھے کپل اسے اپنے اور احمد کی محبت کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر رہے تھے۔ ہلکی سرد ہوا اس کے اندر تک محسوس ہو رہی تھی، یہ چند گھنٹے اتنے بھاری ہو گئے تھے کہ صدیوں پر محیط ہو گئے تھے، شام کو احمد کے آنے سے پہلے بچوں کو کھانا کھلا کر سلا دیا اور خود نہا کر تیار ہو گئی اچھے سے کپڑے پہنے پر فیوم لگایا میک اپ کیا وہ اس کا انتظار ہی کرتی رہی یہاں تک کہ رات کے گیارہ بج گئے۔ تبھی احمد کا فون آیا۔

”تم کھانا کھا کر سو جاؤ مجھے دیر ہو جائے گی، آفس میں اک میٹنگ چل رہی ہے۔“

وہ ابھی کچھ کہنا ہی چاہتی تھی۔

”لیکن میں نے تو۔۔۔۔۔۔“

احمد کی بارعب آواز نے اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔ ”ابھی بات نہیں کر سکتا میٹنگ میں ہوں، بس کھانا کھا کر سو جاؤ، اور فون بند ہو گیا۔ وہ کتنی ہی دیر ریسیور پکڑے بیٹھی رہی سمجھ نہیں آ رہی تھی اسے اک بار پھر زور سے جھٹکا لگا تھا۔

”بات اتنی کیوں بڑھ گئی کہ تم مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کر رہے کیا یہی میری محبتوں کا ثمر ہے اک چھوٹی سی غلطی میری ہر قربانی ہر ایثار پر بھاری ہو گئی، تمہارا دیر سے گھر آنا اور جلدی جانا مجھے شک میں مبتلا کر رہا ہے، میں کیا کروں کس سے کہوں لینی تمہارے علاوہ تو اب کوئی دوست سہیلی بھی نہیں رہی۔ اک دل کی بات کر لیتی تھی تو وہ بھی تمہیں کھل گئی اب کیا کروں۔

”احمد! ایسا بھی کر سکتے ہیں اتنا کیسے بدل گئے؟ اور آج سے پہلے کبھی ہم نے اکیلے کھانا کھایا ہے جو آج میں ان کے بغیر کھالوں۔“

ان ہی سارے سوالوں کے جواب ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس نے سارے برتن اٹھا کر رکھ دیئے اور بیڈروم میں جا کر لیٹ گئی پر نیند کہاں تھی اسے تو صرف احمد کا انتظار تھا، کچھ گلہ کرنا تھا اور کچھ ان سے سننا تھا کہ اتنا خفا کیوں ہیں۔ اسے اپنے سینے پر منوں بوجھ محسوس ہو رہا تھا ان بارہ برسوں میں

کوشش کرتے ہوئے بولی۔
”ارے نہیں نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ان کے آفس میں تو بہت سی لڑکیاں کام کرتی ہیں، لیکن وہ کبھی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، میں جانتی ہوں ان کو وہ اس چکر میں نہیں ہیں بس بچوں کی وجہ سے تھوڑا غصہ آ گیا تھا اس لئے مجھے بھی سنا دیں، ورنہ ایسی کوئی بات نہیں اک آدھ دن میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

وہ لبتی سے تو کہہ رہی تھی لیکن خود اپنے دل کو کیسے قائل کرتی کہ خود اس سوچ کا شکار ہو چکی تھی۔

”ہوں ٹھیک ہے۔“

لبتی نے کچھ سوچتے ہوئے نادیدہ سے کہا۔

”تم بہتر سمجھتی ہو گی تمہارے شوہر ہیں، لیکن کوئی مسئلہ ہو تو مجھے ضرور بتانا میں تمہارا یہ مسئلہ یوں حل کروادوں گی۔“

وہ اپنے گھر چلی گئی لیکن نادیدہ کا دل تھا کہ قابو میں نہیں آ رہا تھا رہ کر آنکھوں کے بند ٹوٹ جاتے اور اک جھرنا رواں ہو جاتا، وہ اپنے رب سے رورو کر دعا مانگتی جاتی۔

”اے مالک! میرے احمد کو صرف میرا ہی رکھنا، انہیں مجھ سے محبت کروادے ہماری دوریوں کو گھٹادے، ہمارے دلوں کو ملا دے۔“

ان آنسوؤں میں اس کی ساری توانائی جو احمد کی محبت سے حاصل ہوتی تھی وہ اعتماد وہ سرشاری جو اسے جینے کی توانائی بخشتی تھی بے جا رہی تھی، وہ خود کو دنیا کی سب سے کمزور انسان محسوس کرتی تھی اور سارا گھر صاف کرنے کے بعد پورے دل سے احمد کی پسند کا کھانا بنایا اور سوچ کر بیٹھی تھی کہ آج احمد کو منالوں گی، ان کا غصہ ختم ہو جائے گا اور سب ٹھیک ہو جائے گا، بچے اسکول سے آئے تو کھانا کھلا کر انہیں ہوم ورک کرانے بیٹھ گئی، وہ اتنی

چڑچڑی ہو رہی تھی کہ بچوں کا پات بے بات لڑنا اسے برا لگ رہا تھا اس کے اعصاب سفل ہو رہے تھے، بچوں کو ڈانٹ کر جلدی سے ہوم ورک کروایا اور ٹی وی دیکھنے بٹھا دیا کارٹون دیکھنے کے بعد بچے پارک چلے گئے، وہ

اس جیون پہیلی کو نہ سلجھا سکے، وہ اسی بھول بھلیاں میں ساری زندگی گھومتی رہتی ہے، جس سے امید ہوتی ہے وہ امید ٹوٹ جائے تو بہت دکھ ہوتا ہے، خود کو ان کی جگہ رکھ کر دیکھو۔“

نادیہ کو اپنی غلطی کا احساس تو تھا لیکن احمد کے اکھڑے رویہ سے شکایت بھی تو آنسوؤں کا سلسلہ اک بار پھر جاری ہو گیا تھا وہ نادم تھی مگر انا کی دیوار اور شک کی رنجیر سے بندھی ہوئی تھی لیکن لبتی کی باتیں سننے کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا آج کچھ بھی ہو جائے وہ احمد سے بات کر کے رہے گی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ احمد ابھی آ جائیں اور وہ اپنے دل کی ہر بات کہہ کر دل صاف کر لے۔ پہلے اس نے سوچا کہ فون کر لے۔ ”مگر بات آدمی ادھوری نہ رہ جائے اور احمد نے اگر غصہ کیا اور فون بند کر دیا تو میں کیا کروں گی اس سے بہتر ہے جب وہ گھر آئیں تو پھر ہی بات کروں گی۔“ بچوں کے گھر آنے کے بعد اس نے کھانا کھلا کر روزانہ کی طرح ہوم ورک کر لیا اور کھیلنے پارک بھیج دیا، وہ اس سارے ذہنی دباؤ سے اتنی تھک گئی تھی کہ کچھ دیر سونا چاہتی تھی۔ احمد کے گھر آنے سے پہلے وہ بچوں کو کھانا کھلا کر سلا چکی تھی مگر یہ کیا احمد آئے تو وہ کھانا گرم کر کے لگا ہی رہی تھی کہ ہم ساتھ مل کر کھائیں گے احمد بھی اس کوفت سے تھک چکے تھے۔ احمد ڈانگ ٹیبل پر بیٹھے تھے انہوں نے نادیہ کے ہاتھ سے لے کر پلیٹ رکھی اور اس کے دونوں ہاتھوں کو تھامتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔ وہ حیران تھی کہ ابھی تک وہ مجھ سے ناراض تھے احمد نے کہا۔

”تمہاری یہ روتی ہوئی آنکھیں مجھے کتنی تکلیف دیتی ہیں تمہیں اندازہ بھی نہیں۔“

نادیہ کی اناک بار پھر جاگ اٹھی۔

اس نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

”تو ایسے کام کرتے ہی کیوں ہیں کہ ان آنکھوں میں آنسو آ جائیں۔“

”ایسا میں نے کیا کہہ دیا کہ تم نے مجھ سے بات کرنا ہی چھوڑ دی۔“

ایسا کبھی بھی نہیں ہوا تھا رات کے ساڑھے گیارہ بج گئے تھے، وہ بے تابی سے نہل رہی تھی وقت کا گزرتا ہر لمحہ اسے پریشان کر رہا تھا کہ احمد اب تک کیوں نہیں آئے۔ اس نے کال کرنے کی کوشش کی لیکن موبائل میں بیلینس ختم ہو چکا تھا اسے یاد آیا شام میں بچے اس پر گیم کھیل رہے تھے، تو انہوں نے ہی کہیں کال ملا کر ضائع کر دیئے ہوں گے۔ بچوں کو یوں اکیلا چھوڑ کر بیلینس ڈلوانے جا بھی نہیں سکتی تھی، کیا کرے اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ احمد کے انتظار میں جاگنا چاہتی تھی اور اسی اضطراب میں سوا بارہ بج گئے نہ جانے کب وہ ٹی وی چلتا چھوڑ کے سو گئی۔ احمد کے پاس ایک سٹرا چائی تھی تبھی وہ آ کر سو گئے، آدمی رات میں جب اس کی آنکھ کھلی تو احمد کو سوتا پا کر وہ اطمینان سے سو گئی کہ صبح بات کروں گی۔ اگلی صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو آٹھ بج رہے تھے اور بچوں کا اسکول ساڑھے آٹھ بج لگتا تھا اس نے جلدی جلدی بچوں کو تیار کیا ناشتہ بنایا لٹچ باکس میں بریڈ پر جیم لگا کر رکھا اور احمد کو بھی دیر ہو رہی تھی، اسی بھگدڑ اور جلدی میں احمد سے کوئی بات ہی نہ ہو سکی اور وہ بچوں کو لے کر گھر سے نکل گئے۔ اس کا سردرد سے پھٹے جا رہا تھا خود بھی چائے پی کر وہ گھر کے کاموں میں لگ گئی۔ لبتی اس کا انتظار کر رہی تھی اور نادیہ نہ پہنچی تو وہ خود آ گئی تھی ساری بچویشن جاننے کے بعد لبتی نے اسے تسلی دی اور سمجھایا۔

”تم سے تو چند الفاظ کہے ہیں احمد نے وہ بھی اس کا حق ہے کیونکہ وہ تم پر بھروسہ کرتے ہیں کہ تم ان کے بچوں کی اچھی تربیت کر رہی ہو اور انہیں اچھے طریقے سے سنبھال سکتی ہو جب انسان کسی پر اعتماد کرتا ہے تو ساری فکروں سے آزاد ہو جاتا ہے اور اسی اعتماد کو اگر ٹھیس لگ جائے تو رشتوں میں دراڑیں پڑنے لگتی ہیں جس کو ایسا جیون سا تھی مل جائے اسے دنیا میں ہی جنت مل جاتی ہے تم بہت خوش قسمت ہو کہ تمہیں اتنا جاننے والا شوہر ملا ہے، ہر اک کی قسمت ایسی نہیں ہوتی لڑکی کی شادی اک پہیلی کی طرح ہوتی ہے، جو اسے سلجھا لے وہ اس بھول بھلیاں سے نکل کر زندگی کی راہ میں اپنے جیون سا تھی کے ساتھ آگے بڑھ جاتی ہے اور جو

احمد کو بھی اپنی انا پیاری تھی دکھ اور غصہ اس کے الفاظ اور لہجے سے صاف جھلک رہا تھا۔
نادیہ اپنے رکے ہوئے آنسوؤں کو مزید روک نہ سکی۔

”مجھے بچوں کے سامنے ذلیل کر دیا اتنا کچھ سنایا پھر پوچھتے ہیں کہ میں نے ایسا کیا کہا دیا۔“
احمد جسے ایک بار پھر بھڑک اٹھا تھا۔
”تو غلطی بھی تو تمہاری تھی سارا سارا دن اپنی سہیلی کے ساتھ وقت گزارتی ہو، گھر کا بچوں کا میرا کسی کا کوئی خیال نہیں کھانا جل جاتا ہے کپڑے استری نہیں ہوتے، بچے تقریباً قیل ہو گئے تھے اور تمہیں کوئی کچھ کہے بھی نہ۔۔۔۔۔“
نادیہ روتے ہوئے بولی۔

”آپ بدل گئے ہیں۔ احمد! میری ہر بات کا خیال رکھنے والے احمد مجھ سے دور ہو گئے ہیں۔ آپ آفس کی مصروفیت میں اتنے محورتے ہیں کہ آپ کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ میں تنہائی کا شکار ہو گئی ہوں، مجھے بھی اک سہیلی کی اک دوست کی ضرورت ہے کیا میرا کام صرف بچوں، گھر اور آپ کی دیکھ بھال ہے میری اپنی بھی کوئی ضرورتیں ہیں، مانا کہ زیادہ وقت میں نے کبھی کو دیا۔ لیکن اک عرصے کے بعد تازہ ہوا کا جھونکا بن کر آئی ہے وہ میری زندگی میں میری زندگی تو صبح سے شام تک اسی گھر کا طواف کرتی ہے اس دائرے سے باہر نکل کر چند لمحے سانس لی تو آپ کو برا لگ گیا۔“

احمد نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا چلو اب سے مزید ٹائم دیا کروں گا اور تم بھی بچوں کی پڑھائی پر اور توجہ دو غصے میں کہے گئے الفاظ اکثر بعد میں زخم بن جاتے ہیں میں اپنی غلطی کو تسلیم کرتا ہوں، لیکن تم نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ میں اتنا چڑچڑا کیوں ہو رہا تھا، آفس میں کام کی زیادتی اوپر سے نوکری جانے کا خوف میرے اعصاب پر بری طرح اثر انداز ہو رہے تھے، میں بھی تو ان بارہ سالوں میں تمہاری محبتوں اور تمہارے وقت کا عادی ہو چکا ہوں، ہاں اب

میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا اور یقیناً تم بھی ہمیں کسی اور سے زیادہ اک دوسرے کی ضرورت ہے اور اک دوسرے کے وقت کی بھی۔“

”ہاں اسی لیے کل صبح مجھے اٹھائے بغیر چلے گئے مجھ سے بات بھی نہیں کی۔ سارا دن میں پریشان رہی۔“
نادیہ ناراضی ظاہر کرتے ہوئے کہہ رہی تھی احمد کو بھی مزا آ رہا تھا وہ بھی اک دم خوشگوار موڈ میں آ گیا تھا اس کا ہاتھ پکڑ کر قریب کرتے ہوئے بولا۔

”وہ تو مجھے اپنی مہارانی صاحبہ سوتے ہوئے اتنی اچھی لگ رہی تھیں کہ دل چاہا ایسی دو ہوں۔“
نادیہ بھی موڈ میں تھی وہ اس کے مذاق کو سمجھتے ہوئے زور سے ہنس دی احمد کی مستی نے گھر میں ہنسی کا ماحول بنا دیا تھا، احمد نے یوں اچانک بیان بدلہ کہ نادیہ زور سے ہنس دی۔

”اچھا تو رو کی خواہش ہے مہاراجہ صاحب کو۔“

احمد اسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لیے کہہ رہا تھا۔
”اور کیا! ہمیں تو اسلام نے بھی اجازت دی ہے۔“
پھر دونوں جانے کب تک ہنستے ہی رہے۔

دونوں نے مل کر کھانا کھایا نادیہ اور احمد دونوں کے اعصاب پر چھائے بدگمانیوں کے سارے بادل چھٹ چکے تھے۔ آج تین دن بعد اسے ٹھیک سے نیند آئی تھی اک روشن اور خوبصورت صبح اس کا استقبال کرنے کو تیار تھی آج اک بار پھر اسے باہر کا منظر دیکھ کر خوشی اور اطمینان کا احساس ہو رہا تھا، ان ہی درختوں پر جب نئی کونپلیں نکل رہی تھیں منظر بدل رہا تھا، پارک میں سردی کم ہو جانے کی وجہ سے لوگوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو چکا تھا چڑیوں کی چچہاہٹ میں وہی سریلانگیت بچ رہا تھا، جو روح کے اندر تک اترتا محسوس ہوتا ہے اسے آج یہ ماننے میں کوئی اعتراض نہ تھا کہ ان دونوں نے مل کر اپنی زندگی کی جیون سہیلی سلجھالی تھی، اور اب زندگی کی راہ کو اک منزل کی جانب جانا تھا۔

☆☆☆

عائشہ احمد

افسانہ

پہرہ دل کی



READING
Section

”جو رشتہ آتا ہے تمہاری وجہ سے واپس ہوتا ہے۔
میں کہتی ہوں کہ تم نے اس گھر میں جادو کر رکھا ہے سر کو تم
نے اپنی مٹھی میں کر لیا ہے۔ شوہر پہلے ہی دیوانہ ہے اور
تو اور جو نہی اظفر آتا ہے۔ کالج سے تمہارے آگے پیچھے
گھومتا ہے۔ ثروت غصے سے بولیں۔

”امی! میں کچھ ایسا نہیں کرتی آپ لوگوں کو وہم
ہے۔“ حریم بولی۔

”تمہاری وجہ سے میری بہن چھوٹ گئی بچپن کی
مانگ تھی میری بھانجی میرے بیٹے کی۔ تم سے ملا اور
بس ایک منٹ میں پلٹ گیا کہ اگر شادی کروں گا تو
صرف حریم سے کروں گا، اور اب تمہارا قبضہ ہے اس
پر۔“ ثروت بولیں۔

”میں تو جا رہی ہوں تھوڑی دیر کے لئے اپنی بہن
کے گھر جب میں آؤں تو سارا کام گھر کا کر کے
رکھنا۔“ وہ یہ کہہ کر باہر نکل گئیں۔
تبھی سندا آ کر سامنے کھڑی ہو گئی۔

”حریم بھابی! میری دوستیں آرہی ہیں آپ فنا
فٹ ناشتہ بنا دیں۔“

”بس ایک منٹ ابھی دیتی ہوں۔“
”بس ایک منٹ..... کیا مطلب ہے اس بات
کا؟ صرف بولیں یس، ڈیس اٹ۔“ وہ غصے سے
کرسی کو ٹھوک مارتے ہوئے بولی تھی۔

وہ چائے لا کر جو نہی ٹیبل پر رکھنے لگی۔ شازی نے
میٹ کو زور سے کھینچا ساری چائے اچھل کر حریم کے
پیروں تک آئی تھی۔ وہ چیخ مار کر دیوار سے جا لگی۔
سرفوراً ہی کمرے سے باہر آ گئے تھے، شور سن کر۔

”کیا ہوا؟“ گری ہوئی چائے دیکھ کر وہ فوراً ہی سمجھ
گئے کہ یہاں پر کیا ہوا ہے۔ اظفر کو انہوں نے آواز دی
اور جلدی سے وہ ہاسپٹل کے لئے دوڑے تھے۔
”کہاں ہیں امی! آپ جلدی گھر آئیں۔“

شازی نے امی کو فون کیا تھا۔

”کیا ہوا میری جان! خیریت؟“

”نہیں امی! خیریت نہیں ہے حریم نے خود اپنے
پیر پر چائے گرائی ہے اور چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر
اٹھالیا۔“

”ابھی آتی ہوں گھر میں اس جادو گرنی کو ٹھیک کرتی
ہوں۔ بڑی زلفیں اڑا کر میرے بیٹوں کو متاثر کرتی
ہے۔“ ثروت غصے سے بولیں۔

”کیا ہوا شازی کی ماں تھوڑی دیر تو بیٹھو۔“ ان کی
بہن عظمیٰ بولیں تھیں۔

”مت پوچھو ہمارے گھر میں جو آئے دن تماشہ
ہوتا ہے۔ حریم ہر وقت آئینے کے سامنے کھڑی رہتی
ہے۔ بار بار اپنے بالوں کو برش کرے گی اور دیکھے
جائے گی۔ ایک دن تو حد ہو گئی شازیہ نے چھپ کر
اس کے کمرے میں جھانکا تو وہ لہر لہرا کر ڈانس کرتے
ہوئے اپنے بالوں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر بالوں پر ہونٹ
رکھ کر بڑی مطمئن ہو کر کچھ منتر پڑھ رہی تھی۔“

”اس کی ماں کے بھی یہی کرتوت تھے۔“ عظمیٰ بولیں۔
”کیا کروں فیصل اس کا دیوانہ ہے ورنہ میں تو
اسے ایک دن بھی نہ رکھوں۔ سچ آپ مجھے بھی بڑا برا لگتا
ہے وہ اپنے لمبے بالوں کی چوٹی کے ساتھ مٹکتی ہوئی
چلتی ہے گویا اس کے مقابلے کا کوئی نہیں ہے اور ہنستی
ہے وہ ہم لوگوں کے بالوں پر طنز کرتی ہے۔“

”کم بخت ہم لوگ ہیں تبھی تو گنجے، نہ صورت نہ
شکل بس اللہ کی دین ہے کہ بالوں کے گچھے کے گچھے
اس کے سر پر لہرا رہے ہیں۔“

”دیکھتی ہوں گھر جا کر، کسی دن پکڑ کر استرا نہ
چلوادیا تو میرا نام ثروت نہیں۔“

”مزا آ جائے پھر تو ساری چوکڑی بھول جائے
گی۔“ عظمیٰ بولیں۔

”شام ہوتی ہے پھر دیکھو بی بنو کا سنگھار، نہادھو کر کپڑے پہن کر بالوں کو بالکنی میں بیٹھ کر سلجھاتی ہے، تاکہ فیصل وہیں سے دیکھ لے، اور ہاں کبھی کبھی تو یہ بھی ہوتا ہے فیصل اسے وہیں سے آواز دے گا وہ اس کے حسن کا دیوانہ ہے ایک بار کیا ہوا عظمیٰ“۔ وہ کہتے کہتے رک گئیں۔

”نہ ہی یہ کوئی کہانی ہے اور نہ ہی کوئی ڈرامہ ہے۔“ فیصل نے اپنی انگلیوں سے اس کے بال بکھیر دیئے تھے۔ وہ ہنستے ہوئے اسے خدا حافظ کہنے کے لئے آگے بڑھی تو شازی جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔

امی سے ایک کی دس لگانے شازی پہنچ گئی تھی۔

”کیا کروں شازی فیصل اس کا دیوانہ ہے۔“ ثروت سب سن کر بولیں۔

”تو بس تماشہ دیکھتی رہیں آپ وہ تو اس کی زلفوں کا اسیر ہے وہ تو لے کر نکل جائے گی بھائی کو جادو کرنی کہیں کی۔“

”پھر کیا کروں میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا ہو رہا ہے اس گھر میں جس سے بات کرو وہی اس کا حمایتی بنا پھر رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے امی یہ کام میں خود کروں گی۔ ایک دن اس کی چٹیا میں آگ لگا دوں گی۔“

”شازی! دیکھ بھال کر اگر جل گئی تو مصیبت ہو جائے گی آجکل چپے چپے میں میڈیا والے گھوم رہے ہیں، بیٹھے بٹھائے کوئی مصیبت نہ کر لینا۔“

”امی! جب میری اپنے بالوں پر نظر پڑتی ہے تو ایک آگ سی لگتی ہے اور تو اور آپ دیکھیں بڑے بھیا امریکہ سے میرے لئے وگ لے کر آئے تھے ایسا دل جل رہا تھا کہ دل چاہ رہا تھا اٹھا کر ان کے منہ پر ماروں۔ اس وقت حریم کھکھلا کر ہنسی تھی بھولی نہیں ہوں میں اظفر کیا کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔ امی آپ بھی ایسے موقع پر کچھ بولتی نہیں ہیں کہ سب کے لئے تم پر فیوم کپڑے وغیرہ لارے ہو اور اکلوتی بہن کے لئے وگ لارے ہو۔“ دل میں لگی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی۔ تو وہ ذہن میں کئی طرح کے منصوبے ترتیب دینے لگی طرح طرح کے پلان بنانے کے بعد اسے بس یہی راستہ نظر آیا کہ کوئی ایسا لوشن سر پر لگا دیا جائے کہ جو سارے

”کیا، کیا۔“ وہ بھی اور قریب چلی آئیں۔

”بے غیرت کہیں کا دروازہ کھلا تھا میں یونہی چلی گئی۔ دیکھا تو اس کے بالوں سے کھیل رہا ہے۔“ ثروت شرما کر بولیں۔

”ہائے آپا کتنا بے شرم ہے۔“ عظمیٰ بھی جھینپ گئیں۔

”کسی دن مجھے غصہ آ گیا ناں تو حساب برابر کروں گی۔“ ثروت بولیں۔

☆.....

ثروت جب گھر پہنچیں تو حریم گھر آ چکی تھی سب لوگ چپ چپ تھے۔

”زیادہ ڈرامہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے مجھے سب معلوم ہے جو کچھ یہاں ہوا ہے۔“ انہوں نے ایک گہری نظر حریم پر ڈالی اور مڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

صبح جلدی جلدی فیصل آفس کے لئے تیار ہو رہا تھا تب شازی نے اپنے کان جاسوسی کرنے کے لئے دروازے کے ساتھ لگا دیئے۔ فیصل بول رہا تھا۔

”سچ حریم میری جان تمہارے بالوں میں ہے پہلی بار میں تمہارے ان بالوں کو دیکھ کر ہی عاشق ہو گیا تھا۔ امی نے کئی لڑکیوں کو مجھے دکھایا مگر میں نے ہمیشہ انکار کیا اور کہا کہ مجھے وہ بلیو کپڑوں والی لڑکی پسند آئی ہے۔“ حریم ہنس کر کپ میں چائے ڈالنے لگی۔

”یہ تو وہی بات ہو گئی کہ شہزادے کی جان ایک طوطی میں بند ہو گئی میں نے بچپن میں پڑھا تھا۔“

ہے وہ تمہیں پسند نہیں کرتی اس لئے اس نے ایسا کیا۔

☆.....

سب گھر والے افسردہ اور پریشان تھے شازی قہقہے لگا کر ہنس رہی تھی۔

”میں نے اپنا انتقام لے لیا دیکھو اپنی شکل آئینے میں میری جیسی لگ رہی ہو۔“ وہ اسکارف باندھ کر اپنی ماں کے گھر چلی گئی وہاں بھی سب لوگ افسردہ اور پریشان ہو گئے۔

☆.....

اس کے بچپن کی ایک پرانی دوست جب اس سے ملنے آئی تو وہ بھی اسے دیکھ کر حیران رہ گئی کہ حریم وہ حریم ہی نہ تھی اس کی مسکراہٹ، آنکھوں کی چمک سب کچھ ماند پڑ گیا تھا۔ کسی کے سامنے اسے جاتے ہوئے شرم آتی ہر وقت وہ اسکارف لپیٹے رکھتی۔ وہ اپنی سرال سے کٹ کر رہ گئی تھی۔ فیصل بھی اپنی طرف سے خاموش تھا اس نے بھی کوئی رسپانس نہیں دیا تھا۔ پھر اس کی دوست بڑی رازداری سے کوئی چیز چھپا کر شاپر میں لائی تھی۔

”حریم میری جان! مجھ پر بھروسہ کرو اور جو میں کہوں گی وہ تم کرو گی جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔“

”کچھ نہیں بنیں اب کچھ نہیں ہو سکتا میں بازار سے بہت اچھی دگ لے کر آئی ہوں اور اب میں اس بات کو بھول چکی ہوں میں فیصل کا سامنا نہیں کر پار رہی اور نہ وہ مجھے اپروچ کر رہے ہیں اور نہ میں اب وہاں جاؤں گی۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”حریم تم سمجھنے کی کوشش کرو بال انسانی حسن کا ایک اہم حصہ ہیں بالوں کے بغیر انسان ادھورا ہوتا ہے۔ فیصل بھائی حق بجانب ہیں تمہیں اپنے بالوں کی حفاظت کرنی چاہئے تھی۔“

”بینش میں کیا کر سکتی تھی شازی نے سوتے میں میرے بالوں پر لوشن ڈال دیا بروقت اگر پانی مل جاتا تو

اور پھر ایک رات ایسا ہی ہوا شازی نے پہلے سارے نل کھول کر پانی بہا دیا پھر خاموشی سے بھری بوتل کا سارا لوشن لا کر حریم کے سر پر انڈیل کر مساج کر دیا تو حریم چیخ کر اٹھی سبھی گھر والے آگئے تھے۔

”یہ کیا ہے، یہ کیا کیا تم نے۔“ حریم جلدی سے اپنے بالوں کو نوچ رہی تھی پھر جلدی سے شاور لینے بھاگی تو وہاں پانی نہیں تھا۔ شازی ہنس رہی تھی۔

”آج فیصل کی ٹائیٹ ہے صبح تمہاری اس گھر میں آخری صبح ہوگی میں نے انتقام لے لیا تم میرے کم بالوں پر ہنستی تھیں آج میں نے تمہیں بھی ویسا بنا دیا۔“

”شازی یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔“ وہ جیسے جیسے بالوں کو ٹاول سے سمیٹ رہی تھی بال گرتے جاتے تھے فریج سے پانی کی بوتل نکال کر بالوں کو دھویا لیکن سر میں کچھ بھی نہ بچا وہ شاور لینے کے بعد باہر نکلی تو آئینہ دیکھ کر رونے لگی اس کے بال سامنے سے غائب ہو چکے تھے وہ حسن حسن ہی نہ رہا تھا۔

حتیٰ کہ جب فیصل گھر آیا جو نہی اس کی نظر حریم پر پڑی تو وہ بے ساختگی سے بولا۔

”حریم کہاں ہے۔“ حریم سسک سسک کر رو رہی تھی۔

”یہ سب شازی نے کیا ہے۔“

”تم کہاں تھیں جواب دو۔“ فیصل غصے سے بولا۔

”تم چلی جاؤ میری نظروں سے دور مجھے تمہیں دیکھ کر خوف آ رہا ہے۔“

”فیصل! میں امی کے گھر چلی جاتی ہوں۔“

”جہاں دل چاہے تم چلی جاؤ میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ میں شازی اور امی کے بارے میں نہ کوئی بات سننا چاہتا ہوں نہ کہنا چاہتا ہوں تمہیں خود خیال رکھنا چاہئے تمہیں معلوم نہیں کہ شازی نفسیاتی مریض

میں اسے سر کو واش کر لیتی لیکن ایسا نہیں ہوا بینش ایسے میرے گچھے کے گچھے بال اترے ہیں کہ واش روم میں بال ہی بال تھے۔ صبح واش روم کی گٹر لائن ابل رہی تھی۔ جب میں نے ماسی سے کہا کہ کیا ہے ماسی کیوں گٹر لائن بار بار ابل رہی ہے۔ تو وہ نظریں جھکا کر بولی بی بی آپ کے بال، جب میں نے نظر ڈالی تو میرے لمبے کالے اور گھنے بال اس کے ہاتھوں میں نظر آ رہے تھے۔

”مت دکھی ہو Pastis Pastis جو گزر گیا سو گزر گیا حریم اب رونا چھوڑو اور اب میری بات مانو میں تمہارے لئے ایک حیرت انگیز اور بہت اچھی چیز لائی ہوں۔“

”نہیں بینش اسے اپنے پاس رکھوامی کہہ رہی ہیں کہ وہ کسی بابا سے پڑھا ہوا پانی لائیں گی تو میرے بال پہلے جیسے ہو جائیں گے۔“

”شکر کرنے جا رہی ہیں تمہاری امی، بابا کے پڑھے ہوئے پانی میں اتنا اثر ہے تو پھر اتنے لوگوں کے خود کیوں غلام بنے رہتے ہیں تمہارے بابا صاحب جائیں اور اپنے پانی کی کرامات سے سب کچھ حاصل کر لیں اللہ کے علاوہ کسی کی حاکمیت کو ماننا شرک ہے اللہ شرک کو پسند نہیں کرتا۔“ بینش رکی تو حریم بولی۔

”تم تو خود اسکارف میں سر چھپائے رہتی ہو میرے لئے کیا کر سکو گی۔“

”تم نے دیکھا کیا ہے۔“ اس نے اپنا اسکارف سر سے اتار دیا لمبے، گھنے بال اس کے کندھوں پر جھول رہے تھے۔

”تم نے اتنے حسین بالوں کو کیوں چھپا کر رکھا ہے۔“ حریم بولی۔

”یہ میرے حسن کا زیور ہے خود نمائی نہیں۔“

”تمہارے شادی سے پہلے تو ایسے بال نہیں

تھے۔“ حریم بولی۔

”میرے شوہر کو بہت زیادہ لمبے بال پسند ہیں تو اس لئے ”لائف بوائے شیمپو“ انہوں نے لا کر دیا۔ میرے ہسپینڈ کے دوست کی وائف ہانیہ کا یہ آزما یا ہوا شیمپو تھا وقت تو لگا مگر محنت رائیگاں نہیں گئی کچھ عرصے کے بعد میں دوبارہ جی اٹھی۔ نئی زندگی مل گئی میرے بالوں کو اور آج میں یہ تمہارے لئے لائی ہوں تم ایک بار استعمال کر کے تو دیکھو اور چند ماہ کے استعمال سے تمہاری دنیا بدل جائے گی اور یہ اسکارف اتر جائے گا۔“

”ہاں میں بھی یہ چاہتی ہوں میری نند شازیہ کی شادی ہونے والی ہے اور چار ماہ بعد وہ لوگ مجھے اپروچ کر رہے کہ شادی میں لازمی شامل ہونا ہے ورنہ لوگ سوال اٹھائیں گے سنا ہے بڑے زوروں کی تیاریاں ہیں بات بھی طے ہو گئی مجھے نہیں بلایا اور سرسری طور پر کہا بھی تو میں نہیں گئی۔ فیصل ابھی تک مجھ سے ناراض ہیں۔ میں خود بھی ان سے ناراض ہوں انہیں حجاب سے سخت چڑ ہے یہ بات میں پہلے سے جانتی تھی۔ یہ بات نہیں کہ میں اسکارف اوڑھنے لگی ہوں۔ اپنی وے جو ہو گا دیکھا جائے گا میں نے تو ایک اسکول جوائن کر لیا ہے مجھے تو کوئی پرابلم نہیں میں اسکارف باندھ کر جاتی ہوں کسی کو میرے بالوں کی خبر نہیں اور اگر ہو بھی جائے تو سوواٹ، حادثات تو زندگی کے ساتھ ہیں لیکن شازیہ نے یہ میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“ وہ دکھی لہجے میں بولی۔

☆.....

”ارے دیکھنا یہ تو فیصل کی بیوی ہے۔ اس نے تو حجاب کرنا شروع کر دیا تھا فل اسکارف میں اسے میں نے آتے جاتے دیکھا ہے آج دیکھو کیسے بال کھولے اتراتی ہوئی گھوم رہی ہے۔ اس کو شروع سے اپنا یہ اسٹائل پسند تھا۔“ حریم کی ساس کی بہن بولیں۔ کسی

ایک تقریب اچانک حریم انہیں نظر آئی تھی۔

ہوئے۔“

”تو کیا ہوا تم نے دیکھا نہیں تھا تمہاری شادی کے دن حریم کیسے وگ لگا کر آئی تھی ہم نے تو کچھ نہیں کہا۔“
”نہیں امی! غلطی ہو گئی اللہ ہمیں معاف نہیں کرے گا ہم فیصل بھائی کو منا لیتے ہیں اور حریم بھابی کو گھر لے آتے ہیں میں خود جاؤں گی ان کو لینے آپ راضی ہیں۔“

”ہاں بیٹا! میں خود نہیں چاہتی فیصل کا گھر برباد ہو وہ بہت اجڑا اجڑا لگتا ہے میں تمہاری وجہ سے خاموش تھی۔ اب جب تم اس گھر سے رخصت ہو گئی ہو تو میں اسے لے آؤں گی۔ فیصل بھی یہی چاہتا ہے۔ ڈیڑھ دو سال کا وقفہ کم نہیں ہوتا۔“

”لیکن امی! مجھے حریم بھابی سے معافی مانگنی ہے تاکہ میرا گھر بس جائے میرے بال بلبکے تھے مگر میں گنجی تو نہیں تھی جو میں وگ لگا کر بیٹھ گئی اور جگ ہنسائی ہوئی۔ امی دانش بھی کہہ رہے تھے کہ کیا ضرورت تھی تمہیں وگ لگانے کی خواہ مخواہ ہم لوگوں کا تماشا بنا۔“ اس نے اپنے بیگ سے وگ نکال کر کچرے میں پھینکی تھی۔

”ارے شازی! اسے اٹھا کر گھر سے باہر پھینک تجا نے کس مردے کے بال ہوں گے وہ بھی کسی گوری میم کے۔“ ثروت بولیں۔

☆.....

”سچ بھائی! میں نے ہی بھابی کے بالوں سے نفرت کی مجھے ان کے بالوں کی خوبصورتی سے نفرت تھی۔ بس میں نے غیر ارادی طور پر ان کے بالوں پر لوشن لگا دیا۔“ شازی بولی۔
”شازی! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔“ فیصل اس کے ہاتھ جھٹک کر کھڑا ہو گیا۔
”تمہیں پتہ ہے کہ تم نے مجھے کتنی اذیت دی۔“

”ارے ہاں سنا تو میں نے بھی ہے کہ ان کا کوئی اختلاف چل رہا ہے میکے میں بیٹھی تھی شادی میں دنیا دکھاوے کے لئے بلایا ہے کہ ہم میں بڑی محبت ہے۔ ہر ایک سے کہتیں ہیں کہ حریم کی ماں بیمار ہے اس لئے وہ وہاں رہ رہی تھی حالانکہ سب جانتے ہیں کہ شازی سے اس کی بنتی ہی نہیں ہے۔“ دوسری صاحبہ بولیں۔
”سنا تو میں نے یہ بھی تھا کہ فیصل کی دوسری شادی کا سوچ رہے ہیں یہ لوگ مگر وہ تو فیصل ہی نہیں مانا کہ نہیں شازی کی شادی کے بعد سوچوں گا۔“

”اچھا سنا تو میں نے بھی تھا۔“ کوئی دوسری صاحبہ پٹ سے بول پڑیں اور پھر خود ہی ”استغفر اللہ استغفر اللہ“ کہہ کر بولیں۔

”ہم غیبت کر رہے ہیں۔“ اور جلدی سے انہوں نے اپنے اسکارف کو درست کیا تھا۔

☆.....

وقت کی رفتار کو کون روک سکا ہے وقت گزرتا رہا سال ڈیڑھ سال کے بعد شازی کی بڑے دھوم دھام سے شادی ہونے والی تھی۔ شازی جب بیوٹی پارلر تیار ہونے لگی تو اس نے باہر سے آئی ہوئی وگ اور سوچ لگولیا۔ جب دلہن بن کر وہ سب کے سامنے آئی تو سب نے کہا۔

”شازی یہ کتنی اچھی لگ رہی ہے۔“ دلہن بن کر وہ جب رخصت ہو کر اپنے سسرال پہنچی۔ دوسرے دن جب وہ شاور لے کر باہر آئی تو دوسری عورتوں کا ہنس ہنس کر برا حال تھا مگر اس کی ساس نندوں کا چہرہ اتر گیا۔
”ہمارے ساتھ دھوکا ہوا دلہن گنجی تھی وگ لگا کر ہمیں دھوکا دیا گیا۔“ تب شازی کو حریم پر کئے جانے والے ظلم کا اندازہ ہوا وہ روتے ہوئے ماں سے بولی۔
”امی! ہم نے بڑا ظلم کیا ہے حریم بھابی پر، اللہ میاں نے اسی لئے ہمیں سزا دی کہ ہم رسوا اور ذلیل

”آئی نوبھائی مجھے معاف کر دیں۔“

”تم نے تو مجھ سے کہا تھا کہ حریم خود ڈرامہ کر رہی ہے صرف تمہیں تنگ کرنے کے لئے۔“

”معاف کر دیں بھائی! میں اپنی فطرت سے مجبور تھی جو ایسا کر گئی۔“

”مجھے کچھ نہیں معلوم۔ فیصل غصے سے باہر نکل گیا تھا۔ نہیں امی! کچھ بھی ہو جائے میں حریم بھابی کو ویسے کے دن لے کر آؤں گی۔“ شازی یہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔

”تم خود جاؤ اور اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے اسے لے آؤ تاکہ تمہارے لئے آسانیاں ہوں، سمجھیں، تم نے بسا بسایا گھر اپنے بھائی کا برباد کیا ہے۔“ وہ جھنجھلا کر اٹھ گئیں۔

شازی نے حریم کے گھر جا کر اپنے گناہوں کا اعتراف کیا تھا معافی مانگی تھی اور اسے ویسے کے لئے راضی کر لیا تھا حریم ویسے کے دن بہت جاذب نظر اور پرکشش نظر آ رہی تھی ہاں اتنے لمبے بال تو نہ تھے مگر بہت گھنے، چمکدار سلکی شو لڈر کٹ اس پر بہت سوٹ کر رہے تھے فیصل کی نظر بار بار اس کے بالوں پر جا رہی تھی۔ اس نے لمبی پنک اور پریل کنٹراس فرائگ پہنی ہوئی تھی۔ سردیوں کے دن تھے اس نے بہت خوبصورت سی فیروز کی کلر کی شال اپنے کندھوں پر لی ہوئی تھی۔ وہ گھر واپس جانے کے لئے اپنی ماں کے پاس آئی تھی۔ فیصل سارے مہمانوں کو چھوڑ کر بہت تیزی سے حریم کی طرف آیا تھا۔ گاڑی کی طرف بڑھتی ہوئی حریم کا ہاتھ اس نے تھام لیا۔

”پلیز حریم! ان سب باتوں میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ ایک غلط فہمی تھی جو کہ شازی نے ہمارے درمیان پھیلا دی تھی کہ تم نے خود کیوں حفاظت نہیں کی اپنے بالوں کی اور بقول شازی کے کہ یہ بھابی کی چال

ہے کہ میں اس سے منحرف ہو جاؤں اسے میری کمزوری پتہ تھی تمہارے بال۔“ اس نے اس کے بال پیار سے چھوئے کہ کہیں اس کی وگ نہ اتر جائے۔

”چلو گھر چلو اب وہاں شازی نہیں ہے وہ دیکھو امی آ رہی ہیں وہ بھی تمہاری منتظر ہیں جو بھی ہے جس حال میں بھی ہو تم مجھے پسند ہو۔“ اس نے مسکرائی ہوئی نظر اس کے بالوں پر ڈالی۔

”بس مجھے اس کا رُف پسند نہیں ہے۔ یہ تو کیا میں تمہیں اور دو چار وگ لا کر دوں گا امریکہ سے۔“

”واٹ..... کیا وگ لا کر دیں گے اللہ نہ کرے کے میں کسی کے بال اپنے سر پر لگاؤں۔ اللہ کے بعد“ لائف بوائے شیمپو“ نے میرے بالوں کو نئی زندگی دے دی۔“

”ریٹلی.....“ فیصل حیرت سے اس کے بالوں کو چھو رہا تھا۔

”آئی کانٹ بلیواٹ، میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ شازی کی طرح تم نے بھی وگ لگائی ہے۔“ فیصل حیرانگی اور پسندیدگی سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

”بہت کمزور انسان ہو تم ہمیشہ غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہو۔“ حریم بولی۔

”میری کمزوری تم جانتی ہو۔“

”جانتی ہوں ناں اسی لئے یہ بال میں نے آپ کے لئے پہلے سے حسین کئے ہیں۔“ حریم نے کھلکھلا کر کہا۔ فیصل نے جلدی سے اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا تھا پلٹ کر وہ حریم کے دروازے کی طرف آیا اور بہت مسکرا کر سر جھکا کر بولا۔

”میم پلیز۔ تشریف رکھئے۔“ اور حریم بہت کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ دسمبر کا سورج اس پار ڈوب گیا تھا اور روشن روشن پہلی جنوری کا سورج نکل آیا تھا۔

☆.....

نیلی آنکھوں والی گڑیا

آنکھیں بند کیس چہم سے نیلی آنکھوں والی گڑیا سامنے آگئی۔ پورے خاندان میں کسی کی ایسی کانچ سی نیلی آنکھیں نہیں تھیں۔ اس کی پیدائش پر شمس العارفین کو ڈر تھا کہ جانے یہ دیکھ بھی سکے گی یا نہیں۔ واہمہ خدشہ وقت کے ساتھ ختم ہوئے تو وہ بھی پرسکون ہو گئے۔ ہر کلاس میں اول پوزیشن لینے والی حفظہ سحر کا نام کسی کو یاد ہی نہ تھا۔ اسکول، ٹیوشن، مدرسے، سکھیاں غرض ہر کوئی بس نیلی آنکھوں والی گڑیا ہی کہتا۔

ہر کوئی اسے ہاتھوں ہاتھ لیتا، ان کی گڑیا کی گردن فخر سے تنی رہتی۔

پھر یوں ہوا کہ انہیں لگا کہ ان کی گڑیا بڑی ہونے لگی ہے جسے پہلے اس کی ماں سجاتی تھیں اب وہ خود سے سخن لگی ہے۔ نیلی آنکھوں میں جب وہ بھر بھر کے کاجل ڈالتی تو نظر لگ جانے کی حد تک پیاری لگتی۔ وہ اس سے نظر لگ جانے کے ڈر سے نظر چرائیتے۔ عائرہ سحر، حفظہ سحر اور فائرہ سحر ان کی تینوں بیٹیاں ان کے کاندھے سے ذرا نیچے آئیں تو چاروں طرف سے رشتے آنے لگے۔ عائرہ سحر کی انہوں نے اپنے بھانجے سے بات طے کر دی۔ فائرہ سحر کو اس کی ماں نے اپنے بھتیجے کے ساتھ منسوب کیا لیکن نیلی آنکھوں والی گڑیا کسی رشتے پر بھی راضی نہ تھی۔ وہ کہتی تھی کہ ”مجھے پڑھنا ہے، بہت آگے پڑھنا ہے۔“ پڑھنے کا بھوت (اس کی ماں کے بقول) سوار ہے۔ عارفین صاحب! اسے اتنی ڈھیل نہ دیجیے لڑکی ذات ہے۔

شام کا وقت تھا۔ پرندے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ شمس العارفین کے نام کی سختی والے پرانے طرز پر بنے بڑے سے گھر کے پچھلے صحن میں رونق لگی تھی۔ ہفتے کے دن ان کی دونوں بہوئیں ارسہ، فرو اور دو بیٹیاں عائرہ سحر، فائرہ سحر اپنے بچوں کے ساتھ جمع ہوتیں۔ شمس العارفین صاحب تخت پر بیٹھے اپنے نواسوں، پوتیوں کی معصوم حرکتوں سے لطف اندوز ہوتے۔ ایک طرف بیٹیاں، بہوئیں سر جوڑے بیٹھی گفتگو کر رہی ہوتیں۔ دوسری طرف ان کی نواسیاں، پوتیاں عیشہ، عقیقہ، عمیرہ ہر اس مندر کھیل رہی تھیں اور علی، سبحان، عرفان کرکٹ کھیلنے کی کوشش میں لگے تھے۔ دیکھنے والے کو یہ منظر مکمل لگتا لیکن انہیں کچھ کمی لگی۔ بلکہ ادھورا لگا کہ اس منظر میں ان کی نیلی آنکھوں والی گڑیا نہیں تھی اور اس کے نیلی آنکھوں والے بچے اس منظر کا حصہ نہیں تھے۔ نہ جانے کیوں ان کا دل اچاٹ ہونے لگا۔ انہوں نے اپنی تسبیح کے لیے ادھر ادھر ہاتھ مارا۔

تسبیح ملی تو سر پر ٹوپی جمائی۔ اپنی اسٹک کے سہارے کھڑے ہوئے تو سامنے تخت پر بیٹھی ان کی شریک حیات نے آنکھ کے اشارے پر پوچھا۔ ”کہاں چلے۔“ انہوں نے اپنے کمرے کی طرف اشارہ کیا تو وہ اثبات میں سر ہلانی اپنی تسبیح کے دانے گرانے لگیں۔

اسٹک سائیڈ پر لگا کر اپنے بیڈ پر نیم دراز ہو گئے۔



ہماری باتوں کو کانوں پر مار دیتی ہے۔ آخر اس سے بڑی اور چھوٹی نے بھی تو سر جھکا دیا۔ ماں باپ کی رضا کے آگے۔“

”باباجان!“ وہ ٹھنکی۔

”ارے رہنے دیجیے بیگم! یہ پڑھنا اس کے باپ کی ہی رضا ہے۔ میری گڑیا کے جوڑ کا جب شہزادہ آئے گا تو یہ بھی سر جھکا دے گی۔“

انہوں نے کہنے کے ساتھ ہی اپنی دوائی کا ڈھلکنا خوب کسا کہ ان کا ڈیڑھ سالہ پوتا سبحان کوٹنے کوٹنے میں گھس کر ہر چیز کو منہ میں رکھ لیتا۔

”اے لو بھلا کیا پرستان سے آئے گا شہزادہ، اپنا عاقب ہے تو اس کے جوڑ کا۔“ انہوں نے نفاست کے ساتھ پان لگا کر شوہر کے آگے رکھا۔

”ارے بیگم! جلدی کیا ہے ہمارے گھر کی رونق ہے اور ابھی تعلیم تو مکمل کرنے دیں اسے۔“

پھر ایک دن نیلی آنکھوں والی گڑیا کے لیے نیلی آنکھوں والا شہزادہ پرستان سے تو نہیں لیکن یو کے سے آ گیا۔ شمس العارفین کے بچپن کے دوست، اسکول کالج کی تعلیم ساتھ حاصل کیے ہوئے محبوب ارشاد فاروقی اپنے صاحب زادے حشام فاروقی کے ساتھ اچانک ہی آگئے لیکن ان کے آنے سے جو طوفان اٹھا اس کے اثرات آج تک 6 سال گزر جانے کے بعد بھی موجود ہیں۔ محبوب فاروقی نے اپنے نیلی آنکھوں والے بیٹے حشام فاروقی کا رشتہ نیلی آنکھوں والی گڑیا حفظہ سحر کے لیے مانگ لیا۔ جسے انہوں نے حفظہ کی رائے سے طے کر دیا۔ اس کے بعد ایک طوفان تھا۔ جو نیلی آنکھوں والی گڑیا کی ماں نے اٹھایا۔ اسی اٹھائے گئے طوفان کے سبب آج نیلی آنکھوں والی گڑیا سب کے درمیان موجود نہ تھی۔

ہو ایوں کہ حفظہ سحر نے عاقب کے رشتے کو ٹھکرا کر نیلی آنکھوں والے حشام فاروقی کے لیے ہاں کر دی۔

”نانا ابو! چائے لے لیجئے۔“ میری نوا سی عیثہ

READING
Section

چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔

”ارے۔“ مجھے ماضی کی یادوں سے نکال کہ حال میں لے آئی۔ اس کے انداز بالکل میری نیلی آنکھوں والی گڑیا کے جیسے ہوتے۔

”نانا ابو! سنیکس۔“ اس کے پیچھے ہی دوسری نواسی عقیقہ میرا حصہ ٹرے میں لے آئی۔ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے سرو کرنے لگی۔ چائے اور اسنیکس سے فارغ ہوا تو ماضی کی یادیں پھر سے ٹٹمانے لگیں۔

”آہ..... یاد ماضی جلتا بجھتا چراغ ہے شاید۔“

بڑے دھوم دھام سے نیلی آنکھوں والی گڑیا حفظ سحر، نیلی آنکھوں والے شہزادے حشام فاروقی کے ساتھ رخصت ہوئی لیکن اس کی ماں کے دل میں گرہ لگ گئی۔ وہ جب جب یہاں آتی اس کی ماں ادھر ادھر کے کاموں میں لگ جاتی۔ عازرہ سحر اور فائزہ سحر کی طرح توجہ نہ دیتی۔ اس نے ماں کے گھر آنا بہت کم کر دیا۔ پھر ایک دن وہ سمس العارفین کے پاس آئی بہت اداس اس کی نیلی آنکھوں کے دیئے جیسے بجھے ہوئے تھے۔ وہ ان کی پانکتی میں بیٹھ گئی اور ان کے ہاتھ تھام کے بولی۔

”بابا! میرا جرم اتنا تو بڑا نہیں جس کی سزا مجھے اتنی بڑی مل رہی ہے۔“ اس کے آنسو ضبط کرتے کرتے بھی نکل آئے۔ جو اس نے اپنی آستین سے رگڑ ڈالے۔ پھر خود کو مضبوط کرتے ہوئے گویا ہوئی۔

”بابا! میرا ویزا آ گیا ہے۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجیے گا اور امی سے کہیے گا کہ کبھی اپنی اس نادان بیٹی کو معاف ضرور کریں۔“ چند ثانیے کے لیے جیسے سناٹا چھایا اس نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبالیے۔ پھر ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔

”اگر امی مجھے اس وقت منع کرتیں تو کیا میں ضد کرتی بابا؟ آپ نے دو آپشنز دیئے میں نے ایک سلیکٹ کر لیا تو کیا یہ گناہ ہے بابا؟“ ایک بار پھر اس

نے اپنے آنسو پونچھے۔

”حشام بہت اچھے ہیں بابا! شاید یہ آپ کی دعا ہے وہ اتنے اچھے ہیں کہ مجھے فخر ہوتا ہے لیکن میرا دل صرف امی کی وجہ سے بے چین رہتا ہے۔ امی کو میرا آنا ناگوار گزرتا ہے۔ کل کو میرے بچوں کا اس سے بھی زیادہ ناگوار گزرے گا۔ بابا میں یہ ملک ہی چھوڑ کر جا رہی ہوں۔“ اب وہ ان کے ہاتھوں پر سر رکھے رو رہی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے اس کا سر تھپتھا رہے تھے کہ تسلی کے دو بول بھی ان کے پاس نہ تھے۔ وہ اپنی ہمسفر کی ضد سے واقف تھے۔

پھر وہ چلی گئی انگلینڈ۔ نیلی آنکھوں والوں کے گہرے سمندر میں، جہاں زیادہ لوگ نیلی آنکھوں والے ہی تھے۔ اُسے کال کرتے، اس کی ماں بھی کبھی کبھی اس سے بات کر لیتیں۔ پھر اس کا پیارا سا بیٹا ہوا جس کا نام اس نے آن سے رکھوا دیا۔ ابو ہریرہ..... وہ بھی نیلی آنکھوں والا گڈا تھا۔ کچھ عرصہ بعد نیلی آنکھوں والی گڑیا کے ہاں پیاری سی نیلی آنکھوں والی شہزادی ہوئی۔ اس کا نام انہوں نے ام کلثوم رکھا۔

وہ ویب پر اس سے بات کرتے لیکن اسے چھونے کو پیار کرنے کو اسے محسوس کرنے کو دل ترستار ہتا اور آج سب کے درمیان بیٹھے وہ اس کی کمی محسوس کر رہے تھے۔

انہیں ہر لمحہ اس کی شکوہ کرتی آنکھیں یاد آتیں جیسے ان سے سوال کر رہی ہوں۔

”بابا کیا میرا دل نہیں چاہتا سب کے ساتھ مل کر بیٹھنے کو۔ بابا کیا میرے بچے اسی طرح اکیلے پل کہ جوان ہو جائیں گے۔ بابا کیا جرم اتنا بڑا ہے میرا؟ انہیں لگا کہ زندگی غموں اور دکھوں کا ایک لامحدود سمندر ہے جس کی گہرائی کبھی ختم نہ ہوگی۔

.....☆.....

دے رہے تھے کہ ایک روڈ ایکسڈنٹ میں اپنی دونوں ٹانگیں گنوا بیٹھے۔

چار بیٹیوں اور ایک اکلوتے بیٹے کی ذمہ داری ان کے ناتواں کندھوں پر آن پڑی تھی۔ شاہ زیب، بیٹا اور بیٹا سے چھوٹے تھے اور پھر دو چھوٹی بہنیں دانیہ اور رافیہ تھیں۔ گھر میں قیامت کا سماں تھا۔ سمعیہ سے چھپ چھپ سرد صاحب روتے تھے۔ شاہ زیب چونکہ ان دونوں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس لیے سرد اور سمعیہ کو اس سے بہت امیدیں تھیں۔ شاہ زیب کے حوالے سے انہوں نے بہت سے خواب دیکھ رکھے

”امی! میں ابو کی دوائیاں لے آیا ہوں۔“ شاہ زیب نے دواؤں کا سا پر سمعیہ کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

”جیتے رہو بیٹا! جگ جگ جیو کتنی ذمہ داریاں اٹھالی ہیں تم نے اپنے کندھوں پر۔“ سمعیہ آبدیدہ سی ہوئیں۔

”امی! کیا میں آپ کا نہیں کسی اور کا بیٹا ہوں۔“ شاہ زیب نے سمعیہ کو دونوں کندھوں سے تھام کر پوچھا۔

”پاگل میرا یہ مطلب تھوڑا ہی تھا۔“ سمعیہ مسکرا دیں۔

”میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ تمہارے ابا کے حادثے کے بعد جس طرح تم نے اس گھر کو سنبھالا ہے وہ واقعی قابل تحسین ہے۔“ سمعیہ نے سرد آہ بھری۔

سوروزیبہ کا حجاب

افسانہ

قرۃ العین سکندر

تھے مگر تقدیر کی ستم ظریفی کے سارے خواب ادھورے رہ گئے۔ شاہ زیب کو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر جاب کی تلاش میں نکلنا پڑا۔ بیٹا اور بیٹا کے رشتے طے تھے اور شادی کی تاریخ بھی طے ہو چکی تھی کہ یہ دردناک سانحہ پیش آ گیا۔ سمعیہ نے شادی التواء میں کرنا چاہی مگر شاہ زیب نے منع کر دیا۔

شاہ زیب کا کہنا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ انتظام کر لے گا اور شادی عین وقت پر ہی ہوگی۔ شاہ زیب کو جلد ہی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ایک اچھی جاب مل گئی۔ یوں زندگی کی گاڑی چلنے لگی۔ بیٹا اور بیٹا کی شادی بہت سادگی سے عین وقت پر ہوئی۔ شاہ زیب جانتا تھا کہ اگر اس شادی میں تاخیر کی گئی تو اس کے والد کا دل سخت دکھے گا اور وہ اپنے ابو سے بے انتہا محبت کرنا

”امی! یہ تو کچھ بھی نہیں ہے، میں چاہتا ہوں ہمارے گھر کے حالات بدل جائیں۔“ شاہ زیب نے خلا میں تکتے ہوئے پرسوج لہجے میں کہا۔

”کیوں نہیں بیٹا! جلد ہی ہمارے گھر کے حالات اچھے ہو جائیں گے۔ ہمارے بھی اچھے دن لوٹ آئیں گے۔“ سمعیہ نے اسے تسلی دی۔

”ان باتوں کو چھوڑیں آج کھانے میں کیا بنایا ہے، زوروں کی بھوک لگی ہے۔“ شاہ زیب نے بات کا رخ بدل دیا۔

”میں صدقے جاؤں پہلے کیوں نہ بتایا تم نے، تم ہاتھ منہ دھولو میں کھانا لگانی ہوں۔“ سمعیہ فوراً کچن کی جانب چل دیں۔

سرد ایک محکمے میں کلرک کے فرائض سرانجام

READING
Section



طرح ساری عمر اپنی خواہشوں کا گلا نہیں گھونٹے گا اور ایک پر آسائش زندگی بسر کرے گا۔ ایک دن جب شاہ زیب وانیہ کو کالج پک کرنے گیا تو اس نے دیکھا کہ حنا بے حد پریشانی کے عالم میں اسٹاپ پر کھڑی ہے۔
 ”کیا بات ہے وانیہ! تمہاری دوست کیوں پریشان ہے؟“ وانیہ کے پاس آتے ہی شاہ زیب نے پوچھا۔

”اس کے گھر سے آج گاڑی نہیں آئی ہے اور وہ گھر بتانا بھول گئی تھی کہ آج صرف پریکٹیکل ہوتا ہے اور یوں وہ جلد ہی فری ہوگئی۔“
 ”اوہ.....“ شاہ زیب نے ہونٹ سکیڑے۔

”تم کیسی دوست ہو تمہاری دوست اس قدر پریشان ہے اور تمہیں گھر چلنے کی جلدی ہے۔ ایسا کرو اسے کہو کہ وہ بھی آج ہمارے ساتھ چلے میں اس کو لے کر اس کے گھر ڈراپ کر دوں گا۔“

وانیہ کا شاہ زیب کی بات پر منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ کیوں کہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ جب بھی اس نے سرسری سا بھی حنا کا ذکر کرنا چاہا تو بھائی نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا تھا مگر آج تو کایا ہی پلٹ گئی تھی۔
 ”اب ٹکر ٹکر دیکھ کیا رہی ہو مجھے، جاؤ بھی۔“ شاہ زیب نے اسے گھورتے ہوئے کہا وہ تجھل سا ہو گیا تھا۔

وانیہ کو اور کیا چاہیے تھا۔ وہ بے حد خوش تھی۔ اسی بہانے وہ حنا کا عالی شان گھر بھی دیکھ لیتی جو اس نے فقط تصاویر میں ہی دیکھ رکھا تھا۔ وانیہ نے حنا کے پاس جا کر اسے ساری بات بتائی۔ تو حنا نے پلٹ کر شاہ زیب کی جانب دیکھا۔ وہ اسے ہی گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ حنا بری طرح زورس ہو گئی تھی۔ دل اٹھل پھل کر رہا تھا۔ وہ جھکتی ہوئی وانیہ کے ساتھ چلی آئی۔ وانیہ کے پیچھے حنا بھی بیٹھ گئی بائیک پر اور شاہ زیب بتائے ہوئے ایڈریس کی جانب موٹر سائیکل دوڑانے لگا۔

حنا کے گھر میں اس کی ماما اور آپا (پالنے والی آنٹی)

تھا۔ وہ بچپن سے ہی دیکھتا رہا تھا کہ کس قدر محبت سے اس کے والد نے سب بچوں کو تعلیم دلوائی تھی اور حسب استطاعت ہر ضرورت پوری کرنے کی سعی کی تھی۔

شاہ زیب بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلنا چاہتا تھا مگر جب سے اس نے جاب اشارٹ کی تھی اس کی سوچ کا رخ اور زاویہ دونوں ہی بدل چکے تھے۔ اس زمانے میں فقط اسی انسان کی عزت تھی جس کی جیب میں روپیہ تھا اور شاہ زیب کو اب بہت جلد بہت سارا روپیہ کمانا تھا۔ اپنی دو چھوٹی بہنوں کی شادی کے لیے اور اپنے بوڑھے والدین کے سکھ کے لیے۔

☆.....☆

جب غربت اور افلاس اپنی آخری حدوں کو پہنچ جاتی ہے تو انسان اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے ہر حد پار کرنے کا سوچ لیتا ہے۔ اس وقت انسان سے بڑھ کر کوئی درندہ نہیں ہوتا۔ ایسا ہی شاہ زیب کے ساتھ بھی تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اپنی غربت و افلاس کو امیری میں تبدیل کر کے رہے گا۔ خواہ اس کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار کرنا پڑے۔ شاید قدرت کو بھی اس کی آزمائش مقصود تھی۔ اس لیے جلد ہی اس کو ایسا موقع تقدیر نے مہیا کر دیا۔

حنا اس کی بہن کی کلاس فیلو تھی۔
 وانیہ، شاہ زیب کی چھوٹی بہن تھی اور حنا اور وانیہ دونوں کلاس فیلو تھیں اور گہری دوست بھی تھیں۔

شاہ زیب جب بھی وانیہ کو کالج پک کرنے جایا کرتا تھا تو وہ حنا کی آنکھوں میں چھپی اپنے لیے محبت کی تپش کو محسوس کر چکا تھا۔ حنا ایک امیر خاندان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ کیونکہ وہ اپنی لینڈ کروزر میں جایا کرتی تھی اور آخری وقت تک شاہ زیب کو کن اکھیوں سے دیکھا کرتی تھی۔

شاہ زیب فطرتاً برا انسان نہ تھا مگر حالات کے تقاضوں کے تحت اس نے طے کر لیا تھا کہ اپنے گھر کے حالات وہ تبدیل کر کے رہے گا۔ اپنے والد کی

کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ وہ دونوں پر تپاک انداز میں شاہ زیب اور وانیہ سے ملیں۔

اس قدر کشادہ اور وسیع العریض بنگلہ تھا کہ شاہ زیب کھوسا گیا۔ وانیہ اگر واپسی سفر میں خوش تھی کہ اپنی عزیز از جان دوست کے گھر گئی تو شاہ زیب اس سے بھی زیادہ خوش تھا اس کو جیسی منزل کی تلاش تھی وہ صرف حنا کی صورت میں ہی اس کو مل سکتی تھی۔

☆.....☆

”شاہ زیب بیٹا! آج آفس سے جلدی گھر آ جانا۔“ سمعیہ نے شاہ زیب کو ناشتے کی ٹرے پکڑاتے ہوئے کہا۔

”وہ کیوں امی جان؟“ شاہ زیب نے تھنویں اچکا کر قدرے حیرت سے پوچھا۔

”آج تمہاری چچی فریدہ آرہی ہیں۔ میں بھی سوچتی ہوں کہ وانیہ کے ساتھ ساتھ تمہاری خوشی بھی دیکھ لوں۔ پھر آخر کب تک علیہ تمہارے نام پر بیٹھی رہے گی۔ ویسے بھی بیٹا یہی مناسب عمر ہے علیہ کی شادی اب ہو جانی چاہیے۔ اپنی چھوٹی بیٹی کے رشتے کے انتظار میں بیٹی کی عمر گزر جائے میں ہرگز اس بات کے حق میں نہیں ہوں۔“

سمعیہ نے دو ٹوک انداز میں کہا تو شاہ زیب کا موڈ سخت آف ہو گیا تھا۔ وہ دل میں کیا ٹھان چکا تھا اور امی اپنے الگ ہی راگ الاپ رہی تھیں۔

”امی! آپ انہیں منع کر دیں، فی الحال آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور جب میں مناسب سمجھوں گا انہیں خود ہی انفارم کر دوں گا۔ آپ اس سارے معاملے سے دور رہیں اور خاموش رہیں۔“ شاہ زیب نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں خاموش رہوں؟ مگر کیوں؟ اور میں ماں ہوں تمہاری اگر میں تمہارے لیے نہیں سوچوں گی تو اور پھر کون سوچے گا؟“ سمعیہ نے سخت ناگواری سے تیز لہجے میں جتاتے ہوئے کہا۔

”امی! پیاری امی آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں۔ اچھا ٹھیک ہے آپ انہیں ابھی فون کر کے بتادیں کہ وہ جہاں چاہیں علیہ کی شادی کر دیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور میری طرف سے اس رشتے کے لیے صاف منع کر دیں۔ منگنی ہی تو تھی کوئی نکاح تو نہیں تھا اور پھر آج کے دور میں تو شادیاں ٹوٹ جایا کرتی ہیں۔ میری منزل علیہ نہیں کوئی اور ہے۔“

شاہ زیب کا لہجہ چٹان کی طرح مضبوط اور ارادہ پختہ تھا۔ سمعیہ تو دہل کر ہی رہ گئیں۔

”شاہ زیب! آج تو تم نے یہ بات کہہ دی مگر دوبارہ مت کرنا۔ علیہ تمہارے مرحوم چچا کی نشانی ہے ان کی آرزو تھی کہ علیہ کی شادی تم سے ہو اور تمہارے ابا ان کے دل پر کیا گزرے گی یہ سب جان کر۔“ سمعیہ سخت پریشان ہو گئیں۔

☆.....☆

”امی! جو زندہ ہیں پہلے ان کا حق ہے کہ ان کے لیے سوچا جائے، جو جا چکے ہیں وہ دوبارہ پلٹ کر تو نہیں آجائیں گے اور ابا کی آپ فکر مت کریں۔ میں ان کو خود ہی سمجھا دوں گا لیکن میں آپ کو آخری بار بتا رہا ہوں کہ میں علیہ سے ہرگز شادی نہیں کروں گا۔“

شاہ زیب نے جلد ہی حنا کو اپنی محبت کے جال میں بری طرح پھنسا لیا تھا۔ وہ تسخیر محبت تھی۔ شاہ زیب کی باتوں میں اسے سچائی اور محبت کی چاشنی گھلی ملتی تھی۔ درحقیقت وہ پیار کی متلاشی لڑکی تھی۔ اس کے پاپا ایک ٹیکسٹائل مل کے اوزر تھے۔ ان کے پاس اپنی اگلوٹی بیٹی کے لیے روپے کی ریل پیل تو تھی مگر چاہت کے چند لمحے نہ تھے۔ اس کی ماما بھی سوشل ورکر تھیں۔ ان کے آئے دن کی میٹنگز نے ان کو اس

اپنے بیٹے کی خوشی کو خوشی سمجھ کر خاموش ضرور ہو گئے تھے۔
سرمہ صاحب کی ایسی حالت نہ تھی کہ وہ اپنے
ظاہری اکلوتے سہارے سے لاتعلقی ظاہر کرتے
مصلحت کا یہی تقاضا تھا۔

سمعیہ نے اگرچہ شاہ زیب کو سمجھانے کی حتی الوسع
کوشش کی تھی۔

”ایسا گھر مت بناؤ، جس کی بنیاد کسی اور کی آہوں
اور سسکیوں پر رکھی گئی ہو۔ جس گھر کی ہر اینٹ کسی کی
بددعاؤں کا شاخسانہ ہو۔ ایسے گھر بستے نہیں ہیں جن
میں دعائیں بددعائیں شامل ہوں۔“ علیہ نے اس
کے نام پر کئی سال گزار دئے تھے مگر روپے کی خوشبو شاہ
زیب کو اپنی طرف کھینچتی چلی جا رہی تھی اور وہ بناؤ اور
کے بندھا چلا جا رہا تھا۔

اور معصوم سی حنا شاہ زیب کے بڑھتے ہوئے
قدموں کو اس کی محبت کی ابتداء ہی سمجھتی رہی۔ حنا نے
دانیہ کی شادی کے لیے خطیر رقم اپنے والد سے لے کر دی
جو شاہ زیب نے کسی پس و پیش کے بنا قبول کر لی۔

حنا کے والد نے اپنی سوشل ویلیو کو برقرار رکھنے کی
خاطر شاہ زیب کو اپنی مل میں باقاعدہ شیزرز دے
دئے۔ شاہ زیب دن رات کام میں مگن رہتا تھا۔
اولین دنوں کے بعد اس کے پاس حنا کے لیے وقت
کی کمی آگئی تھی۔

حنا سرشام شاہ زیب کا انتظار کیا کرتی تھی اور شاہ
زیب رات گئے کام سے لوٹتا تھا اور اس قدر تھکا ہوا
ہوتا کہ اس کا بات کرنے کا بالکل دل نہ کرتا تھا اور
آتے ہی سو جایا کرتا تھا۔ حنا آج بھی اسی مقام پر
کھڑی تھی جہاں وہ کل کھڑی تھی۔

☆.....☆

وقت کا کام ہے گزرتا اور یوں تین سال کا عرصہ
بیت گیا۔ رافعیہ کے فرض سے بھی شاہ زیب بری
الذمہ ہو چکا تھا۔ اس کے والد کو علاج معالجے کے
لیے بیرون ملک بھی بھیجا گیا جس کی وجہ سے اب سرمہ

قدر مصروف کر رکھا تھا کہ حنا کے لیے ان کے پاس
نام کی اشد کمی تھی۔ حنا نے آنی کو ہی اپنا سب کچھ سمجھا
تھا۔ آنی کی آغوش میں ہی وہ پل کر جوان ہوئی تھی۔
ایک نامعلوم حسرت ایک پیاس تھی لازوال محبت کی
جو بجھتی ہی نہ تھی۔ اس کی شدت سے آرزو تھی کہ کوئی
اسے چاہے مگر اس مرحلے سے ہی پہلے وہ کسی کی محبت
کی اسیر ہو چکی تھی اور جو اسیر محبت ہوں پھر انہیں نہ تو
کچھ دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی کچھ سنائی دیتا ہے۔ وہ فقط
محبوب کے کانوں سے سننے اور دیکھنے کے عادی ہو
جاتے ہیں۔ پھر محبوب کی ہر خامی خوبی میں بدلتے دیر
نہیں لگتی۔ وہ شاہ زیب کی محبت پر آنکھیں بند کر کے
ایمان لے آئی تھی۔ وہ محبت میں اس قدر آگے نکل آئی
تھی کہ واپسی کا کوئی راستہ نہ رہا تھا۔ بالآخر حنا نے اپنی
ساری کشتیاں جلانے کا فیصلہ کر ڈالا۔ پاپا اور ماما کو اس
کے فیصلے کی خبر ہوئی تو وہ دونوں سخت خفا ہوئے۔ ماما
نے حنا کو پیار محبت سے ہر طرح سے سمجھانے کی سعی
کی مگر بے سود رہا۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ زیست کی
کھن راہوں میں آبلہ پائی کا سفر طے کرتے کرتے
بالآخر حنا نے محبت کے شبنمی پھول پال لیے تھے۔ اب حنا
کسی قیمت پر اس محبت کی خوشبو کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔
اس کی اٹوٹ محبت کے سامنے حنا کے والدین کو ہار
ماننا پڑی اور جیت ہوئی حنا کی محبت کی مگر یہ تو تقدیر ہی
بہتر جانتی تھی کہ جیت کا سہرہ کس کے سر گیا تھا اور مات
کس کا مقدر ٹھہری تھی۔ نہایت دھوم دھام سے حنا کی
شادی شاہ زیب سے کر دی گئی۔

حنا کو تحفے میں اس کے والد نے بنگلہ دیا تھا۔
شادی کے وقت لڑکی سسرال جاتی ہے مگر یہاں الٹ
معاملہ تھا۔ شاہ زیب اپنے والدین اور چھوٹی بہن
رافعہ کے ساتھ رخصت ہو کر حنا کے عالی شان بنگلے میں
منتقل ہو گیا تھا جس دن شاہ زیب کا ولیمہ تھا اس دن
دانیہ کی بارات تھی۔

سرمہ صاحب اور سمعیہ دلی طور پر راضی نہ تھے مگر وہ

صاحب بستر تک محدود نہ رہے تھے بلکہ لائچی کے سہارے سے کچھ دور تک چل بھی لیا کرتے تھے۔
علینہ کی عمر گزر جانے اور مفلسی کی وجہ سے دو بچوں کے باپ سے شادی کر دی گئی۔ وہ رونی ہوئی بیاہ کر چلی گئی۔ یوں یہ قصہ بھی اختتام پذیر ہوا۔

تین سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی حنا کی گود ہنوز سونی تھی۔ حنا نے شادی کے کچھ عرصہ کے بعد ہی جان لیا تھا کہ اس نے خسارے کا سودا کیا ہے۔ وہ ابھی تک تپتے صحرا کی باسی تھی تشنہ لب اور تشنہ روح۔ اس کے مقدر میں نشنگی ہمیشہ کے لیے رقم کر دی گئی تھی۔ شاہ زیب کی خوب صورتی اور وجاہت پر مر مٹنے اور اسے پالنے کے باوجود بھی دونوں کے درمیان صدیوں کا فاصلہ حائل تھا۔ شاہ زیب نے اپنے ارد گرد ایک ایسا حصار قائم کر رکھا تھا جسے عبور کرنا حنا کے اختیار میں نہ تھا۔ شاہ زیب کا دولت مند ہو جانے کا خواب پورا ہو چکا تھا۔ مگر محبت کا خانہ ہنوز خالی تھا۔ حنا کو اپنا لینے کے باوجود وہ حنا سے محبت نہ کر سکا۔

پھر ایک دن اس کی ملاقات شانزے سے ہو گئی۔ وہ ایک بزنس میٹنگ تھی۔ جنید صاحب شانزے کا تعارف کروا رہے تھے اور وہ دم بخود تھا۔ شانزے نے مسکرا کر ہیلو کہا۔ تو شاہ زیب کا سکتہ ٹوٹ گیا اور وہ فقط سر ہلا کر رہ گیا۔ پہلی نظر کی محبت کس قدر جان لیوا ہوتی ہے یہ شاہ زیب جان گیا تھا۔ ایک دو ملاقاتوں کے بعد اس نے شانزے کو پر پوز کر دیا۔ جب شانزے کو اس کی شادی کا معلوم ہوا تو وہ حیران ہوئی شاہ زیب نے اسے جواب دیا کہ اس کی بیوی ایک نفسیاتی مریضہ ہے۔ جو ہر روز اس سے لڑتی جھگڑتی ہے۔ شادی تو شاہ زیب نے کرنی تھی مگر یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ شانزے اس کو مل گئی۔ شانزے ایک بولڈ اور پریکٹیکل لڑکی تھی۔ اس نے سوچ کر جواب دینے کا کہا اور شاہ زیب سے وہ دو دن گزارنے مشکل ہو گئے

تھے۔ پھر شانزے نے جواب دیا۔

”میری دو شرطیں ہوں گی مسٹر شاہ زیب! ایک تو آپ گھر داماد بن جائیں، دوسرا آپ کو اپنی پہلی بیوی کو طلاق دینا ہوگی۔“

شاہ زیب کو یہ دونوں شرطیں منظور تھیں۔ شانزے حنا سے بھی زیادہ مالدار لڑکی تھی اور اس کے پاپا کی اندرون ملک اور بیرون ملک کئی ٹیکسٹائل ملز تھیں۔ یوں یہ خسارے کا نہیں سراسر فائدے کا سودا تھا۔

حنا کو طلاق نامہ ملا تو وہ چکرا کر گر گئی اور رو دھو کر اپنے گھر چلی گئی۔ شاہ زیب سے حنا کے والد نے تمام پر اپنی گھر اور تمام شیئرز واپس لے لیے مگر شاہ زیب کی منزل تو بہت قریب تھی۔ وہ شانزے کے پاس طلاق نامہ لے کر آیا بطور ثبوت۔ شانزے نے سرسری سادیکھا اور ایک طرف رکھ دیا۔

”لیکن مسٹر شاہ زیب! میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔ کیونکہ ذہنی مریض حنا نہیں آپ ہیں اور آپ کا ذہنی مرض معلوم ہے کیا ہے زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی دھن۔ اب میں نے حنا کو ایک ذہنی مریض سے نجات دلادی ہے۔ وہ اپنے لیے فیوچر میں کوئی اچھا لائف پارٹنر جن لے گی اور میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔ سو سوری۔“

”یو..... میں تمہاری جان لے لوں گا۔“ شاہ زیب کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

”بس اتنی ہی محبت تھی، ختم بھی ہو گئی ویری سیڈ۔“ شانزے نے سیکورٹی کے ذریعے شاہ زیب کو دھکے دلوا کر آفس سے نکلوا دیا اور وہ اپنے والدین کے ساتھ اسی چھوٹے سے گھر میں آ گیا جہاں سے چلا تھا۔

شاہ زیب سوچ رہا تھا کہ یہ سود و زیاں کا حساب کون کرے گا۔

وہ اپنی قسمت پر ماتم کناں تھا۔

☆.....

نائیلہ طارق

سلسلہ وارناول

قسط نمبر 33

جہو عشق میں بیسی وہ عشق ہی جانی

”مان! تم اب تک جاگ رہے ہو؟“ بیلا کی نیند میں ڈوبی آواز پر اپنی بیٹی کو بازوؤں میں سنبھالے وہ بیلا کے سامنے آ بیٹھا تھا۔



READING
Section

”میں اپنی پری سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کے لیے تو میں ساری زندگی جاگ سکتا ہوں۔“ محبت سے لبریز لہجے میں بولتے ہوئے اس نے بچی کے خوابیدہ چہرے کو چوم لیا تھا۔

”اگر تم دن رات اسے گود میں اٹھائے گھومتے رہے تو یہ تمہاری عادی ہو جائے گی اور جب تم دوبارہ انسٹی ٹیوٹ ریڈیو اور اپنے نہ ختم ہونے والے دیگر کاموں کے لیے سارا دن گھر سے باہر رہو گے۔ تب میں اسے کیسے سنبھال سکوں گی؟“ بیلا نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

”تمہیں پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ میں اسے دیکھے بغیر سارا دن گھر سے باہر کیسے گزاروں گا؟“ وہ بے بسی سے بولتا دوبارہ اپنی بیٹی کے من موہنے نقوش کو تنگنے لگا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ اس کی خاموشی پر بیلا نے بغور اسے دیکھا تھا۔ جو اب گہری سانس لے کر عثمان نے نظر اٹھائی تھی۔



READING
SECTION

”جانتی ہو مجھ سے پہلے میری بیٹی کا چہرہ کس نے دیکھا تھا؟ مجھ سے پہلے کس نے اسے اپنی گود میں لے کر پیار کیا تھا؟“ عثمان کے مدہم گہرے لہجے نے بیلا کے تاثرات بدلے تھے۔ ساکت نظروں سے وہ بس اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

”تم ان کا خون ہو مگر تمہاری بیٹی کی زندگی میں بھی ان کا خون شامل ہے۔ کیا اس شخص کی زیادتی بھولنے کے لیے اتنا کافی نہیں ہے؟“ عثمان کے مزید کہنے پر بھی وہ بس ساکت و جامد تھی۔

”کیا ہماری وجہ سے ہماری اولاد کو بھی محروم رہنا پڑے گا؟ کیا ہم اسے ماضی کی تلخیوں سے بھرے حال میں پروان چڑھا میں گے؟ میں جانتا ہوں تمہارے لیے ان اذیتوں کو جلانا دشوار ہے مگر ہماری اولاد کے لیے وہ بھی تو ہماری غلطیوں، نادانیوں کو بھول گئے ہیں۔“ اس کے تاثرات کا جائزہ لیتا وہ بولا تھا اور پھر دھیرے دھیرے اس نے اپنی اور فاروق کے درمیان ہونے والی گفتگو سے اسے آگاہ کر دیا تھا۔ جو ہوٹل میں قیام کے دوران ہوئی تھی۔ خاموش ہو کر وہ چند لمحوں تک اس کے کسی رد عمل کا انتظار کرتا رہا تھا مگر بیلا نے نہ کچھ کہا نہ اس کی جانب دیکھا لیکن اس کے چہرے پر یکدم پھیلتے حزن کے تاثرات عثمان سے چھپے نہیں رہ سکے تھے۔

”میں جانتا ہوں، یہ سب جان کر تمہیں دھچکہ پہنچا ہے مگر یہ سچ ہے کہ میں ان کے سامنے نہ تمہارے لیے جھکا نہ اپنے لیے۔ مجھے بس اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے ان سے بات کرنی تھی۔ اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنا تھا۔“ خاموش ہو کر وہ سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا جو نم آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”کیا کیا غلطیاں کی تھیں تم نے میری وجہ سے؟“ وہ لرزتے لہجے میں بولی تھی۔

”یہ سوال ہی غلط اور بے معنی ہے۔“ عثمان نے ٹوکا تھا۔

”میں آج بھی اس بات پر قائم ہوں کہ اس وقت میں نے اپنے اور تمہارے لیے جو قدم اٹھایا وہ درست تھا۔ میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں بچا تھا لیکن غلط یہ ہوا کہ اس وقت میں نے اپنے اور تمہارے علاوہ کسی کے بارے میں نہ سوچا، نہ کسی کی عزت اور ساکھ کی پرواہ کی۔ آج جب میں ایک بیٹی کا باپ ہوں تو میں زیادہ اچھی طرح فاروق بھائی کے جذبات و احساسات کو سمجھ سکتا ہوں۔ سچ غلط کی اب مجھے پرواہ نہیں ہے۔ مجھے اب صرف مکافات عمل کا خوف ہے۔ 20 سال بعد اگر میری بیٹی مجھ سے ہر رشتہ ختم کر کے مجھے جہنم کی آگ میں جھلتا چھوڑ کر گئی تو میں فاروق بھائی کی طرح روز مرہ نہیں جی سکوں گا۔“ شدت جذبات سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ وہ مزید نہ تو کچھ بول سکا تھا اور نہ ہی اس کے سامنے ٹھہر سکا تھا۔ پیلا دم سادھے بند ہوتے دروازے کو دیکھتی رہ گئی تھی مگر درد کی اٹھتی لہریں اس کے دل و جاں کو نڈھال کر گئی تھیں۔

گلاس ونڈو کے قریب وہ گہری سوچ میں گم باہر کسی غیر مرئی شے کو دیکھ رہا تھا کہ شانے پر محسوس ہوتے ہاتھ کے لمس نے اسے چونکا دیا تھا۔ بیلا کے آنسوؤں سے بھیکے چہرے کو دیکھتا وہ کچھ بول نہیں سکا تھا۔

”اگر..... اگر وہ ہمیں ایک کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے تو انہوں نے کیوں سب کو بے خبر رکھا؟“ بیلا کا لہجہ کانپ رہا تھا۔

”شاید..... بلکہ یقیناً وہ آنے والے وقت سے حالات سے بے خبر تھے۔ جس طرح ہم ان کی سوچ سے

بے خبر تھے انجانے میں انہوں نے دیر کر کے غلطی کی اور میں نے مزید انتظار ترک کر کے۔ اس کی بھیگی آنکھوں میں دیکھا وہ مضطرب لہجے میں بولا تھا۔

”مگر میں اپنے اس فیصلے پر شرمسار نہیں ہوں۔ ہم دونوں نے جو قدم اٹھایا تھا وہ بہت سوچ سمجھ کر بہت انتظار کے بعد اٹھایا تھا۔ اب ہمیں ازالہ کرنا ہے اس تکلیف کا جسے ہم سے تعلق رکھنے والے رشتوں نے سہا ہے۔ اس بار ہم دونوں دیر نہیں کریں گے۔“ اس کے آنسو پوروں میں سینٹا وہ فطعی لہجے میں بولا تھا۔

☆.....☆

وہ حیران تھے کہ ہارن دینے پر بھی کوئی گیٹ تک نہیں آیا تھا۔ بہر حال گیٹ کھلا ہوا تھا۔ اس چیز نے ان کو مزید حیران کیا تھا۔ گاڑی وہ خود ہی اندر لے آئے تھے ورنہ عموماً یہ ڈیوٹی فاران کی ہوتی تھی وہ اوپر پہنچے تو لاؤنج تک میں سناٹے کا راج تھا۔ تشویش سے انہوں نے عروسہ کو پکارا تھا مگر جواب نہ ہوا۔ حیران ہوتے وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ ان کی متلاشی نگاہیں سامنے بیڈ کی طرف جاٹھری تھیں۔ چند لمحوں کے لیے تو وہ بالکل ساکت ہو گئے۔ گلابی کبل میں کلبلا تے ننھے وجود نے ان کی روح تک کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ ایسا شدید دکھا لگا تھا دل کو کہ اعصاب ٹوٹنے لگے تھے۔ کیسے بھول سکتے تھے وہ اس کے پھول جیسے چہرے کو جو دن رات ان کی نگاہوں کے سامنے گھومتا رہتا تھا۔ وہ خواب نہیں دیکھ رہے تھے۔ اس کا ننھا سا وجود حقیقت میں ان کے گھرانے کی آنکھوں میں روشنیاں بھرتا دل کو اپنی سمت کھینچے جا رہا تھا۔ اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھاتے ہوئے فاروق کے سینے میں محبت و شفقت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا۔ ان کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ جب کہ ان کے بوسوں سے بے نیاز وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولتی بند کرتی خود میں ہی مگن تھی۔ اس کی من موہنی صورت دل میں اتارتے فاروق ہم آنکھوں کے ساتھ اس کی بے نیازی پر مسکرائے تھے۔ اس کی آنکھیں بالکل ہو بہو عثمان کی آنکھوں جیسی تھیں۔ چمکتی، مسکراتی، پرکشش مگر اس کا چہرہ بالکل اپنی ماں جیسا تھا۔ ٹھوڑی پروسیا ہی ہلکا سا گڑھا۔ ان کو یاد تھا کہ بیلا بھی بالکل ایسی ہی تھی جب انہوں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ اس وقت بیلا کی جانب بھی ان کا دل ایسے ہی کھینچتا تھا مگر صرف ماں، باپ پر ناراضی ظاہر کرنے کے لیے وہ اس کے معصوم وجود کو نظر انداز کرتے رہے تھے لیکن سچ تو یہ تھا کہ اس کے لیے وہ اپنے دل کو مارتے رہے تھے۔ خود پر ظلم کرتے رہے تھے۔ عقب سے ابھرنی عروسہ کی پکار پر وہ پلٹے تھے مگر آگے ہی پل ساکت رہ گئے تھے۔ دل کے رستے زخم جیسے جاگ اٹھے تھے۔ یہ اذیت ناقابل برداشت تھی۔ ان کی سرخ ہوتی آنکھیں اس پر ہی تھیں جس کا ہاتھ پکڑے عروسہ ان کی طرف آرہی تھیں۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور چہرہ لٹھے کی مانند ہو رہا تھا۔ عروسہ نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر بہت خاموشی سے فاروق کے ہاتھوں سے ہنسی کو لیا تھا اور اسی خاموشی کے ساتھ کمرے سے باہر نکلتی چلی گئی تھیں۔ شدت ضبط سے فاروق کی آنکھیں سلگ رہی تھیں۔ وقت مسکرا رہا ہوتا ہے اس لمحے جب انسان اپنے زعم میں بڑے بڑے فیصلے کرتا ہے اور اس لمحے بھی جب یہی انسان اپنے فیصلوں اور زعم کو چکنا چور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ قدرت نے کبھی آنے والے وقت کا تعین کرنے کا اختیار انسان کے ہاتھ میں نہیں دیا اور انسان کے حق میں یہی بہتر ہے، ایک وقت تھا جب وہ اسے اپنے گھر کی چھت تلے آنے کے اختیار سے بھی محروم کر چکے تھے اور ایک وقت یہ تھا کہ وہ آج اچانک اسی گھر میں ان کے سامنے موجود تھی۔ ان کی عزت کو پیروں تلے روندنے کے بعد اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ اس پر چیختے، چلاتے، ایک

بار پھر اسے اپنے گھر اپنی زندگی سے نکال باہر کرتے مگر..... وہ تو اسے اپنے سینے میں چھپالینا چاہتے تھے۔ برسوں کی پیاس بجھانا چاہتے تھے۔ اس کے وجود میں ان کی ماں کی خوشبو بستی تھی۔ ایک بار پھر وہ اس خوشبو سے محروم ہو کر جہنم میں نہیں جانا چاہتے تھے مگر خود میں اتنا حوصلہ بھی نہیں پاتے تھے کہ درمیان سے ٹوٹی بکھری انا کے بلے کو ہٹا کر اس کی جانب بڑھتے۔

پتے کی طرح لرزتے وجود اور بھیکے چہرے کے ساتھ جب بیلا نے سر اٹھا کر ان کی سمت دیکھا تو جیسے پھر کچھ یاد نہ رہا، آنسوؤں اور سسکیوں کا ریلہ اسے فاروق کے قدموں میں گرا گیا تھا۔

”مجھے معاف کر دیں یا آج اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دیں۔“ ان کے پیروں سے لپٹ کر زارو قطار تڑپ تڑپ کر روئی وہ ان کے دل کو کئی ٹکڑوں میں کاٹ گئی تھی۔ ان کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ جب انہوں نے بیلا کو شانوں سے تھام کر اٹھایا تھا۔

”کیوں اتنی دیر کی واپس آنے میں؟ کیوں اتنی طویل سزا دی مجھے؟“ ضبط کی شدت سے فاروق کی آواز گھٹ گئی تھی۔

”میں نے آپ کا سر ساری دنیا کے سامنے جھکایا تھا کس طرح سامنا کرتی آپ کا؟“ وہ بمشکل سسکیوں کے درمیان بولی تھی۔

”ہر چیز کا ذمہ دار میں ہوں، مگر جب تم نے ہر رشتہ ہی ختم کر دیا تو کیا کرتا اس دنیا کی پرواہ کر کے، کسی کا کیا گیا، اپنی سلگائی آگ میں تو اب تک میں ہی جلتا رہا ہوں۔ میں غلط تھا۔ کبھی تمہیں یہ نہیں سمجھا سکا کہ تم میرے لیے میری اولاد سے بڑھ کر ہو۔ تم اور عثمان میرے لیے میرے بچوں سے پہلے ہو۔ تم نے مجھے یہ یقین کرنے پر مجبور کر دیا تھا کہ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو۔“ دل کی اذیت فاروق کی آنکھوں سے بہنے لگی تھی۔

”میرے ماں باپ آپ میں زندہ ہیں۔ مجھے زندہ رہنے کے لیے آپ کے سہارے آپ کی محبت کی ضرورت رہی ہے۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہے، میں نے آپ کی نافرمانی کی، آپ کو اذیتیں پہنچائیں۔ آپ مجھے برا کہیں، ماریں مجھے لیکن خود سے دور مت کریں۔“ ان کے سینے سے لگی وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ کوئی بوجھ فاروق کو اپنے کندھوں سے اترتا محسوس ہو رہا تھا۔ بے شمار دنوں کا غبار تھا جسے آنکھوں سے رسنے سے وہ نہیں روک سکے تھے۔ کمرے کے باہر سسکتیں عروسہ کو ساتھ لگائے عثمان بالکل مطمئن تھا۔ رشتے خون کے ہوں یا دل کے، وہ بہت اچھی طرح ان کی قدر و اہمیت کو سمجھ چکا تھا۔ منزل تک پہنچنا ہی صرف کامیابی نہیں ہے۔ اصل کامیابی تو یہ ہے کہ جب انسان منزل پر پہنچے تو اس خوشی کو بانٹنے کے لیے ایک کارواں بھی ساتھ ہو۔ وہ خوش تھا کہ ایک چھوٹا سا کارواں اب اس کے ساتھ بھی ہے۔

☆.....☆

بہت محنت سے اس نے بالوں کو خوب صورت سے جوڑے کی شکل میں قید کیا تھا مگر پھر بھی تنقیدی جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ سفید فرائی بند گلے اور فل سلیوس سے لباس میں اس کے وجود میں پاکیزگی جگمگا اٹھی تھی۔ شرٹ کے کالر اور گریبان پر سلور نازک سی ایمر ایڈری نے اس کے لباس کو اور زیادہ دلکش بنا دیا تھا۔ ہلکے ہلکے میک اپ اور کانوں میں موجود سفید موتیوں کے ٹاپس کی وجہ سے اس کا چہرہ بہت کھلا کھلا اور خوشنما تھا پیشانی پر گری آئیں ریکی تراشیدہ ٹیس ماہ نسیم کی دمک کو چھپانے میں ناکام تھیں۔ نگوں سے بھی

READING
Section

سفید رنگ کے نازک سے سیلپرز پہن کر وہ شانے سے پھسلتے دوٹے کو ٹھیک کرتی اپنے کمرے سے نکلی تھی۔
عون کو گود میں بٹھائے فاطمہ حیرت سے لاؤنج کی طرف آتی خرمن کو دیکھ رہی تھیں۔
”تمہیں عارش کے ساتھ کہیں جانا تھا کیا اور یہ سفید رنگ کیوں پہنا ہے تم نے؟“

”کیوں سفید رنگ میں کیا برائی ہے؟ آپ کے وہم میں میرا اتنا خوب صورت ڈریس برباد ہو جائے گا۔“ فاطمہ کی ناراض نظروں پر مسکراتی وہ اخبار میں مگن احمد حسین کے قریب جا بیٹھی تھی۔
”اور کیا یہ ضروری ہے کہ جب کہیں جانا ہو تب ہی اچھے کپڑے پہنے جائیں۔ آپ ہی تو کہتی ہیں کہ شوہر کے گھر آنے کا وقت ہو تو بیوی کو چاہیے گھر کو صاف ستھرا رکھے، خود بھی اچھے حلیے میں ہو اور بچوں کو بھی صاف کپڑے پہنائے، میں تو آپ کی باتوں پر عمل کرتی ہوں۔ فرمانبردار بیٹی جو ہوں، میں نے ٹھیک کہا بابا.....!“ مسکراہٹ چھپاتے ہوئے اس نے احمد حسین کو متوجہ کیا تھا۔
”بالکل! اس میں تو کوئی شک نہیں تم بھی یہ جانتی ہو کہ ہم جو تمہیں سمجھاتے ہیں اس میں تمہاری بھلائی پوشیدہ ہوتی ہے۔“

”بابا! میں یہ جانتی ہوں۔ اسی لیے تو میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے کہ اب کبھی اپنے کسی عمل سے آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ میں اب یہ نہیں ہونے دوں گی کہ میری وجہ سے آپ کو کسی کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے یا مجھ پر سے آپ کا فخر کم ہو۔“ اس کے نام لہجے پر احمد حسین نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

”بیٹا! نادانی اور غلطی ہر انسان سے سرزد ہو جاتی ہے مگر یہ سب کبھی تمہاری اہمیت کو کم نہیں کر سکتا۔ ہمیں پہلے سے زیادہ تم پر فخر ہے اور صرف ہمیں ہی نہیں تمہارے ماں باپ اور بھائیوں کو بھی تم پر فخر ہے تم اس کی مستحق ہو، بس تم اور عارش خوش و خرم زندگی بسر کرو۔ ہمارے لیے یہی کافی ہے۔“ احمد حسین کے پر شفقت لہجے پر وہ دھیمے سے مسکراتی عون کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ ضد میں آتا وہ رونا شروع کر چکا تھا۔ جب کہ فاطمہ اسے بہلانے کی کوشش میں تھیں۔ ان سے عون کو لے کر کندھے سے لگائی وہ ٹہل رہی تھی۔ جب کال بیل بجی تھی۔

گھر میں داخل ہوتے عارش نے کچھ چوکتی مگر گہری نگاہ اس کے دلکش نقوش پر ڈالی تھی لیکن اگلے ہی پل وہ نگاہ ہٹاتا عون کو اس سے لے چکا تھا۔

”عارش! امی بابا کو تم منیزہ کی طرف ڈراپ کرنے جاؤ گے تو واپس ذرا جلدی آ جانا، ویسے بھی آج انسٹی ٹیوٹ تو آف ہی ہوگا۔“ خرمن کے لہجے میں دبا دبا اصرار تھا۔ عون کو پیار کرتے ہوئے اس نے خرمن کی تاکید سن کر بس اسے ایک نظر دیکھا تھا۔ کہا کچھ نہیں۔ عون کو واپس اس کے حوالے کرتا وہ اندر کی جانب بڑھ گیا تھا۔ لاؤنج میں فاطمہ اور احمد حسین نے ایک ساتھ ہی اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔

”آپ دونوں کے ٹور جانے کب ختم ہوں گے۔ ایک ہفتہ باقی ہے ابھی منیزہ کی شادی میں، ابھی سے آپ دونوں چلے جائیں گے تو سناٹا ہو جائے گا گھر میں۔“ ناراض لہجے میں وہ دونوں سے ہی مخاطب تھا۔

”خرمن سے پوچھو، منیزہ کے کتنے فون آچکے ہیں۔ اور پھر بھائی صاحب اور بھابی بھی اتنا اصرار کر رہے ہیں تو اچھا نہیں لگتا بار بار انکار کرنا، یہ تو خوشی کا موقع ہے۔“ فاطمہ کے کہنے پر وہ بس ان کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔

”خرمن! تم یہاں ایسے ہی کھڑی ہو۔ چائے پانی کا تو پوچھو عارش سے، سارا دن کا تھکا ہارا وہ گھر واپس آیا ہے۔“ فاطمہ کے اچانک گھر کئے پر اس نے بوکھلا کر عون کو ان کے حوالے کیا اور تیزی سے وہاں سے آگئی تھی۔

”مامی! اگر آپ نہ ہوں تو میں بھوکا پیاسا ہی مر جاؤں۔“ مسکراتی نظروں سے اس نے احمد حسین کو بھی دیکھا تھا۔ اگلے ہی پل ان کی تنبیہی نظر پر وہ شرارت سے ہنساتھا۔

”اچھی بات منہ سے نکالا کرو۔“ فاطمہ نے حنفی سے اسے دیکھا تھا۔

”ایک تو تمہارے کام تمہیں اتنا مصروف رکھتے ہیں کہ اپنے بچے کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا تمہارے پاس، مجال ہے جو اسے ذرا باہر لے جاؤ۔ گھما پھرا دو۔“

”مامی! میرے پاس اس کے لیے بہت وقت ہے مگر میں آپ کو حقیقت بتاؤں کہ یہ مجھے زیادہ پسند نہیں کرتا۔“ اس کے سنجیدہ انداز پر فاطمہ دنگ ہوئی تھیں جب کہ احمد حسین اخبار کی ورق گردانی کرتے بے ساختہ مسکرائے تھے۔

☆.....☆

”میرے لیے یہ اطمینان، خوشی کا باعث بھی ہے کہ تم پھر سب سے جڑ گئے ہو۔ خود کو منوا چکے ہو۔ تمہاری بیٹی نے آکر کافی معاملات کو سنوار دیا ہے۔“ ڈرائیو کے دوران وہ عثمان سے مخاطب تھا جس کی آنکھیں اپنی بیٹی کے ذکر پر روشن ہوئی تھیں۔

”ہاں یہ تو سچ ہے اور یہ حقیقت بھی اٹل ہے کہ اگر تم اور خرمن میرے اور بیلا کے ساتھ نہ ہوتے تو ہم کبھی اتنے مشکل دور سے نہ گزر پاتے۔ دوستی، محبت سب اپنی جگہ مگر میں اور بیلا دل سے تم دونوں کے احسان مند اور شکر گزار ہیں۔ تم دونوں کی سپورٹ کے بغیر ہم کبھی ایک نارمل زندگی شروع نہیں کر سکتے تھے۔ میں بہت خوش قسمت ہوں کہ میری زندگی میں تم اور خرمن موجود ہو۔“ عثمان کے لہجے میں ممنونیت اور سچائی تھی۔

”سچ یہ ہے کہ آج تم جہاں ہو، وہاں اپنی جدوجہد اور نیک نیتی کی وجہ سے ہو۔“ عارش نے سنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔

”کبھی کبھی میں یہ سوچ کر حیران ہوتا ہوں کہ دیکھتے ہی دیکھتے کتنا وقت گزر گیا۔ سچ ہے کہ عشق، محبت کے جھمیلوں میں بندے پر کیا کچھ گزرتا رہا کچھ ہوش نہیں رہتا۔ حاصل وصول کچھ ہونہ ہو بندہ اللہ کے نزدیک ضرور ہو جاتا ہے۔ زندگی جینے کا سلیقہ انسان کو صرف وقت نہیں سکھاتا، عشق بھی بہت کچھ سکھا جاتا ہے۔“

”ٹھیک کہا تم نے، عشق سے یاد آیا کہ خرمن نے مجھے جلدی گھر پہنچنے کی تاکید کی تھی۔“ عارش کے یکدم کہنے پر عثمان بے ساختہ ہنساتھا۔

”ذرا تم اسے کال کر کے بتاؤ کہ ہم ہارون کے حکم کے مطابق ان کو پک کرنے ریڈیو اسٹیشن جا رہے ہیں۔ میں اس کی تاکید پر عمل نہیں کر سکوں گا۔“

”یہ تم کہہ رہے ہو؟ خرمن تمہارے انتظار میں ہوگی۔ تم اتنے باہمت شوہر کب سے بن گئے؟“

”اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ دونوں طرف سے پھنسا ہوں تم نے سنا نہیں ہے کہ ساری خدائی ایک طرف اور بیوی کا بھائی ایک طرف۔“ عارش کے مسکراتے لہجے پر عثمان نے ہنستے ہوئے اپنا فون ہاتھ میں لیا تھا۔

اتنی دیر سے انتظار کی کوفت میں مبتلا رہنے کے بعد اب عارش کے بجائے عثمان کی کال نے اسے مزید مایوس کر دیا تھا۔

”سنو استانی! آئی ہیٹ یو۔“

”یہی بتانے کے لیے کال کی تھی؟ عارش کہاں ہے؟“ وہ ناگواری سے بولی تھی۔

”مجھے کیا پتا وہ میری اولاد تھوڑی ہی ہے جو میں اس کی خبر رکھوں گا۔“

”وہ تمہاری اولاد نہیں مگر میں تمہاری ماں ہوں بیٹا، مجھے پتا ہے وہ تمہارے ساتھ ہی ہے۔“ خرمن کے

انداز پر وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔

”تمہارے سامنے میری بد معاشی زیادہ دیر نہیں چل سکتی۔ دراصل تمہیں یہ بتانا تھا کہ ہم دونوں دوست

ہارون کو پک کرنے ریڈیو جا رہے ہیں۔ ان کا بھی ہمارے ساتھ آوارہ گردی کا موڈ ہے اور ہاں ڈنر ہم

باہر کرنے والے ہیں وہ بھی تمہارے بھائی کے خرچے پر۔ لہذا تمہارے شوہر نامدار گھر دیر سے پہنچیں گے

مگر تمہیں قسم ہے وہ جب گھر پہنچے اس کے چوبیس طبق روشن کر دینا، چودہ طبق روشن تو تم کرنی ہی رہتی ہو۔“

”تمہاری بک بک ختم نہیں ہوگی۔ جہاں جانا ہے جاؤ مگر اپنے دوست کو یاد دلا دینا کہ اس کا ایک گھر

بھی موجود ہے۔“

”مگر اس گھر میں تم بھی تو موجود ہو، وہ یہ کیسے بھولے؟“

”جہنم میں جاؤ۔“ اس کے ڈھٹائی سے کہنے پر بھڑکتی وہ لائن ڈسکلینکٹ کر گئی تھی۔ بے زاری کے

ساتھ وہ عون کو اٹھائے ٹی وی کے سامنے آ بیٹھی تھی۔ سارا پروگرام غارت ہو گیا تھا۔ اس کا مکمل ارادہ تھا

کہ آج عارش کے ساتھ وہ باہر جائے گی۔ ڈنر بھی اس نے باہر کرنے کا سوچا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ

آج وہ اپنے اور عارش کے درمیان کھڑی سرد مہری کی دیوار کو مکمل گرا دے گی مگر..... ٹی وی دیکھتے جانے

کس وقت وہ پہلو میں موجود عون سے بھی بے خبر ہو گئی تھی۔ پتا نہیں کتنا وقت گزرا جب یکدم اس کی نیند

ٹوٹی تھی۔ فوراً ہی اٹھتے ہوئے پہلی نگاہ لاؤنج میں آتے عارش کی سمت گئی تھی غالباً وہ اسی وقت ہی گھر

واپس آیا تھا۔

”باہر وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا، میں ابھی ہارون کو گھر ڈراپ کرتا یہاں آیا ہوں۔“ سوئے

ہوئے عون کو صوفے سے اٹھاتا وہ اسے بتا رہا تھا جو بوجھل آنکھیں سہلائی صوفے سے اٹھ رہی تھی۔

”تمہاری چاکلیٹس فریج میں رکھی ہیں جس قدر مان سے بچ سکی تھیں۔“ اسے خاموشی سے وہاں سے

جانا دیکھ کر عارش نے یہ بتایا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ رکے بغیر اتنا ہی کہتی وہ وہاں سے گئی تھی جب کہ عارش، عون کو سنبھالے بیڈروم کی

طرف بڑھ گیا تھا۔

پانی گلاس میں انڈیلیتی وہ ایک پل کے لیے کچن میں آتے عارش کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”تم نے کھانا کھایا؟“

”نہیں، بھوک نہیں ہے۔“

”ہوں..... تمہاری طبیعت بہتر ہے؟“ بغور عارش نے اسے دیکھا تھا جو کوئی جواب دیئے بغیر فریج کی

سمت گئی تھی۔

”اگر تمہیں میرے ساتھ کہیں جانا تھا تو ہم کل جا سکتے ہیں۔“

”نہیں، مجھے کہیں نہیں جانا تھا۔“

”پھر تم نے مجھے جلدی آنے کے لیے کیوں کہا تھا؟“ عارش نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔
”یہ سوال کرنے کا اب کوئی فائدہ نہیں، اس لیے رہنے دو۔“ سرد لہجے میں بولتی وہ کچن سے نکل گئی تھی۔
بیڈروم میں داخل ہوتا وہ ایک پل کے لیے اس کی طرف متوجہ ہوا تھا جو نیند میں ڈسٹرب ہوتے عون کو تھپک رہی تھی۔ رسٹ وایچ کھولتا وہ ڈریسنگ پر رکھے ایک پیکٹ کو اٹھاتا پلٹ کر سوالیہ نظروں سے خرمن کو دیکھنے لگا تھا جو بالوں کو ہاتھوں سے سمیٹتی اسی جانب آرہی تھی۔

”یہ گفٹ ہے، وہی کیمروہ جو عثمان کے لیے برہان بھائی نے بھیجا تھا۔ شاید ان کو عثمان نے بتا دیا تھا کہ مجھے وہ کیمروہ بہت پسند آ گیا تھا۔“

”اور یہ جاننے کے بعد انہوں نے تحفہ تمہیں یہ کیمروہ بھیج دیا۔“ سرد لہجے میں بولتا وہ پیکٹ واپس ڈریسنگ پر رکھ چکا تھا۔

”کہنا کیا چاہتے ہو تم؟“ خرمن کا لہجہ سپاٹ تھا۔

”مجھے کچھ نہیں کہنا اب تم سے۔“ سرد نظروں سے اس نے خرمن کو دیکھا تھا۔

”عارش! تم جانتے ہو یہ کہ برہان بھائی نے کبھی بھی اس طرح تحفے نہیں بھیجے ہیں۔ یہ تحفہ ان کی بیوی کی طرف سے آیا ہے ہماری ویڈنگ اپنی ورسری کے لیے جسے گزرے کئی دن ہو چکے ہیں مگر تمہیں وہ دن کیوں یاد رہے گا، وہ تو تمہاری زندگی کا سب سے بھیا تک دن تھا۔“ سرخ چہرے کے ساتھ بولتی وہ تیز قدموں کے ساتھ دروازے کی سمت بڑھ گئی تھی مگر پھر یکدم رک کر پلٹی تھی۔

”تمہیں شرم آنی چاہیے ان کے لیے دل میں بغض رکھتے ہوئے۔“ وہ بھڑک کر بولی تھی۔

”تمہیں جو کہنا ہے کہو مگر میں یہ نہیں بھول سکتا کہ وہ تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرنے کے لیے تیار تھا۔“

عارش کا لہجہ بھی غصیلا تھا۔

”وہ ان کے ماں باپ کا فیصلہ تھا ان کا نہیں۔ وہی ایسا نہ سوچتے تو مجھے طعنے سننے نہ پڑتے تمہارے؟“

شدید اذیت سے خرمن کا لہجہ بھرا گیا تھا۔ سرعت سے پلٹ کر وہ باہر نکل گئی تھی۔ عارش کے سامنے وہ کسی طرح بھی خود کو کمزور ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ٹیرس پر پھیلی تاریکی میں وہ کبوتروں کے پنجرے کے قریب کھڑی خود کو کھمبل پر سکون رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تب ہی اسے عقب میں آہٹ کا احساس ہوا مگر وہ لاتعلق رہی تھی۔

”میں نے تمہیں کوئی طعنہ نہیں دیا خرمن! میں بس تمہارے لیے پوزیو ہوں۔ میں کوشش کروں گا کہ

آئندہ اس طرح تمہاری دل آزادی نہ کروں۔“ اس کے بجھے لہجے پر خرمن نے نہ کچھ کہا نہ ہی پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔

”کیا واقعی تمہیں یقین ہے کہ میں اس دن کو بھول سکتا ہوں، جب تمہاری صورت میں ساری کائنات میری بانہوں میں آگئی تھی؟“ اس کی مدھم آواز بہت قریب سے ابھری تھی۔ اتنا قریب کہ اس کی سانسیں خرمن کو اپنے بالوں پر محسوس ہوئی تھیں۔ دھیرے سے عارش نے اس کا سراپنی طرف کیا تھا۔ تاریکی اس

قدربھی نہ تھی کہ وہ اس کی بھیگی پلکوں اور حزن میں ڈوبے چہرے کو نہ دیکھ سکتا۔
 ”میں اس دن کو کسی اچھے وقت میں تمہارے ساتھ سیلبریٹ کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اس وقت کا انتظار ہے۔“ اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں بھرتا وہ بولا تھا۔

”مجھے معاف کر دینا کیونکہ چاہتے ہوئے بھی میں جان بوجھ کر جلدی نہیں آنا چاہتا تھا۔ یہ وہ دن نہیں تھا جس میں مجھے دوبارہ تمہاری محبت میں مبتلا ہونا ہے۔“ وہ گھمبیر لہجے میں اس سے مخاطب تھا جو نگاہ اٹھا کر اسے دیکھنے سے بھی گریز کر رہی تھی۔ عارش نے چاہا تھا کہ اس کی پلکوں پر ٹھہری نمی لبوں میں سمیٹ کر اس کے ہونٹوں پر منتقل کر ڈالے مگر وہ جس سرعت سے اس کی گرفت سے نکل گئی تھی اسی تیزی سے عارش نے اس کا ہاتھ تھام کر واپس اپنے سامنے کیا تھا۔ ہلکا سا لڑکھڑاتے ہوئے اس کی پشت پنجرے کی دیوار سے جا لگی تھی۔ اس کی کلائیاں بھی اپنی مضبوط گرفت کے ساتھ پنجرے سے ٹکاتا وہ اسے ساکت کر گیا تھا۔

”تم زخم لگاتی ہو لیکن مسیحا ہو میں غلطیاں کرتا ہوں لیکن تمہارا وفادار ہوں۔ میرا دل تمہیں پوجتا ہے، لیکن تم پتھر کا بت نہیں، تم بہت اچھی ہو مگر فرشتہ نہیں، میں گناہ کرتا ہوں لیکن شیطان کا پیروکار نہیں۔ میں تمہیں دکھ دیتا ہوں، مجھے حق ہے کیونکہ میں چاہت بھی تو تمہیں بے شمار دیتا ہوں۔“ اس کی جانب جھکا وہ یکدم خاموش ہوا تھا کہ خرمن چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

”تمہیں ظلم کرنے کا کوئی سلیقہ نہیں آتا خرمن! ظالم بننے کی ناکام کوشش کیوں کرتی ہو۔“ اس کے بچھے لہجے پر بھی خرمن نے اس کی جانب نہیں دیکھا تھا مگر اس کی کمزور ہوتی گرفت سے ہاتھ نکالتی وہ اس بار تیزی سے اس کے حصار کو توڑتی نکل گئی تھی۔ گہری سانس لے کر عارش نے آسمان پر بادلوں کی اوٹ میں جاتے ادھورے چاند کو دیکھا تھا۔ آج پھر شدت سے احساس ہوا تھا کہ جیسے وہ اس پر سے سارے استحقاق ختم کر چکا ہے۔

بند آنکھوں کے ساتھ اسے عون کی آواز سنائی دے گئی تھی۔ وہ بیدار ہونے کے بعد اب اتنی جلدی سونے والا نہیں تھا مگر بوجھل دل و دماغ ہونے کے باعث وہ بالکل بھی بیڈ سے اٹھنا نہیں چاہ رہی تھی۔ عارش نے بہر حال اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔ عون کو کاٹ سے نکال کر وہ بیڈ پر ہی لے آیا تھا۔ دوسری جانب کروٹ لیے وہ بند آنکھوں کے ساتھ ان دونوں کی مدھم آوازوں کو سنتی رہی تھی۔ عون کی کسی معصوم حرکت پر عارش ہنسا تھا۔ خرمن نے رخ بدل کر اس کی جانب دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی جو قریب ہو کر بھی میلوں کے فاصلے پر تھا۔ کبھی وہ اس کے دل کے سنگھاسن پر بڑے طمطراق سے براجمان ہوا کرتی تھی۔ وہ لمحے خواب ہو چکے تھے جب لمس کی تپش سے جسم و جاں سلگتے تھے۔ محبت کی چاندنی میں راتیں سبک رواں ندی کی مانند بہتی تھیں۔ قربتوں کے وہ لمحات جن میں چاہت کی الگ ہی زبان ہوا کرتی تھی۔ وہ لمحے وہ شدتیں سب دھندلا چکا تھا۔ اب تو ارد گرد بس عجیب خنکی تھی۔ جہاں نہ محبت کی پر کیف حدت تھی نہ زندگی کے آثار۔

لیب ٹاپ ایک طرف ہٹاتے ہوئے اس نے اپنے سینے پر سونے عون کو احتیاط سے اٹھایا تھا اور خرمن کی جانب بیڈ کے قریب رکھے کاٹ کی سمت آ گیا تھا۔ اب سونے کے بعد وہ یہی توقع کر رہا تھا کہ کم از کم فجر تک عون کی نیند نہیں ٹوٹے گی۔ مطمئن ہو کر عارش نے اس کے من موہنے سے چہرے کو چوم لیا تھا۔

کاٹ سے دور ہٹتے ہوئے اس کی نظر ایک پل کو خرمن تک گئی تھی جو مکمل گہری نیند میں نظر آرہی تھی۔ تکیے پر سر رکھتا وہ مضطرب تھا۔ آنکھیں بند کرتے ہوئے ایک بار پھر یہ سوال اس کے دل و دماغ پر ضرب بن کر لگ رہا تھا کہ آخر کس طرح وہ اپنے جارحانہ سلوک کے لیے خرمن سے معافی مانگ سکے گا؟ وہ کیسے اسے سمجھائے کہ اس سے دور جانا بالکل ناممکن ہے۔ وہ تو بس اس سے نگاہ ملانے کے قابل بھی نہیں رہا ہے۔ کچھ چونک کر وہ خرمن کی طرف متوجہ ہوا تھا جو اس کی بڑھتی بے چینی سے غافل نیند میں اسی طرف رخ بدل رہی تھی۔ بس ایک پل کے لیے اس کی نیند سے بھری خمار آلود آنکھیں عارش کی طرف گئی تھیں۔ اگلے ہی پل اس کی آپس میں جڑتی پلکوں کو دیکھ کر عارش کا دل چاہا تھا کہ اسے جگا کر اپنی طرف متوجہ کرے۔ توڑ ڈالے اپنے اور اس کے درمیان حائل سرد مہری کی دیوار کو اور کھو جائے اس کی بانہوں کی پرسکون جنت میں۔ تب ہی سوچیں تھم سی گئی تھیں جب اس نے خرمن کی آنکھوں کو دوبارہ کھلتے دیکھا تھا۔ اس بار اس کی خمار زدہ آنکھوں میں تحیر بھی تھا۔ خود پر ساکت عارش کی گہری سنجیدہ نظروں پر وہ کچھ بول نہیں سکی تھی۔ مدہم خوابناک سرخ روشنی میں عارش کو اس کے ملکوتی چہرے پر الجھن کے سائے نظر آئے تھے۔

”کیوں جاگ رہے ہو، سو جاؤ۔“ نگاہ چرا کر مدہم لہجے میں بولتی آنکھیں موند گئی تھی۔

”کوشش تو کر رہا ہوں مگر نہ نیند مہربان ہوتی ہے نہ تم۔“ جواباً عارش کے کہنے پر خرمن نے اسے نہیں دیکھا تھا مگر ایک گم شدہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھرتی عارش سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔ اس کے عارض پر تھرکتے پلکوں کے سائے جادو چلا رہے تھے۔ پردے سے عاری خود نمائی کرتا دو دھیما ماہ نیم اس کی پیشانی پر دمکتا رفسوں چاندنی لٹا رہا تھا اور اس کی آب و تاب میں وہ سب کچھ جیسے بھولنے لگا تھا۔ یاد رہا تو بس یہ کہ ان پلکوں، ان لب و رخسار کے سواد دنیا میں رکھا ہی کیا ہے۔ محبت کا دریا نہ کبھی خشک ہوا ہے نہ ہوگا۔ یہ سچ ہی تو ہے۔ ان جادوئی لمحوں میں بحر بیکراں میں تلاطم برپا ہو چکا تھا اور وہ جیسے بے بس ہو گیا تھا۔ محبت کے سامنے ہتھیار ڈال دینا ہی بہتر ہے کیونکہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے دنیا کے تمام ہتھیار بے معنی ہیں۔ جس طرح چودھویں رات کا چاند سمندر کی لہروں کو بے قابو کرتا اپنی سمت کھینچتا ہے بالکل اسی طرح چاہتوں سے بھرپور جذبات کا ایک منہ زور ریلا اسے بھی دکتی چاندنی کے کیف آگیاں حصار میں کھینچ لے گیا تھا۔

جسم کی دراڑوں سے روح نظر آنے لگی

بہت اندر تک توڑ گیا مجھے عشق تیرا

☆.....☆

خوب صورت مصنوعی آبشاروں، روشنیوں اور پھولوں سے سجے وسیع سبزے پر بہاریں اتری ہوئی تھیں۔ آرکسٹرا کی مدہم دھنیں خوشگوار فضا میں جادو بکھیر رہی تھیں۔ یہاں پیلا قدم رکھنے کے بعد سے اب تک وقت کس طرح گزرا پتا ہی نہیں چلا۔ نئے رشتوں سے تعارف کا ایک طویل سلسلہ، محبتیں، دعائیں، چاہتیں اس کا دامن بھر چکا تھا۔ یہ سب سمیٹتے ہوئے سب کچھ حسین خواب جیسا لگ رہا تھا۔ کچھ دیر کے لیے منظر سے ہٹ کر سب سے الگ تھلگ ہو کر وہ اس خواب کو دور سے بس دیکھنا چاہتی تھی اور وہ دیکھ رہی تھی اگر آج وہ خود پر رشک کرنے کے قابل تھی تو یہ ان سب انسانوں کی مرہون منت تھا جو اپنی زندگی اپنے خواب، اپنی خوشیاں سب اس کے لیے وقف کر چکے تھے۔ آج اس کے پاس جو کچھ تھا سب ان ہی انسانوں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

کی ریاضتوں اور دعاؤں کی وجہ سے تھا۔ ان انمول رشتوں کے لیے وہ اپنے آپ کو بھی تیاگ سکتی تھی اور یہ اس کے لیے سعادت کی بات ہوتی۔

گہری سانس لے کر اس نے اپنے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھا تھا۔ وقت گزرتا ہی نہیں بدلتا بھی ہے۔ یہ یقین بھی کافی ہے امید کے دیے دل میں روشن رکھنے کے لیے۔ منظر بدل جاتے ہیں۔ راستے بدل جاتے ہیں۔ موسم ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ ساحل سے پھڑی لہر کو کنار امل ہی جاتا ہے۔ انسان تنہا زندگی کا سفر شروع کرتا ہے۔ کارواں بنتا چلا جاتا ہے۔ مٹھی بند کر کے اس نے نگاہ اٹھائی تھی۔ دور سے ہی خوش رنگ پھولوں اور تیز روشنیوں میں گہری نشست پر میزہ اور ہارون انتہائی حسین جوڑے کی شکل میں موجود تھے۔ یقیناً ان دونوں کا انتخاب اوپر آسمانوں پر خاص طور پر کیا گیا تھا۔ ان دونوں پر سے نگاہ ہٹانا بھی ناممکن تھا۔ اس وقت بھی ہارون کو دیکھتے ہوئے اس کا دل خوشی سے نہال ہو رہا تھا مگر ساتھ ہی انجانے خدشے دل میں سر اٹھاتے سانس روکنے لگے تھے۔ یکا یک دل پکھلنے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں احمد حسین پر ٹھہر گئی تھیں جو اس کی جانب بڑھے آ رہے تھے۔ یہاں اس طرح اس کے الگ تھلگ کھڑے ہونے کی وجہ پوچھتے ہوئے وہ اس لمحے خاموش ہو گئے تھے جب خرمن بھیکتی آنکھوں کے ساتھ ان کے سینے سے لگ گئی تھی۔

”نہیں خرمن! اتنے بڑے خوشی کے موقع پر اس طرح روتے نہیں ہیں۔“ اس کے سر کو تھپتھپاتے ہوئے وہ پر شفقت لہجے میں بولے تھے۔

”بابا! آپ کی دعاؤں سے آج مجھے سب کچھ مل چکا ہے۔ ہر محرومی ختم ہو چکی ہے۔ میں خوش ہوں مگر میرے دل میں خوف بڑھتا جا رہا ہے میں یہ سب دوبارہ کھونا نہیں چاہتی۔ میں اب کسی آزمائش، کسی امتحان کو نہیں سہہ سکوں گی۔ بابا! آپ دعا کریں کہ مجھے اب کچھ نہ کھونا پڑے۔“ وہ سسکتے لہجے میں بول رہی تھی۔

”میری دعائیں تو ہر دم تمہارے ساتھ ہیں بیٹا! اپنے دل سے تمام خوف نکال دو۔ تم میری بہت بہادر بیٹی ہو۔ بہت حوصلے والی ہو۔ خوشی اور غم تو زندگی کا حصہ ہوتے ہیں۔ زندگی کے راستے بھی بہت سہل ہوتے ہیں، کبھی بہت دشوار، خاردار جھاڑیوں سے اٹے ہوئے۔ کبھی صحرا کی طرح لقمہ دق اور کبھی ہرا بھرا نخلستان، انسان کو دنیا میں ان راستوں سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ اتار چڑھاؤ زندگی کی اہل حقیقت ہے۔ انسان کو ہمیشہ آنے والے وقت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اللہ سے اچھی امید رکھنی چاہیے۔ آنے والے کل کی فکر میں آج ملنے والی خوشیوں کو اندیشوں میں گم کر دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ مجھے تم پر بہت نخر ہے، میں جانتا ہوں کہ تم کسی حال میں ہمت و حوصلہ نہیں ہارو گی۔“ اس کے آنسو صاف کر کے احمد حسین نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ سکون روح اور قلب میں اترتا خرمن کو مضبوط کر گیا تھا، یہ اللہ کا عظیم احسان تھا کہ اس کے ارد گرد والہانہ محبت نچھاور کرنے والے ہمیشہ موجود رہے اور موجود ہیں اور وہ اپنے رب کی ناشکری بالکل نہیں تھی، بھیک مسکراہٹ کے ساتھ وہ ہشام قزلباش کی طرف متوجہ ہوئی ان کے سینے سے لگی تھی۔ اس کے پاس لفظوں کی کمی نہیں تھی مگر آنسوؤں کا گولہ ہر بار ہی ان لفظوں کا راستہ روک لیتا جب جب وہ ان کو شدت سے یہ بتانا چاہتی تھی کہ وہ ان سے کتنی محبت کرتی ہے۔ (جاری ہے)

ردائی ڈائری

تیرے لبوں کا حصار ڈھونڈتے ہیں
فیضان اب تو آ جاؤ کہ شام گزرنے کو ہے
رات بڑی ظالم ہوتی ہے دسمبر کی
ناگ بن کر ڈستی ہے
درد بڑھا جاتی ہے
تم سے محبت کرنے کی کیا ہی سزا ہے

مہوش جواد کی ڈائری سے

غزالہ جلیل کی نظم

کچھ لمحے دسمبر کے
ہم نے یوں گزارے ہیں
موسم تیری یادوں کے
تصویر میں اتارے ہیں
کیکپاتے ہونٹوں سے
ڈگمگانی دھڑکن سے
ہم نے اپنے خالق سے
بس دعا یہی مانگی ہے
اب کے بار دسمبر میں
جب بادل اتریں تو
بس یہی تمنا ہے
دشمنوں کی سازش ہیں
بس اسی گزارش میں
زندگی کو جینے کا
اختیار مل جائے

ایم جے قریشی کی ڈائری سے

پروین شاکر کی نظم

دسمبر کے مہینے میں
وہ اپنے شہر واپس جا رہا تھا
میں اس کے سامنے گم صمیم کھڑی تھی
یکایک ریل کی سیٹی بجی تھی
مجھے اس نے خدا حافظ کہا تھا
کھلی کھڑکی سے تاحد بصارت
وہ اپنے ہاتھ لہراتا جا رہا تھا
سمٹ کر چھکڑے نقطے بن گئے تھے
اسٹیشن پر میں تنہا رہ گئی تھی

سارہ احسان کی ڈائری کی

فیضان ہاشمی کی نظم

تیری یادوں نے مجھے اکثر رلایا ہے
تیری باتوں نے اکثر مجھے ستایا ہے
دسمبر کی سرد ہواؤں میں گونجتی ہے
تیری ہلسی ردھم بن کر ایسے ساز چھیڑتی ہے
کہ میرا دل رقص کرتا ہے
کہ جنون جیسے جلتا ہے
کہ جذبات مچلتے ہیں
کہ بانہیں ترستی ہیں
لب بے ساختہ پھڑ پھڑاتے ہیں

اے میرے خدا مجھ کو
میرا پیار مل جائے

من میں جگا جائے کوئی بھیگی ہوئی سی یاد
دسمبر میں وہ دے جائے
دسمبر جا رہا ہے بس
اسے کہہ دو کہ آجائے
اسے کہہ دو کہ آجائے

مہرین کنول کی ڈائری سے

پروین شاکر کی خوب صورت نظم

سال 2015 کے لیے الوداعیہ نظم

دھنک ناز کی ڈائری سے

نوشابہ زگس کی نظم

گزشتہ سال کی ان آخری گھڑیوں میں

اپنے آپ سے اور آپ سے

کچھ اور کہنا تھا مگر لگتا ہے

اب کی بار بھی خاموش ہی رہنا پڑے گا

کہیں کس سے کہ آنکھیں بند کر لو

سنی کو ان سنی کر دو

جو ہوتا ہے اسے تقدیر کا لکھا سمجھ لو

جو کھٹ پٹی تماشہ ہر طرف سے دورشہ ہی جانو

یہ آشوب زمانہ ہے سزا سمجھو شکست خواب لکھو

اگر کچھ کر سکو کرنا ہی چاہو تو بس اتنا

شریک حال ہو کر تالیاں اس زور سے مارو

کہ بے حس تہقہبے آنسو کی صورت

زندگی کے رخ پر جم جائیں

بہت کچھ کھو دیا گزرے دنوں میں

جو کھو دیا ہے وہ اب واپس نہ ہوگا

چلو آؤ دعا مانگیں

کوئی چارہ، کوئی تو چارہ گرہو

وہ اک ننھا دیا جو دل کے آنگن میں کہیں

اب بھی فروزاں سے

کبھی بجھنے نہ پائے، یہ ظلم و جہل کا موسم گزر جائے

محبت زندگی کا نام ہو اور

سال نو کا آغاز ہو جائے

☆.....

وہ جا چکا ہے
مگر جدائی سے قبل کا
ایک نرم لمحہ
تھہر گیا ہے
میری ہتھیلی کی پشت پر
زندگی میں
پہلی کا چاند بن کر

شائستہ جوادی کی ڈائری سے

فضیلہ اشتیاق احمد فیضی

دسمبر میں یونہی اکثر

کبھی چپ چاپ پہروں یونہی

اس کی راہ تکتا کبھی دل میں ابھرتی

کسی بے نام خواہش پر خود اپنے آپ سے لڑنا

ہزاروں اُن گنت آرزوؤں کو جمع کرنا

اور سلگتی شام کے آتش دان میں جلا دینا

کوئی ان دیکھا آنسو گال پر پھر بہنے لگتا ہے

کوئی امید کہتی ہے کسی سے تو یہ تم پوچھو

کہ آخر کب وہ آئے گا

ہزاروں ان کہے وعدے

وہ آخر کب نبھائے گا

اسے کہہ دو کوئی جا کر دسمبر جا رہا ہے

خدارا! اب تو لوٹ آئے

کسی سوئے ہوئے لمحے کو

ردا ڈائجسٹ 199 دسمبر 2015ء

READING
Section

اشعار

دھنک ناز _____ کراچی
آج پھر تیری یاد مانگی تھی
آج پھر وقت ہم کو ٹال گیا
تو دسمبر کی بات کرتا ہے
ہمارا تو سارا سال گیا

صباحر _____ ہارون آباد
اداس راتوں میں تیز کافی کی تلخیوں میں
وہ کچھ زیادہ ہی یاد آتا ہے سردیوں میں
مجھے اجازت نہیں اسے پکارنے کی
جو گونجتا ہے لہو میں سینے میں دھڑکنوں میں

رامین ناز _____ بہاولپور
تیری یاد اور برف باری کا موسم
سلگتا رہا دل کے اندر اکیلے
ارادہ تھا جی لوں گا تجھ سے پھڑک کر
گزرتا نہیں اک دسمبر اکیلے

نوشین مدثر _____ لاہور
خنک رت میں تنہائی بھی چوکھٹ پر کھڑی ہے
جاڑے کی اداس شام ہے دسمبر آن پہنچا ہے
رابعہ منیر _____ سرگودھا
جہاں جہاں تیری خوشبو کے رنگ بکھرے ہیں
وہاں وہاں پھر وہی سردیوں کا موسم ہے
وہ مجھ کو سونپ گیا قربتیں دسمبر میں
درخت جاں یہ وہی سردیوں کا موسم ہے

سبا گل _____ رحیم یار خان
لکھو تو کیسے لکھوں کرب و بلا؟
میرے قلم میں میرے خوں میں اشک بہتے ہیں
مریم ماہ منیر _____ لاہور
کبھی یاد آئے میری وفا اپنی جفا بھی سوچنا
اعتراف جرم نہ کر سکو دل میں ہی پچھتا لینا
ریمل آرزو _____ اوکاڑہ

پرندوں کا بسیرا تھا جس شجر پہ وہ نہ رہا
اب کے قیامت کی طرح برسی ہے برسات
فرزانہ شوکت _____ کراچی
دل میں جو بات ہے وہ دل میں دبی رہنے دو
مرے ہونٹوں پر شکایت رکی رہنے دو
جانے دو مجھ کو تجھے میری محبت کی قسم
ایک ہلکی سی ملاقات کبھی رہنے دو
ریمان نور رضوان _____ کراچی

منظر بدل گئے پس منظر بدل گئے
حالات اپنے شہر کے یکسر بدل گئے
پہلے سے خدو خال نہ پہلے سے ہیں خیال
ہم کتنے ایک سال کے اندر بدل گئے

عانیہ نیازی _____ ربوہ
تمہارے بعد گزرا ہر مہینہ بے رحم لیکن
نومبر مار ڈالے گا دسمبر کا خدا جانے

خدیجہ فیصل آباد

یہ جان کر بھی کہ دونوں کے راستے تھے الگ
عجب حال تھا جب اس سے ہو رہے تھے الگ
خیال ان کا بھی آیا تجھے جاناں
جو تجھ سے دور بہت دور جی رہے تھے الگ

ثمرن لاہور

میں تو یہ جانتا ہوں کہ جس شب مجھے چھوڑ کر تم گئے
آسمانوں سے شعلہ نکلتا رہا چاند جلتا رہا
یہ دسمبر کہ ہمیں کڑی دھوپ بھی ٹیٹھی لگنے لگے
تم نہیں تو دسمبر سلگتا رہا چاند جلتا رہا

نادیہ عمران کراچی

کیا ضروری ہے ہاتھوں میں تیرا ہاتھ بھی ہے
چند یادوں کی رفاقت ہی بہت کافی ہے
لوٹ چلتے ہیں اس پل سے گھروں کی جانب
یہ تھکن اتنی مسافت ہی بہت کافی ہے
ماہ جاوید کوئٹہ

میں تجھ سے اپنی ملاقات کا لمحہ یاد رکھتی ہوں
جدائی بھول جاتی ہوں وصل کو یاد رکھتی ہوں
میں یوں تو بھول جاتی ہوں تمہارا بے وفا لہجہ
لیکن الفاظ کہے تمہارے میں ہر دم یاد رکھتی ہوں

مسکان چناب نگر

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کیا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

امینہ کراچی

جہاں سب رشتے ناتے فقط دولت کی خاطر ہیں
نہ ہو پاس مال و زر تو دنیا بھول جاتی ہے
جو اپنے رب سے غافل ہیں نہیں معلوم انہیں یہ بات
خدا پھر یاد آتا ہے مصیبت جب بھی آتی ہے

عابدہ ظہور گلگت

پھر وہی غم ہے، وہی شام ہے، تنہائی ہے
زندگی پھر مجھے کس موڑ پہ لے آئی ہے
کون ہے میرے تخیل کی اڑانوں میں رواں
جس کی خوشبو میری نس نس میں سمٹ آئی ہے

سید بشارت شاہ کراچی

کتنے ہی درد بہانے سے میرے پاس آ کر
دیکھتے ہیں کہ میری شام سہانی تو نہیں

عانی ایمان ربوہ

منظر بدل گئے پس منظر بدل گئے
حالات اپنے شہر کے یکسر بدل گئے
موسموں کے بدلنے پر بھی حیراں نہ ہوئے تھے ہم
اب سوچتے ہیں کتنے کیلنڈر بدل گئے

حناعلی ملتان

وہ پاس رہ کے بھی رکھے گا فاصلہ مجھ سے
یوں میرے وہ عشق کو بے مثال کر دے گا
لیٹ کے غم دنیا میں دے گا اپنا غم
وہ اس طرح سے مجھے مالا مال کر دے گا
نوشین لاہور

جو دل پہ بوجھ ہے اتار دو
دو دن زندگی کے ہیں ہنس کر گزار دو
میں تم کو اپنی جان دوں گی سب کچھ
بدلے میں تم مجھ کو اپنا پیار دو

امبرین اسلام آباد

اب کے برس کچھ ایسی تدبیریں کرتے ہیں
مل کے اک شہر محبت تعمیر کرتے ہیں
کچھ خواب یقین کی سرحد پر آ پہنچے
آنکھ کھلنے سے پہلے ان کی تعمیر کرتے ہیں

☆.....

اس ماہ میں

اس ماہ کا اقتباس

فیصلہ

فیصلے کا لمحہ بڑا مبارک لمحہ ہوتا ہے۔ زندگی میں بار بار یہ لمحات نہیں آتے۔ صحیح وقت پر مناسب فیصلہ ہی کامیاب زندگی کی ضمانت ہے۔ اگر غلطی سے کوئی غلط فیصلہ ہو بھی جائے تو اس کی ذمہ داری سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ اپنے فیصلے اولاد کی طرح ہیں۔ دنیا کی تاریخ بغور دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ تاریخی فیصلے اکثر غلط تھے مگر تاریخی تھے۔

تقدیر اپنا بیشتر کام انسانوں کے اپنے فیصلے میں ہی مکمل کر لیتی ہے انسان راہ چلتے چلتے دوزخ جا پہنچتا ہے یا وہ فیصلے کرتے کرتے بہشت میں داخل ہو جاتا ہے بہشت یا دوزخ انسان کا مقدر ہے۔ لیکن یہ مقدر انسان کے اپنے فیصلے کے اندر ہے۔

(واصف علی واصف "کتاب: دل، دریا سمندر) روشنی فاطمہ۔ کراچی

اس ماہ کی غزل

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں اور زمینوں میں وہ نکلے میرے ظلمت خانہ دن کے یکنوں میں مہنے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں مجھے روکے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

محبت کے لیے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا یہ وہ لے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آہنگینوں میں خموش اے دل بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا ادب پہل قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں برا سمجھوں انہیں؟ مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا کہ میں خود بھی تو ہوں اقبال اپنے نکتہ چینوں میں (علامہ محمد اقبال)

سحر مبین۔ فیصل آباد

اس ماہ فلمیز یا

لالی وڈ کا تصور کرتے ہی ذہن میں طرح طرح کے بد معاش اور گجر آ جاتے ہیں اور گولیوں کی کھن گرج سنا کی دیتی ہے۔ ارے آپ حیران نہ ہوں، آج کل ہماری فلمی دنیا پر کسی مافیائے قبضہ نہیں کیا ہوا بلکہ فلمی دنیا کے لوگ مافیا اور بد معاشوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں۔ جتنی ورائٹی کے گجر آج کل فلم انڈسٹری میں آپ کو فلم کی شوٹنگ کرتے ہوئے نظر آئیں گے اتنے کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملیں گے۔ ان کا حلیہ دیکھ کر پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں، کیا ہوا اگر انہوں نے بڑی بڑی موچھیں لگا رکھی ہیں اور وہ کلاشکوف اور گنڈ سا پکڑے گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے ہیں۔ آخر ہیں تو ہمارے ہیروز جو اکثر و بیشتر میڈیا پر کہتے نظر آتے ہیں کہ ایک جیسے کردار اور گجر کے

ناموں پر بننے والی فلموں میں کام نہیں کریں گے مگر یہ بے چارے بھی کیا کریں قول و فعل میں تضاد تو اب ہمارا قومی فریضہ بن چکا ہے۔

فلم کی کہانی پر نظر ڈالیں تو مزید دلچسپ صورت حال سامنے آتی ہے۔ ہیرو بے چارہ عموماً اپنے باپ کو زندہ سلامت نہیں دیکھ پاتا۔ یا تو وہ اس کے دنیا میں آنے سے پہلے دنیا سے جا چکا ہوتا ہے یا پھر ہیرو کے بچپن میں ہی ولن کا گروپ اس کو قتل کر دیتا ہے۔ ہیروئن ایسی سچویشن میں ولن کی بیٹی ہوتی ہے اور باپ کے ظلم کی داستان سے متاثر ہو کر نہ صرف ہیرو سے شادی کر لیتی ہے بلکہ اپنے باپ کو پھنسوانے میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے اگر ولن کا ضمیر جاگ جائے تو اختتام میں وہ خود ہی اپنے زندگی ختم کر لیتا ہے۔ ورنہ ہیرو تو اس کو مار ہی دیتا ہے کیونکہ اس کی ماں اسے اپنی بیوہ زندگی کی قسم دے دیتی ہے۔ یہ ہماری فلموں کا ہی خاصا ہے کہ ہیرو جتنی بھی بدتمیزی اور چھچھوری حرکتیں کرے، یہ اس کی شوخ طبیعت کہلاتی ہے اور وہ جتنے بھی قتل اور تباہی کرے وہ اس کی مظلومیت ثابت کرتی ہے جب کہ ہیروئن ایک سین میں بوب کٹ اور ایک سین میں لمبی چٹیا میں نظر آتی ہے۔ اسی طرح اگر فلم ایکشن کے بجائے رومانوی ہو تو آدھی فلم میں ہیرو کے پیچھے ہوتی ہے اور عجیب و غریب انداز میں ناچتی گاتی پھرتی ہے۔ جب دونوں راضی ہو جاتے ہیں تو آخر میں ظالم سماج بیچ میں آ جاتا ہے۔ جس کا انجام کبھی منفی نہیں ہوتا۔ فلم میں شروع سے آخر تک سب کچھ حقیقت سے دور ہوتا ہے لیکن پولیس حقیقت کی طرح ہمیشہ آخر میں اس وقت آتی ہے۔ جب ہیرو اپنی تمام بھڑاس نکال چکا

ہوتا ہے اور ہیرو کے ہاتھوں نہ صرف کئی قتل ہو چکے ہوتے ہیں بلکہ امن و امان کی صورت حال بھی خراب ہو جاتی ہے لیکن اس پر کوئی مقدمہ نہیں چلتا اور چل جائے تو وہ باعزت بری کر دیا جاتا ہے کیونکہ ہیرو ہمیشہ ہیرو ہی رہتا ہے۔

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

اس ماہ کی کرنیں

☆ صبر ایمان سے ایسا ملا ہوا ہے جیسے سزجہم سے۔
☆ کسی انسان کے دل میں ایمان اور حسد اکٹھے نہیں رہ سکتے۔

☆ اخلاق وہ چیز ہے جس کی قیمت کچھ نہیں مگر اس پر انسان خریدا جاسکتا ہے۔
☆ جس دل میں برداشت کی ہمت ہو وہ دل کبھی شکست نہیں کھاتا۔

☆ خاموشی ایسا درخت ہے جس پر کبھی کڑوا پھل نہیں لگتا۔

☆ بے شک مشکل وقت بتا کر نہیں آتا مگر سکھا کر اور سمجھا کر بہت کچھ جاتا ہے۔

☆ اتنا نرم نہ بن جاؤ کہ نچوڑ لیے جاؤ اور اتنا سخت بھی نہ بنو کہ توڑ دیئے جاؤ۔

☆ جو لوگ تذبذب اور جھجک سے کام لیتے ہیں۔ وہ زندگی میں شاید ہی کامیاب ہوتے ہیں۔

☆ اگر انسان صبر اور تحمل کا مظاہرہ کرے تو کوئی کام ایسا نہیں جو وہ نہ کر سکے۔

☆ آنسو بہا کر نہیں آنسو چھپا کر جیو۔
فرزانہ شوکت۔ کراچی

اس ماہ کا قطعہ

نجانے یہ انسان کو کیا ہوا ہے؟
کسی کی یقیناً اسے بددعا ہے

﴿ کیونکہ ان کے نزدیک پردہ آنکھوں کا ہوتا ہے۔

☆ کیا عورت کو بے وقوف بنانا واقعی ناممکن ہے؟

﴿ جی ہاں۔ کیونکہ بے وقوف کو بے وقوف کیونکر بنایا جاسکتا ہے۔

☆ دولہا کو آخر گھوڑے پر ہی سوار کیوں کیا جاتا ہے، گدھے پر کیوں نہیں؟

﴿ کیونکہ قانون کی رو سے ایک گدھا دوسرے گدھے پر سواری نہیں کر سکتا۔

☆ سب سے زیادہ استعمال ہونے والے گھریلو ہتھیار کا نام بتائیے؟

﴿ سینڈل۔

☆ محبوبہ اور بیوی کے بولنے میں کیا فرق ہے؟

﴿ محبوبہ بولتی ہے تو کانوں میں رس گھلتا محسوس ہوتا ہے جب کہ بیوی بولے تو ڈرم بجتا محسوس ہوتا ہے۔

☆ بیوی کا کون سا روپ خطرناک ہوتا ہے۔

﴿ جب اس کے ہاتھوں میں کٹی شاپنگ بیگ ہوں اور پرس میں خوفناک بل۔

☆ بہترین عشقیہ شاعری کہاں ملتی ہے؟

﴿ کالج اسٹوڈنٹس کی فائل میں۔

☆ آخر وہ کب میری بات سمجھیں گے۔

﴿ جی..... بڑھاپے میں۔

صباحر۔ ہارون آباد

☆.....

کھلائے حرام آدمی کو یہ انسان

یہ قہر خدا گر نہیں ہے تو کیا ہے؟

راؤ تہذیب حسین تہذیب۔ رحیم یار خان
اس ماہ کا افسانچہ

اس کے بارے میں سوچ کر اکثر میرا دل دھڑک اٹھتا تھا کہ نہ جانے وہ کیسا ہوگا؟ جیسے جیسے اس کے آنے کے دن قریب آرہے تھے میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ بظاہر میں سب کے سامنے ہنستی مسکراتی رہتی مگر اندر سے میرا دل وسوسوں سے بھرا رہتا۔ اب تو سب کو میری پریشانی کا علم ہو گیا تھا اور سب گھر والے میری طرف طنزیہ نظروں سے دیکھتے تھے کیونکہ اس کے آنے میں بس کچھ ہی دن رہ گئے تھے۔

میری نیند اور بھوک سب اڑ گئی تھی۔ بس ہر وقت اللہ سے یہی دعا مانگا کرتی کہ وہ میرے حق میں بہتر ہو بالکل میرے سپنوں جیسا آخر کار وہ دن بھی آ گیا اس دن میں صبح سے پریشان تھی ہر آہٹ پر میرا دل دھڑک اٹھتا کہ شاید وہ آ گیا ہے بالآخر وہ تشریف لے ہی آیا۔

اے میرے پیارے ”رزلٹ“ شکر ہے کہ تم نے مجھے مایوس نہیں کیا۔

عانیہ نیازی۔ ربوہ

اس ماہ آپ بھی پوچھیے

☆ شیر جنگل میں دھاڑتا ہے اور شوہر؟

﴿ خالی گھر میں۔

☆ سنگھار کب غضب ڈھاتا ہے؟

﴿ جب اس کا خرچہ مرد کی جیب پر پڑتا ہے۔

☆ آج کل کی لڑکیاں ڈارک گلاسز کے چشمے

کیوں استعمال کرتی ہیں؟



حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ زمانہ قریب ہو جائے گا، علم کم ہو جائے گا، فتنے ظاہر ہوں گے اور بخل (کنجوسی) ڈال دی جائے گی (کہ لوگ خیرات اور صدقات میں کمی کرنے لگیں گے) اور ہرج کی کثرت ہوگی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا کہ ہرج کیا ہے؟ فرمایا کہ قتل ہے۔ (حسن ابی داؤد شریف)

قابل توجہ

☆ دوسروں کے چہروں پر مسرتوں کے دیئے روشن رکھنے کے لیے اپنی خوشیاں قربان کر دینا حوصلے اور ہمت کا کام ہے۔
☆ کبھی کبھی ہم دانستہ یا نادانستہ غلط راہوں پر نکل جاتے ہیں کبھی خود کو اور کبھی دوسروں کو آزمانے کے لیے۔

☆ دوسروں سے تو ہم کم دھوکا کھاتے ہیں البتہ اپنے آپ کو زیادہ دھوکا دیتے ہیں خود فریبی انسانوں کو لگا ہوا ایک بڑا روگ ہے۔

☆ محبت سب سے کرو مگر اعتبار چند لوگوں پر۔
☆ جو چیز حاصل نہیں ہو سکتی اس کی خواہش فضول ہے۔

☆ جو شے دکھ پہنچائے اور پریشانی میں اضافے

کا سبب بنے اس سے تعلق توڑ لینا ہی بہتر ہے۔

صباحر۔ ہارون آباد

غم حسینؑ

غم حسینؑ میں جینا سے زندگی کرنا
غم حسینؑ سے ہٹ کر بھی کوئی جینا ہے
فرات آج بھی نوحہ کناں ہے کربل میں
کہ بجز شبیرؑ کے پانی کبھی نے پینا ہے
سباس گل۔ رحیم یار خان
فرمان حضرت علیؑ

اپنا سراونچا رکھو کہ تم کسی سے نہیں ڈرتے
لیکن اپنی نگاہیں نیچے رکھو تا کہ پتا چلے تم ایک
باعزت گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔

☆ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ جلد بازی کرنے والا
انسان نقصان نہ اٹھائے اور ایسا ہو نہیں سکتا کہ صبر
کرنے والا ناکام ہو جائے۔

☆ جس نے تجھے تیرے عیب بتائے اگر تجھے
عقل ہو تو بے شک اس نے تجھ پر احسان کی انتہا کر دی۔
☆ جو ذات رات کو درختوں پر بیٹھے پرندوں کو
نیند میں گرنے نہیں دیتی۔ وہ ذات انسان کو کیسے
بے یار و مددگار چھوڑ سکتی ہے۔

ہاجرہ امین خان ہاجی۔ پشاور

قسمت

کسی چیز کے نہ ملنے پر اپنے آپ کو بد قسمت

کہنے کے بجائے یہ کہنا چاہیے کہ نہ ملنا شاید یہ ہمارے لیے بہتر ہو۔

فرزانہ شوکت۔ کراچی

شیطان کے دل میں داخل ہونے کے نوراستے ہیں

1۔ غصہ، فحاشی

2۔ حسد اور حرص

3۔ پیٹ بھر کر کھانا

4۔ مال و دولت

5۔ مذہبی تعصب

6۔ دنیا کی زیب و زینت کی تمنا

7۔ لوگوں سے امیدیں رکھنا

8۔ جلد بازی

9۔ بخل جو کنگال ہونے سے ڈراتا ہے۔

سیدہ عباب سمیع۔ کراچی

آئینہ اور موٹاپا!

موٹے لوگوں کو آئینے سے بہت دلچسپی ہوتی ہے۔ آئینہ دیکھ کر نہ جانے کیوں انہیں اپنے مٹاپے کا احساس ہوتا ہے اور اگر کسی کو نہ ہو تو لوگ دلا دیتے ہیں۔ موٹا انسان آئینے کے سامنے کھڑا ہو جائے تو ان کی ہنسی خود بخود نکل پڑتی ہے۔ آئینہ دیکھتے ہی وہ سوچتا ہے کہ سامنے انسان کھڑا ہے یا گینڈا۔ پھر جب سانس لیتا ہے تو اس کی جان میں جان آ جاتی ہے اور خود کو غبارے کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔ آئینہ موٹے آدمی کا عکس اس طرح پیش کرتا ہے جیسے کوئی عاشق اپنی محبوبہ کو گوبھی کے پھول کا گلہ ستہ ڈیکوریشن پیس کے طور پر۔ موٹا آدمی آئینے کے سامنے اپنی مرضی سے کھڑا تو ہو جاتا ہے لیکن پھر اسے ہٹانا مشکل ہو جاتا ہے۔ موٹا شخص کھانے کے بعد آئینے کے سامنے ضرور آتا ہے تاکہ اسے پتا ہو کہ کہیں ساری محفل کا کھانا وہ

اکیلے تو نہیں کھا گیا۔ اس لیے وہ اپنا پیٹ اور ویٹ آئینے کے سامنے دیکھ کر اندازہ لگاتا ہے کہ کسی اور محفل میں شرکت کی گنجائش ہے کہ نہیں۔ موٹا اپنا موٹاپا کم کرنے کے لیے غصہ کم اور خوش اسلوبی سے زیادہ پیش آتا ہے۔

موٹے لوگوں کی یہ شرافت اور ظرافت ہے کہ وہ آئینے سے حسن نہیں مانگتے کیوں کہ انہیں بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ جواب ہمیشہ نفی میں آئے گا۔ موٹا جب بھی کسی لڑکی سے لفٹ مانگتا ہے تو ہر لڑکی یہی کہتی ہے کہ آئینہ دیکھا ہے؟ شاید اس لیے موٹے افراد آئینے کے سامنے مگر مجھ جتنا منہ کھولتے ہیں کہ شاید کوئی بات تو ہڑپ کر سکیں لیکن ان میں سے بہت سے لوگ وقفے وقفے کے بعد سمارٹ ہونے کے ٹوکے استعمال کر کے آئینے کے سامنے آ کر اپنی صحت کا اندازہ لگاتے ہیں۔ کسی موٹے کو دولہا بنا کر آئینے کے سامنے کھڑا کر دیا جائے تو آئینہ بھی شرم محسوس کرتا ہے۔ اس لیے دولہا بار بار یہ سوچتا ہے کہ مٹاپا صحت کے لیے مضر ہے۔ دنیا میں اگر موٹے ہیں تو موٹیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ کوئی بھی موٹی آئینے کے سامنے میک اپ کرنے کھڑی ہو جائے تو کسی دوسری خاتون کو موقع نہیں ملتا کہ وہ آئینے کے سامنے آسکے۔ ہر لڑکی اگر موٹی نہ ہو تو آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر یہی سوچتی ہے کہ کاش میں کترینہ کیف یا ایشاء دیول ہوتی اور ہونٹوں کے نیچے کا جل کا ٹیکہ لگا کر اپنے حسن کو نظر لگنے سے بچانی۔ آئینہ دو قسم کے لوگوں کو سچ بتاتا ہے۔ ایک وہ جو آئینہ دیکھتے ہیں۔ دوسرے وہ جو آئینے کے سامنے سے ہٹتے نہیں لیکن آئینے سے حسن بانگنا موٹے لوگوں کے لیے ایسا ہے جیسے بچن فلمی فیملی سے ایثار یارائے کے حسن کا راز معلوم کرنا۔

☆ وہی صحیح معنوں میں آزاد ہیں جو خواہشوں کے غلام نہیں ہیں۔

☆ کامیابی کا دار و مدار آپ کی محنت اور کوشش پر ہے۔ (ٹیکسپیٹر)

☆ لگن کے بغیر کسی میں بھی عظیم ذہانت پیدا نہیں ہو سکتی۔ (ارسطو)

☆ انسان ہو کر ایسے کام نہ کرو جس سے انسانیت داغدار ہو۔ (وکر ہوگو)

☆ مسائل جہالت کے ذریعے طے نہیں ہو سکتے۔ (نچمن ڈسٹرائلی)

☆ جہاں صرف جہالت ہی خوش رکھ سکتی ہو وہاں عقل مند ہونا بے وقوفی ہے۔ (تھامس گرے)

☆ فتنہ انگیز سچائی سے مصلحت آمیز جھوٹ بہتر ہے۔ (شیخ سعدی)

☆ مسکراتا چہرہ معمولی کھانے کو بھی دعوت بنا دیتا ہے۔ (جارج ہرلوٹ)

☆ ترتیب، کائنات کا پہلا اصول ہے۔ (پوپ)

☆ اپنے آپ پر اعتماد رکھنے والے ہی فتح حاصل کرتے ہیں۔ (ول کا کس)

☆ عشرت شفیق۔ کراچی

سائنسی معلومات

☆ انسان کے مرنے کے بعد اس کا دماغ دو سے چار گھنٹے تک کام کرتا ہے۔

☆ انسانی دل کے چار خانے ہیں۔

☆ انسان کا دل ایک منٹ میں 72 مرتبہ دھڑکتا ہے۔

☆ انسان کے خون میں 90 فیصد پانی ہے۔

☆ نارمل انسان کے جسم کا درجہ حرارت 98.4

فارن ہائیٹ ہوتا ہے۔

روشنی فاطمہ فیصل۔ کراچی

☆.....

مٹا پاکم کرنے کے لیے موٹے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ایکس سائز کے ساتھ گنتی شروع کرتے ہیں تو گنتی ان کے لیے وبال جان بن جاتی ہے۔ گنتا بھی ان کے لیے مشکل کام ہے اور چلنا بھی دشوار ہے۔ جیسے خواتین کے لیے چپ رہنا۔ اس لیے تو کہتے ہیں کہ عکس نہ ہو تو آئینہ ٹوٹ نہ جائے۔ اسی لیے موٹی خواتین بھی آئینے سے اتنی محبت کرتی ہیں جیسے کوئی سیاستدان عوام سے..... کیونکہ سیاستدان آئینے کو بھی آئین کے مطابق دیکھتے ہیں۔ اسی لیے یہ آئینے کا حوصلہ ہے جو موٹے کو سامنے دیکھ کر کوئی سوال نہیں کرتا۔ اگر آئینے کے پاس زبان ہوتی تو ہر سوال ایسے لگتا، جیسے بزم طارق عزیز شو میں پوچھے گئے سوال۔ مثلاً ”ہال کا سب سے وزنی مہمان“۔ بعض موٹوں کی نفسیات آئینے کے سامنے آکر پتہ چلتی ہے کہ موٹے ہیں یا کھوٹے ہیں۔

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

سوا سیر

چھ نوجوان دوست کالج سے واپس آرہے تھے۔ ان کے آگے تین لڑکیاں جارہی تھیں۔ وہ لڑکے ان کے پیچھے چلنے لگے۔ اچانک ایک لڑکے نے بلند آواز میں کہا: ”یار! ہم تو چھ ہیں اور لڑکیاں تین، فیصلہ کیسے ہوگا؟“ ان میں سے ایک لڑکی جو کچھ زیادہ تیز بھی پلٹ کر بولی: ”فکر مت کرو، ہم تین ہیں تو کیا ہوا لیکن سینڈلوں کی تعداد چھ ہی ہے۔ فیصلہ ٹھیک ٹھاک اور انصاف سے ہوگا۔“

دھنک ناز۔ کراچی

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ جس طرح چاند کے بغیر رات ادھوری ہے

اسی طرح علم کے بغیر ذہن۔ (سر سید احمد خان)

فراق کی کہنا

خلیفہ چہارم حضرت علیؓ

سب اسم گرامی عزیز تر ہیں لیکن
سب ناموں میں پیارا ہے نام علیؓ کا
تندی حالات سے نہ کھراؤں میں ہرگز
میرے لبوں پر ہے وظیفہ نادر علیؓ کا
ابوطالبؓ کا تخت جگر اور ہے فارح خیر
ولیوں کا سردار ہے داماد نبیؐ کا
حسنؓ کی حلاوت تو اعجاز رسولؐ ہے
کربلا ہے کرشمہ حسینؓ ابن علیؓ کا
ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ و ابوذرؓ
دلکش کتنا ہے حلقہ یارانِ علیؓ کا
اغیار کے حوصلوں کو یوں توڑوں گا میں
مشکل میں لگا کر اک نعرہ علیؓ کا
روز محشر حساب سے بری ہو جاؤں گا
کام آئے گا میرے جو ہر چہ علیؓ کا
مشکلیں، مشکل میں پھر پڑیں گی ضرور
جب خدا کو دوں گا میں واسطہ علیؓ کا
میں محبت علیؓ ہوں شان علیؓ کہوں گا
اور جھوم کر مون کھاؤں گا صدقہ علیؓ کا

حافظہ مون شاہ

سنو جاناں

نہ جانے کتنے دمبر بیت گئے
آنکھوں کی دہلیز پر سجے سپنے ٹوٹ گئے

اب تو لوٹ آؤ!

بنا تمہارے جب دمبر آتا ہے
میری آنکھوں کو بہت آزما یا ہے
ٹھنڈی، اداس، لمبی راتیں
تمہیں یاد کرتے گزر جاتی ہیں
دمبر جب بھی آتا ہے

مجھے نئے سرے سے اداس کر جاتا ہے

راجہ افضل خان

غزل

شب فراق، شب انتظار کیا کہنے
تیرا وہ مجھ سے تھا جو اقرار کیا کہنے
رُکی ہوئی ہیں تمنا کی آخری سانس
وہ میری نیند، تیرا انتظار کیا کہنے
ہوئے شام کی کبھی سسکیاں سنیں تم نے؟
ٹڑتے ہونٹوں پہ تیرا نام تیرا اختیار کیا کہنے
وفا کے نام پر بیٹھے رہے ہم آج تلک
جفا کی حد وہ تیری اور تیرا فرار کیا کہنے
جو مل گیا تمہیں ہم سا تو بات کرنا تم
گل و گلزار ہوں جس پر شار کیا کہنے
منایا ہجر کا موسم بھی مسکراتے ہوئے
غم فراق میں گل ایسا نکھار کیا کہنے

سباس گل

خبر نہیں جاناں

تمہیں خبر بھی نہیں ہے جاناں

تمہاری چاہت میں
میں نے دنیا تیاگ دی ہے
تمہارے ہونٹوں کی مسکان پہ

اپنے دل کی زمین پہ
میں محبت کی بازی کھیل چکی ہوں
تمہیں خبر بھی نہیں ہوئی ہے
تم اپنی دنیا میں مگن تھے

میں تمہاری چاہت میں تھی ڈوبی
تم زندگی کے سو دوں میں تھے اچھے
میں تمہاری محبت کی ڈور میں تھی ابھی
بہت ہی نازک سی ڈور تھی
حسن کو ہماری چاہت ہی تھی بچا سکتی
پر میں اکیلی نہ کر سکی کچھ
کچھ تمہیں بھی نہ تھی فرصت
کس بل محبت کی دوڑ ٹوٹی
تمہیں خبر بھی نہیں ہے جاناں!

مریم ماہ منیر

لظم

وہ خود ملنے نہیں آتا
یادوں کے سائے بھیج دیتا ہے
آنکھوں کا درپن مسکن اس کا
پلکوں پر میری سو سنے اگاتا ہے
چرا کر انہی نیندیا
اشکوں کے سمندر میں رہتا ہے
وہ خود ملنے نہیں آتا

یادوں کے سائے بھیج دیتا ہے
بن کے خوشبو میری سانسوں میں اترتا ہے
بن کے لہو میری رگوں میں بھگتا ہے
بن کے دھڑکن دل میں دھڑکتا رہتا ہے
وہ خود نہیں آتا یادوں کے سائے بھیج دیتا ہے

اس کی یادیں حصار میں لیے رہتی ہیں
سلکتی آنکھیں برسات کیے رہتی ہیں
زیست کی تاریک راتوں میں جگنو
بن کے دکتی رہتی ہیں

بن کے ارمان میری خواہشوں میں رہتا ہے
وہ خود نہیں آتا یادوں کے سائے بھیج دیتا ہے
شہلا گل سحر

ہاں یہی محبت ہے

تیری اس جھلک کا بے تاب رہنا
تیری نظر کرم کے انتظار میں رہنا
تیری آواز کی شیرنی کو گھنٹوں محسوس کرنا
تیری باتوں کو پہر ہوں سوچتے رہنا
اپنے سائے میں تیرا عکس ڈھونڈتے رہنا
ہاتھوں کی لکیروں میں تیرا وجود تلاشتے رہنا
چپکے سے تیرے نام پر ایک پھول توڑ کر
کتاب میں رکھ لینا

ہوا کی سرگوشیوں میں تیرا نام سننا
بارش کی بوندوں میں تیرے لمس کو ڈھونڈنا
اپنے ارد گرد بس تجھے ہی محسوس کرنا
دھڑکنوں کا تجھے ہی پکارتے رہنا
کیا یہی محبت ہے؟
ہاں جاناں یہی محبت ہے

دانیہ آفرین

وہ اک لمحہ

تو چلو پھر وقت کی بھٹی میں
قید کر لیں وہ لمحہ
وہ اک لمحہ جس میں
ڈھیروں رنگوں کی کہکشاں تھی بکھری
جس میں یادوں کی حسین جلت رنگ تھی

گہری مسکراہٹوں میں چھپی ہوئی
وہ شوخیاں تھیں
وہ اک لمحہ

جس میں بندھی خوشیوں کی گہری ڈور تھی
جس میں بارش کے گرتے پہلے قطرے سی
ٹھنڈک تھی

سورج کی پہلی کرنوں سی پاکیزگی تھی
وقت کی کسی بھی راہ گزر پر

جب تم اداس ہو جاؤ
آنکھیں بن پانی سے لگیں یونہی بہنے
تو ہاں اسی لمحے

اپنی بند مٹھی کو کھول کر اس اک لمحہ
کو دیکھ لینا

ہونٹوں کی مسکراہٹ تمام دکھوں کو
سمیٹ لے گی

تو پھر چلو نا وقت کی مٹھی میں
قید کر لیں بس وہ اک لمحہ

فرزانہ شوکت

نظم

تیرے ہاتھ میں میرا ہاتھ ہو
باتوں باتوں میں دل کی بات ہو
میرا خیال ہو یا ہو خوش نہیں
بس یونہی مجھ کو چاہتے رہو
پیار کے بندھن میں بندھنا پڑے گا
تمہیں اقرار کرنا پڑے گا
یہ کس نے کہا کہ
دل کو میرے آزماتے رہو

سیدہ نور الصباعی

اداسیوں کا سفر

کبھی اداس بیٹھوں

گہرائی میں اتر جاتی ہوں
تیرے وجود کی سرد لہروں سے مچل جاتی ہوں
بنا کر خود کو تیرے وجود کا شاہکار

میں جملوں میں اتر جاتی ہوں
رفاقت محبت خلوص سے وفا کی چادر

پہنا کے خود تیرے وجود سے لپٹ جاتی ہوں
میں محبت کی چاہت کے پر پھیلائے انتظار کو

میں اداسیوں میں بھی اک خواب سجاتی ہوں
جو ملو میرے گہرے رویوں کی جھلمل سے

بس اتنا ہی رکھنا خیال لگی جو تھیس دل کو
میں نفسیات میں اتر کر زندگی سے چھوٹ جاتی ہوں

چاہوں جو نکلنا اس تھیس کی قربت سے
میں ہر روز اک گہرے سمندر میں ڈوبی جاتی ہوں

ملنا ہی ہے کیا میری ہستی کو سہارہ
انہی سوچوں کو لیے ویرانیوں کے آخر شہر پہنچ جاتی ہوں

زارا صدق قمر

تمہارے جنم دن پر!

آج جنم دن پر تیرے
کچھ لفظ میں لکھنے بیٹھا ہوں
سرمئی شام کے سایوں میں
تیری سالگرہ کے لمحوں میں
وقت سحر کے سائے میں
کچھ ذہن سے مٹ جاتے ہیں مگر
کچھ یاد نگہ میں رہتے ہیں
بس یہی سما یا سوچوں میں
کیا یاد تمہیں ہم آئیں گے
تیری سالگرہ کے لمحوں میں
تیرے جنم دن پہ یہ تحفہ ہے
میرے دل و جان ایک دعا ہے
سب کچھ ملے تمہیں وہ

ردا ڈائجسٹ 210 دسمبر 2015ء

READING
Section

جور ہتا ہے تیرے سپنوں میں
تیری سالگرہ کے لمحوں میں

ایس امتیاز احمد

غزل

چیخ کیسی ہے چار سو مجھ میں
کوئی کرتا ہے گفتگو مجھ میں
قید ہیں کتنے خواب آنکھوں میں
دن ہیں کتنی آرزو مجھ میں
حرف کاغذ پہ پھیل جاتے ہیں
پاتے رہتے ہیں جو نمو مجھ میں
کوئی انسان مجھ میں بکھرا تھا
چار اطراف ہیں عضو مجھ میں
مار ڈالوں گا ایک دن اس کو
ہے مغرور اک عدو مجھ میں
پھر کسی سائبان کا کیا کرنا
میں رہوں تجھ میں اور تو مجھ میں

سید ساجد ارسلو

غزل

دل میں ہو جب کام کی سچی لگن
پھر نکھر جائے گا اپنا فکر و فن
روزِ اول سے دل انسان میں
خواہشوں کا ہے سمندر موجزن
یہ عجب ہے پتھروں کے شہر میں
وہ لیے پھرتا ہے شیشے کا بدن
ہے اداسی کا سماں چاروں طرف
سہے سہے سے لگے سرود سخن
تیرے کاندھوں پر ہے مستقبل کا بوجھ
چھوڑ دے اے نوجوان یہ بانگین
تو نے ہی سنبھالنا ہے قوم کو

تیرے ہاتھوں میں ہے تعمیر وطن
ہول اٹھتا ہے مرے دل میں قمر
فصلِ گل میں دیکھ کر رنگ و چمن
ریاض حسین قمر

غزل

مسکراتے ہوئے زیست برہم ملے
زندگی میں بہت سے زخم ملے
میں کیسے بتاؤں پھر جان وفا
بچھڑے ہوئے لوگ بہت کم ملے
بہار آئی تو گلشن میں پھول کھلنے لگے
خزاں کے ساتھ بے وفا صنم ملے
تیری دید کی طلب تھی ورنہ میں
سلگتے ہوئے آنسو بھی چشم نم ملے
کوئی کہاں جدا ہوا یہ تو بتا جاوید
امید بھی ملنے کی مگر دوست برہم ملے

محمد اسلم جاوید

غربت گزیدہ

میں نے اک بچے کو دیکھا
میلا جسم کیلے کیڑے
پہٹ بڑا تھا نا نکلیں تیلی
پھسکی رنگت سو جا چہرہ
ہاتھ میں اک روٹی کا ٹکڑا
روکھا سوکھا بن سالن کے
کھانے کو تھا کتنا خوش تھا
اتنے میں اک کو آیا

اس پر جھپٹا

ٹکڑہ چھینا

یہ جاوہ جا

بچے کی آنکھوں میں آنسو تیرا ہے تھے

ردا ڈائجسٹ 211 دسمبر 2015ء

READING
Section

حسرت سے کوئے کو دیکھا
جو کیکر کے پیڑ پر بیٹھا بچے میں روٹی کو دبائے
خوب مزے سے کھانے لگا تھا
اس بچے کی آنکھوں کے آنسو
پانی کے چند قطرے نہ تھے
ایٹم بم تھے
جو گر اس ماحول پہ گرتے
ملیا میٹ اسے کر دیتے

ریاض حسین قمر

نظم

نیند بھی کیسی چور تھی
اکثر میری رات چرائیتی تھی
وہ جو تم سے ہو سکتی تھی
ساری بات چرائیتی تھی
رب سے تجھ کو مانگنے والی
ہر اک ساعت چرائیتی تھی
اچھا کیا جو وقتِ رخصت
تم اس چور کر لے گئے ساتھ

تھا کوئی اسے پیارا بہت
وہ سب سے کہتی رہتی تھی
کیا ہو گا وہ سنگ میرے بھی
اک امید لیے وہ پوچھتی رہتی تھی
اک دن ایسا بھی ہو گیا
ہر پنا اس کا کھو گیا
وہ راجہ جو تھا اسے پیارا بہت
وہ دور بہت ہو گیا
وہ بھولی تھی پاگل تھی
صرف اس کے نام پر جیتی تھی
اُس ریم جھم ہنسی کی جگہ

اب
پل پل ساون برستے ہیں
ندیوں کے پانی بھی
اب
اس کی ہنسی کو ترستے ہیں

امبرین ناز

غزل

تمہیں یاد ہے جیب بادل گرجتے تھے
میں ڈرجایا کرتی تھی اور تم
ایک مسیحا کی طرح میرا ہاتھ تھا ماما کرتے تھے
مجھے چھپا لیا کرتے تھے
آج بھی وہی بادل ہیں بن تیرے وہ ساون ہے
میں آج بھی ڈرجانی ہوں
تم کو تو بارش پسندھی ناں
پھر واپس کیوں نہیں آتے تم
یادوں کے اس میلے میں ایک ہجوم میں ہم پھر گئے
یہ بارش بہت ظالم ہے
زینب اس وقت کی بہت یاد دلاتی ہے
زینب ملک ندیم

ریمل آرزو

نظم

دور کہیں ویرانے میں
ایک چھوٹی سی بستی تھی
ایک پاگل سی لڑکی جہاں در در پھرتی رہتی تھی
ندیوں کے شفاف پانی سے
وہ ہر پل کھیلتی رہتی تھی
اک خواب پلکوں پر سجائے
جانے کسے ڈھونڈتی رہتی تھی
وہ ہاتھوں پر چوڑیاں کھنکھالتی
ریم جھم ریم جھم ہنستی تھی

سفرِ دل

اور خوشیوں کے لیے دعا گو۔

گیتی آراء ————— کراچی

”نورین اور پیاری آپی السلام علیکم! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ مہینے بھر کے طویل انتظار کے بعد اپنا دل عزیز ردا 9 نومبر کو ملا۔ ملتے ہی جیسے مرجھائے چہرے پر بہار آگئی۔ سب سے پہلے حسبِ عادت فہرست پر نظر ڈالی۔ آگے چل کر ”گوشہ آگہی“ کی خوب صورت باتوں سے دل کو ٹھنڈک پہنچائی اور پھر ”سندیے“ کی فہرست میں شامل ہونے کی غرض سے جلدی جلدی افسانوں کی طرف بڑھے۔ سب سے پہلے تو عائشہ حمد نے لائف بوائے کے اشتہار کو خوب چمکایا۔ عمارہ یعقوب کا ”آگہی کا در“ نے ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھنے والوں پر آگہی کا درواہ کر دیا۔ بہت خوب۔ ہم دعا لکھتے رہے، میری چاہت تم ہی ہو اور بلا عنوان کے طرز تحریر نے متاثر کیا۔ اس ماہ کے افسانوں میں ماریہ یا سرب پر سبقت لے گئیں۔ ”بس ایسے ہی“ میں ایک چھوٹے سے مگر بہت اہم موضوع کو بڑی خوب صورتی سے قلم بند کر کے ہماری آنکھیں کھول دیں۔ ”ردائے جنت“ میں کلامِ پاک کی تلاوت سے متعلق بہت اہم باتیں احادیث کے حوالے سے ہماری معلومات میں اضافے کا باعث بنیں۔ سبحان اللہ۔ ملاقات میں قاری محمد عثمان غنی کا انٹرویو دلچسپ رہا۔ ”ردا کی ڈائری“ نوشی گیلانی کی غزل اچھی لگی۔ ”اس ماہ میں“ اور ”خوشبو“ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی سب سے بیٹ رہے۔ ”ذرا پھر

سباس گل ————— رحیم یار خان

پیاری اور پر خلوص صالحہ آپی! السلام علیکم! دعا ہے کہ آپ، آپ کے اہل خانہ ردا کی پوری ٹیم خیر و عافیت سے ہوں، آمین۔ نورین ملک صاحبہ کو ہمارا سلام خلوص پہنچے۔ ردا ماشاء اللہ بہت عمدگی سے اپنا معیار برقرار رکھے ہوئے ہے۔ نئی رائٹرز کی حوصلہ افزائی ہمیشہ کی طرح آج بھی آپ کا طرہ امتیاز ہے اور بہت قابل ستائش بھی ہے۔ ”گوشہ آگہی“ ہر ماہ ایک سوچ اور خیال کو جنم دیتا ہے۔ کبھی ہمیں آپ کے لفظوں سے امید کی کرن ملتی ہے، کبھی حوصلے کا سراہا تھلگ جاتا ہے، کبھی خوشی اہمیت کا ساملتا ہے تو کبھی کسی درد پر آنکھیں اشکوں کا خزانہ لٹانے لگتی ہیں۔ لفظ اور بات وہی بہتر ہوتی ہے جو دل پر اثر کرے جو احساس کو چھو لے اور درد، خوشی، نعمت اور شکر کی اہمیت کو جگا دے اور ماشاء اللہ! آپ کے لفظوں میں یہ تاثیر بدرجہ اتم موجود ہے۔ اللہ پاک مزید جلا بخشنے آپ کے حسن تحریر اور تفکر کو اور آپ کو صحت و عزت کے ساتھ سلامت رکھے، آمین۔ ردا کے قارئین کا بہت شکریہ جو ہمارے لکھے کو ہمیشہ پسندیدگی کی سند دیتے ہیں اور صالحہ آپی! آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ ہمیشہ ردا میں ہمارے لیے دروازے کھلے رکھتی ہیں اور ہماری تحریروں کو شرفِ اشاعت بخشتی ہیں۔ بہت عرصے سے آپ سے بات نہیں ہوئی تھی تو سوچا ”سندیے“ کے ذریعے سے آپ سے آدمی ملاقات کی جائے۔ انشاء اللہ تعالیٰ! جلد ہی ردا کے لیے ناول ارسال کریں گے۔ دعاؤں میں ہمیں بھی شامل رکھیے گا۔ جزاک اللہ۔ آپ سب کی صحت، سلامتی

سے کہنا“ کی ساری ہی نظمیں وغزلیں اچھی رہیں۔ خاص کر ہاجرہ امین، شہلا گل، جمیرا قریشی، محمد اسلم، فرح ناز محمد رفیق، ریاض حسن قمر نے خوب لکھا۔ ”سندیے“ میں حسب معمول افشاں علی سبقت لے گئیں۔ ”دوستوں کے نام پیغام“ میں افشاں علی بہن کو ہماری طرف سے سالگرہ کی دلی مبارکباد قبول ہو۔ پیاری عانیہ نیازی تم نے ہم سب کو اتنے خلوص کے ساتھ یاد رکھا تمہارا بہت بہت شکریہ دراصل تم خود اتنی پیاری اور اچھی ہو کہ تمہیں سب اچھے لگتے ہیں ہماری طرف سے بھی ڈھیروں دعائیں اور پیار۔ صدا خوش رہو، آمین۔ راین ناز! ارے بھی ہم سب ردا کے رائٹر قاری اراکین ہم سب ایک دوسرے کے دوست سہیلیاں ہی تو ہیں روبرو ہیں قلم کے ذریعے ردا کے توسط سے ہم ہر ماہ ایک دوسرے سے ملتے پیغام پہنچاتے رہتے ہیں۔ محبت بھرے پیغام آپ جیسی پیاری پیاری دوستوں پر تو ہمیں ناز ہے۔ ”ردا کی شہزادیوں“ سے ملاقات دلچسپ رہی۔ شہلا گل، عائشہ اکمل، شیریں تبسم تم تینوں سے شوخ چٹیل ملاقات کر کے مزہ آگیا۔ ”سنگھار“ میں بالوں کو ڈائی کرنے کے طریقے زبردست رہے اور بہت مفید رہے۔ معلومات کے حوالے سے بھی۔ اب اجازت وقت کی کمی کی وجہ سے سندیے میں شمولیت کی غرض سے ابھی اتنا کچھ ہی پڑھ کر تبصرہ کر ڈالا۔ ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اجازت۔

افشاں علی _____ کراچی

بہت سی دعاؤں، محبتوں، چاہتوں اور عقیدتوں کا نذرانہ لیے افشاں علی سندیے میں حاضر خدمت ہے۔ امید و اتق ہے پڑھنے والی تمام خوب صورت بصارتوں کی مالک پیاری پیاری قارئین، ہر دلچیز رائٹرز اور کیوٹ سی نوزین کے ساتھ محترمہ صالحہ اپنا باخیر و عافیت ہوں گی۔ دل چھوتی مسکراہٹ لیے خوب صورت ڈریس کو زیب تن کیے خوب

صورت سی نیلم سرورق کی رونق بڑھا گئی۔ ہمیشہ کی طرح ”گوشہ آگہی“ میں صالحہ اپنا کی سبق آموز سی سرگوشیاں پڑھ کر یوں لگا جیسے ہم آپ کے روبرو موجود ہوں۔ قمروش آپنی اتنے پیارے سے ناول کو اتنا خوب صورت سا اختتامی موڑ دینے پر دل سے مبارکباد اور ساتھ ہی ایک ریکونٹ ہے پلیز قمروش جی کا تفصیلی انٹرویو لیجیے ہمیں ان سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں اور قمروش آپنی 14 نومبر آپ کی برتھ ڈے کھی۔ افشاں علی کی جانب سے دل کی گہرائیوں سے بہت خلوص و محبت کے ساتھ سالگرہ مبارک۔ اللہ سے دعا گو ہوں کہ وہ آپ کی ہر دعا ہر خواہش مانگنے سے بھی پہلے پوری کر دے، آمین۔ اس ماہ دو مکمل ناول شامل رہے سیدہ فرزانہ حبیب کے ناول نے ماضی کے دو کچھڑے اور گرداب زمانہ میں پھنسنے لوگوں کو حال میں ملایا بھی تو کس روپ میں۔ سچ بات ہے دل توڑنے والے کو کبھی سکون کا لمحہ راز نہیں آتا۔ بہت خوب ڈیز آپ نے مکمل ناول بہت عمدہ لکھا۔ شائلہ دلعیاد کا ناول بھی پسندیدگی کی سند پر براجمان ہو گیا۔ واقعی محبت سے بڑھ کر کوئی مرہم نہیں جنہیں نصیب ہو جائے۔ رابعہ ولی کا مکمل ناول بھی اچھا تھا۔ اریبہ بلوچ نے بھی اچھا لکھا۔ ”میری چاہت تم ہی ہو“ چاہتوں سے بھرا افسانہ اچھا رہا۔ ”بلا عنوان“ کے نام پر زینب نے مختصر لفظوں میں بہت ہی عمدہ سبق دیا ویل ڈن۔ سلسلے وارد دونوں ناول تو ہیں ہی بہت خوب۔ حافظہ مومن شاہ نے قاری محمد عثمان عینی قادری سے ملاقات بہت اچھے سے کروائی۔ ”ردا کی ڈائری“ میں تمام بہنوں کی ڈائری کا انتخاب پسند آیا۔ اس ماہ کی نظم اس ماہ کی اچھی بات بہت پسند آئی۔ باقی سلسلے بھی خوب تھے۔ ”سندیے“ میں تو رونق بہت خوب سے خوب تر ہوتی جا رہی ہے۔ کبھی پیاری بہنوں کا شکریہ جو ہمیں یاد رکھتی ہیں۔ پیاری فریدہ فرید، کیوٹ سی کیتی آراء، ہر دل عزیز عانیہ

نیازی، پیاری بہن ثناء کنول اور تمام تمام بہنوں کا
 Thanks۔ اس بار سندیے میں نئے نام بھی نظر
 آئے سب کو خوش آمدید۔ شہلا گل آپ کو شادی کی
 پہلی سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ دوستوں کے نام
 پیغام میں میرے پیغام کو شامل اشاعت کرنے کے
 لیے صالحہ اپنا آپ کا بہت شکریہ۔ سحر مبین، عانیہ
 نیازی، سیدہ فرزین، ریمانور، طیبہ علی سمیت نوشین
 مدثر بھی کا پیغام پسند آیا۔ سحر مبین، عانیہ نیازی اور
 پیاری سی بہن ثناء کنول یاد آوری کا شکریہ۔ رامین ناز
 ہمارے گروپ میں آپ کو خوش آمدید۔ یہ ردا بھی آپ
 کا ہے اور ہم بھی اور آج سے آپ بھی ہماری دوست
 ہیں۔ ردا کی شہزادیوں کو دیکھ کر از حد خوشی ہوئی۔ شہلا
 گل آپ نہ بھی کہیں تب بھی میں ذکر خاص ضرور
 کرتی۔ بہت سادہ سا تعارف لیے آپ کی آمد دل کو
 بھائی پر آپ نے اپنی Dob تو بتائی ہی نہیں چلے
 خیر! ویسے آپ کا انداز پسند آیا۔ عائشہ اکل خوش
 آمدید آپ کے بارے میں جان کر اچھا لگا خاص کر یہ
 کہ آپ کا ثناء کنول سے ڈبل اور خاص رشتہ ہے۔ اللہ
 آپ لوگوں کے بیچ پیار و محبت بنائے رکھے، آمین۔
 ڈیئر شیریں بسم آپ کا تعارف بڑھ کر اور آپ کے
 بارے میں جان کر اچھا لگا۔ ”چکن“ میں اس بار تو
 زبردست ریسپی منتظر ملیں۔ الغرض ہمیشہ کی طرح ردا
 دل کو بھایا۔ تمام پیاری پیاری قارئین اور میری بہنوں
 کے لیے افشاں علی کی جانب سے یہ تحفہ مختصر اور ان
 قارئین کے لیے بھی جن کی دسمبر میں برتھ ڈے ہے
 تیرے رخسار پر نہ گئے کبھی کوئی غم کا آنسو
 خدا تیری ہر دعا تیری تقدیر بنا دے
 (آمین)

رابعہ افضل خان کراچی

محترم صالحہ آپی، نورین ملک اور ردا سے جڑی تمام
 سکھیوں کو رابعہ افضل خان کا محبتوں سے سجا سلام قبول
 ہو۔ ٹھنڈی ٹھنڈی سی نومبر کی ڈھلتی شام کو ردا

ہاتھوں میں آیا۔ سرورق پر فریش سی اسمائل کرتی نیلم
 ہمیں بھی فریش کر گئیں۔ ”گوشہ آگہی“ کو پڑھتے
 ”ردائے جنت“ میں بکھرے موتی چنتے آگے بڑھے اور
 قمرش شہک کے ناول ”تیرے پیار کی خوشبو“ پر بریک
 لگائی مگر آخری قسط کے ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی دل اداس
 ہو گیا۔ بہر حال قمرش جی اتنا زبردست اور خوب
 صورت ناول لکھنے اور اس کا میا بی پر ڈھیر ساری مبارک
 باد قبول کیجیے۔ شازیہ مصطفیٰ بھی بڑی خوب صورتی سے
 آگے بڑھتی جا رہی ہیں۔ نائلہ طارق آپ کی تو کیا ہی
 بات ہے۔ مکمل ناول میں ”محبت کا دکھ“ فرزانہ
 حبیب، ”ایثار وفا“ رابعہ دلی آپ دونوں نے بہت اچھا
 لکھا۔ ”شاہ پیاتیری چاہ پیما“ شائلہ ولعباد کا ناول بھی
 بہت اچھا تھا۔ افسانے میں عائشہ حمد، ماریہ یاسر، عمارہ
 یعقوب، اریبہ بلوچ، ریمانور رضوان، زینب ملک ندیم
 سب ہی نے کیا خوب لکھا۔ قاری محمد عثمان عنی قادری کا
 انٹرویو پسند آیا۔ آئی تھنک اریبہ بلوچ، عمارہ یعقوب
 اینڈ ماریہ یاسر نے ردا کی محفل میں فرسٹ ٹائم انٹری دی
 ہے ہم آپ کو دل سے ویلم کرتے ہیں۔ ”ردا کی ڈائری“
 سے شہلا گل سحر، بتول امتیاز کا انتخاب دل کو چھو گیا۔ اس
 ماہ میں اس ماہ کی نظم پسند آئی۔ ”خوشبو“ میں ہر لفظ ہی
 خوشبو کی طرح مہکتا ہوا تھا۔ ”ذرا پھر سے کہنا“ میں سب
 کا کلام ہی دل میں اتر گیا۔ ”سندیے“ کی محفل میں
 سب ہی سکھیوں نے کیا خوب محفل جمائی بس اپنی کمی
 بہت محسوس ہوئی (ہاہا)۔ سوئیٹ سی افشاں علی سندیے
 کی پسندیدگی کے لیے بہت شکریہ۔ کیوٹ سی شہلا گل
 سحر پسندیدگی کے لیے جزاک اللہ۔ پیاری سحر مبین!
 آپ نے ہمیں اپنے پیغام میں یاد رکھا، بہت شکریہ۔
 ڈیئر عانیہ نیازی اپنی محبت اور پر خلوص دعا کے لیے دل
 سے ٹھیکس۔ سوئیٹ سی رامین ناز ردا کی محفل میں آپ
 پہلی بار شریک ہوئی ہیں ہم آپ کو دل سے ویلم کرتے
 ہیں اور ہمیں آپ کی دوستی دل سے قبول ہے۔ کیوٹ سی
 اینڈ سوئیٹ سی فریدہ فرید آپ کی دوستی اور محبت دونوں پر

بہت فخر محسوس ہوتا ہے کہ آپ مجھے ہمیشہ یاد رکھتی ہیں۔ میرے افسانے اور خط کی تعریف اور پسندیدگی کے لیے بنڈل آف ٹھیکس اور نظم ہینڈ ریٹ پرسنٹ ذاتی تھی۔ اڈاپٹس ہرگز نہیں۔ ”ردا کی شہزادیاں“ میں شہلا گل سحر، عائشہ امل، شیریں تبسم سب کا تعارف دلچسپ تھا۔ ”پگن“ ہمیشہ کی طرح سجا ہوا تھا۔ ”سنگھار“ بھی مکمل تھا۔ آخر میں ردا کے لیے ڈھیر ساری دعائیں اس کے ساتھ ہی اپنی جانی پہچانی دوست رابعہ افضل خان کو اجازت دیں، اللہ نگہبان۔

صبا عبدالفضلی ————— کراچی

سب سے پہلے دل کی گہرائیوں اور دعاؤں کے ساتھ سلام الفت قبول ہو اور اب کرتی ہوں معذرت میں نے دو مہینے آپ لوگوں کو اپنے پیارے سندیے کے دیدار سے محروم رکھا، سو سوری۔ پچھلے منتھ کے شمارے پڑھوڑا سا تبصرہ کرنا چاہوں گی۔ ثوبیہ ملک، بسمہ ناز، ثناء ناز، مریم شاہ بخاری اور شیریں تبسم آپ لوگوں کے لیے بس اتنا کہنا چاہوں گی ”زبردست“۔ سحر مبین! زبردست یار تمہاری تحریر بہترین تھی۔ مون شاہ! اتنا دلچسپ انداز تحریر تھا آپ کا کہ پورا پڑھے بغیر رسالہ نگاہوں کے سامنے سے ہٹایا تک نہیں ویلڈن۔ سب سے زیادہ ایقان علی کی تحریر نے متاثر کیا۔ زیب النساء کا کردار بہت پاورفل تھا۔ فرح ناز رفیق! آپ ہمیشہ وطن سے محبت کا درس دیتی ہیں جو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ ثناء کنول! بہت اچھی تحریر تھی۔ افشاں علی! میں آپ سے ناراض ہوں کیونکہ ایک تو آپ نے مجھے سسٹر کہا اور دوسری طرف ٹھیکس بھی۔ اب جلدی سے مجھے منائیں اور اتنی ڈھیر ساری دعاؤں اور محبت کے لیے (جو فقط ایک شعر میں بیان ہو گئیں) جزاک اللہ۔ رابعہ افضل! آپ نے شکریہ کہا، بہت غلط بات ہے۔ آپ کا بھی شکریہ کہ میرا شعر آپ کو پسند آیا (حساب برابر)۔ چلیے اب بات ہو جائے اس ماہ کے شمارے کی تو سرورق پر سرسری سی

نظر ڈال کر آگے بڑھے۔ فہرست پر نظر دوڑائی تو کئی نئے نام نظر آئے۔ ”گوشہ آگہی“ میں صالحہ آبی نے اپنے دل کی باتیں شیر کیس بہت اچھا لگا۔ قمروش شہک کے ناول کی آخری قسط کا سن کر سوری پڑھ کر جلدی سے قمروش شہک کے ناول کی طرف بڑھے۔ پڑھ کر واہ واہ کر اٹھے۔ قمروش آبی! کتنا مکمل اینڈ کیا ہے آپ نے، کہیں کوئی کمی محسوس نہ ہوئی لیکن پھر بھی اتنے اچھے ناول کا اینڈ ہونے پر تھوڑی سی اداسی ضرور ہے۔ ”جو عشق میں بتی وہ عشق ہی جانے“ پڑھ کر بے ساختہ شکر ادا کیا کہ خرمین کو عقل آگئی۔ اب بس منیزہ اور ہارون کے درمیان سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔ عارش کی نعمت اور عثمان کی رحمت نے کہانی میں نئے سرے سے جان ڈال دی ہے۔ ”تجھ سے مانگوں میں تجھ کو“ شازیہ آبی! اب تو ضمیر ان اور حسنیٰ پر رحم کر دیں اور انہیں ایک خوشگوار زندگی گزارنے کا موقع دے دیں۔ ”محبت کا دکھ“ اور ”ایثار و وفا“ دونوں عملیں اور اداس تحاریر تھیں۔ گل رخ کے کردار میں بہت میچورٹی نظر آئی اور کمال زیدی کے کردار میں سنگدلی۔ ہر طرز سے کہانی بیسٹ تھی۔ رابعہ ولی! ویری گڈ یار۔ اتنے اچھے ناول کے ساتھ آپ کی انٹری نے دل خوش کر دیا۔ ”شاہ پیا، تیری چاہ پیا“ شانلہ و لہباد کہانی کا نام بہت پیارا اور انٹرسٹنگ تھا۔ حیرت ہے بیرون ملک میں رہتے ہوئے نہ صرف آپ نے منظر نگاری بہترین کی بلکہ اتنی اچھی اردو نے بھی کافی متاثر کیا۔ آپ کا سندیہ اور ناولٹ دونوں بہترین تھے۔ عائشہ حمد! سب سے پہلے تو خوش آمدید۔ بحسب سے بھرپور تحریر تھی۔ آخر میں جب راز سے پردہ اٹھا تو بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔ کچھ نیا تھا اس لیے اچھا لگا۔ ”بس ایسے ہی“ ماریہ یاسر! آپ نے جھوٹ پر جو افسانہ لکھا وہ واقعی اچھا تھا۔ اریہ بلوچ! کہانی بہت بہترین تھی۔ خاص کر کہ شعر مجھے بہت پسند آیا۔ آپ کا انداز تحریر کافی پختہ تھا، ویلڈن۔ ریمانا نور رضوان! آپ تو

ہمیشہ اچھا لکھتی ہیں۔ اس بار بھی اچھا لکھا۔ زینب ملک ندیم! یو آر دی بیسٹ۔ انداز تحریر، کردار، جملے، کہانی اور سبق سب کچھ بہترین تھا۔ آگے بھی ہمارے لیے ایسی سبق آموز کہانیاں لکھتی رہیے گا۔ باقی تمام مستقل سلسلے اپنی اپنی جگہ بہترین رہے۔ ”ردا کی شہزادیاں“ سلسلہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور خاص کر کہ شہلا گل سحر سے ملنا بہت اچھا لگا۔ عائشہ اکمل اور شیریں تبسم سے ملاقات اچھی رہی اور بہت مزہ آیا۔ عائشہ بھابی (آپ) شہلا کنول کی بھابی ہیں تو میری بھی بھابی لگیں، ہے ناں)۔ اب مسلسل شامل رہیے گا۔ فریدہ فرید، عانیہ نیازی، افشاں علی، شہلا کنول، فرزانہ حبیب اور رامین ناز آپ لوگ مجھے اس بار بھول گئے لیکن مجھے آپ کے کہے گئے جملے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ رامین ناز! ردا کی فیملی میں ویلکم۔ میرا نام تو نہیں لکھا پر پہلے دوستی کا ہاتھ بڑھانا کوئی بری بات نہیں۔ اس لیے میں تم سے دوستی کرنا چاہتی ہوں۔ امید ہے رو نہیں کرو گی۔ گیتی آراء! ہم بھی ردا میں شامل ہیں۔ میں آپ سے دوستی کرنا چاہتی ہوں اور پلیز میری رہنمائی کے لیے میری کوئی غلطی بتا دیجئے تاکہ میں وہ سدھار سکوں، نورالصباء اپنی شاعری جاری رکھیے گا اچھی لگتی ہے۔

ثناء کنول اللہ دتہ — لودھراں

السلام علیکم! سب سے پہلے پیاری سی فرزین حبیب اور دانیہ آفرین، اللہ آپ دونوں کو صبر اور ہمت عطا کرے اور آپ کے پیاروں کو جنت میں اعلیٰ مقام۔ پیاری سی صبا عبدالغنی! یار تھینک پوسوچ اتنی محبت کے لیے۔ سچ اب میں کبھی اداس ہونی ہوں نا تو تمہیں دل سے یاد کرتی ہوں۔ میری ساری اداسی غائب ہو جاتی ہے۔ بہت اچھا لگا یہ سوچ کر کہ تمہیں میری اداسی کی پرواہ ہے۔ تھینک پوسوچ میری دوست تم میری زندگی کا انعام ہو۔ عائشہ الیاس! اتنی محبت اور دعاؤں کے لیے شکر یہ بہت چھوٹا سا لفظ ہے۔ خدا تمہاری ہر دعا قبول

کرے۔ اپنے نام پیغام دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی تم نے مجھے خوشی دی ہے۔ خدا تمہیں خوشی دے تھینک پوسوچ۔ پیاری سی فریدہ فرید! میری دوست کبھی کبھی تازہ تازہ شوگ ہی عمر بھر کا روگ بن جاتا ہے اور انسان کو پتا تک نہیں چلتا کہ کیا ہوا کیسے ہوا۔ رابعہ افضال میری دوست پتا ہے میں سوئیٹ کیوں ہوں کیونکہ تم خود بہت ہی سوئیٹ ہو اور جو لوگ خود اچھے ہوتے ہیں انہیں سب ہی اچھے لگتے ہیں۔ پتہ ہے جب میں ردا میں ایک بھی جگہ پر اپنا نام دیکھتی ہوں نا تو دھوپ میں میرا چل کر ڈاک کروانا ڈائجسٹ لے کر آنا یہ سب تکلیف بہت پیچھے رہ جاتی ہے تب پھر صرف ایک احساس ہوتا ہے کہ میں بھی کسی کے لیے خاص ہوں جیسے افشاں علی کے لیے، تمہارے لیے عائشہ الیاس کے لیے۔ سب کے لیے تب جو احساس دل میں آتا ہے وہ میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔ یہ ہی احساس ہے جو مجھے ردا کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور تا عمر بندھے رکھیے گا۔ پیاری سی رامین ناز آئی نو کہ تم اپنے نام کی طرح بہت ہی پیاری ہو گی مجھے تمہاری محبت بھری دوستی قبول ہے اور ردا میں ویلکم، ہمیشہ لکھتی رہنا ردا سے اپنا سفر کبھی ختم مت ہونے دینا کیونکہ تم سے ہی ہم ہیں اور ہم سے ہی تو تم ہو۔ شہلا گل سحر میری دوست کیسی ہو۔ شادی کی سالگرہ بہت بہت مبارک ہو، سدا خوش رہو اور خدا تمہارے شوہر کو بھی لمبی عمر عطا کرے خدا اور بہت سی سالگرہ منانا نصیب کرے تمہیں، آمین۔ اریبہ بلوچ، عمارہ یعقوب، عائشہ حمد، ماریہ یاسر، رابعہ ولی، شانکہ دلعباد، شیریں حیدر ویلکم سب کو۔ میری دوستوں، ہمیشہ ردا میں لکھتی رہنا جب تک ہے جان۔ عانیہ یاز کبھی کوئی کہانی تو لکھو کیا پتا کہ تم مجھ سے کبھی بہتر لکھ لو۔ افشاں علی، کشف ضیاء کہاں ہے پلیز اسے دوبارہ ردا میں لے آؤ نا میرے لیے۔ حمیرا عروش خدا تمہیں آباد رکھے تم تو شادی کر کے مجھے بھول ہی گئی ہو جلدی سے ردا میں لکھو۔ حنا آپی ہمیشہ خوش رہو مسکراتی رہو نا امید مت ہونا خدا تمہارے ساتھ ہے۔

صالحہ آتی کبھی تو ہمارے نام بھی کچھ لکھیں کہ دل نادان کو تسلی عشق ہو۔ خدا حافظ فی امان اللہ۔

ثوبیہ ملک ————— کراچی

پیاری آپنی السلام علیکم! پیاری صالحہ آپنی جی اور نورین آپنی کو خلوص بھرا سلام۔ امید ہے آپ سب اور تمام قارئین ٹھیک ہوں گے۔ تو جناب اب بات کرتے ہیں پیارے ردا کی تو جیسے ہی سرورق پر نظر پڑی تو ماڈل سلیم کو دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ پھر آگے بڑھے تو ”گوشہ آگہی“ کو دل میں اتارا۔ پھر جیسے ہی نظر پڑی ”تیرے پیار کی خوشبو“ کی آخری قسط تو چھلانگ لگا کر جلدی سے پہنچے۔ زبردست قمرش آپنی کیا اختتام کیا ہے میں تو یہی کہوں گی کہ آپ نے ہر کردار کے ساتھ انصاف کیا ہے ویلڈن۔ ”تجھ سے مانگوں میں تجھ کو“ کی قسط بھی اچھی رہی۔ مکمل ناول میں فرزانہ حبیب کا ناول زبردست رہا لیکن ”ایثار وفاق“ بھی اچھا رہا۔ ناولٹ ”شاہ پیا، تیری چاہ پیا“ بہت اچھا تھا اس کے علاوہ اگر افسانوں کی بات کی جائے تو اریہ بلوچ کا سب سے زیادہ اچھا تھا اور باقی سب افسانے بھی زبردست تھے۔ ردا کے مستقل سلسلے بھی زبردست رہے۔ آخر میں پیاری آپنی آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جو آپ نے اکتوبر کے شمارے میں میری تحریر شائع کی اور اس کے علاوہ میری کہانی کو پسند کرنے کے لیے افشاں علی، فریدہ فرید، سحر مبین کا بہت شکریہ۔ اب اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ اللہ تعالیٰ ردا کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے، آمین۔

سحر مبین ————— فیصل آباد

السلام علیکم! خیریت سے ہیں سب (یار دل کو دل سے راہ ہوتی ہے)۔ خوب سردیاں انجوائے کی جارہی ہوں گی یقیناً۔ بات ہو جائے ردا کی۔ اس ماہ کا ردا بھی ہمیشہ کی طرح اچھا تھا۔ سب رائٹرز نے بہت اچھا لکھا۔ مستقل سلسلے بھی ہمیشہ کی طرح شاندار

رہے۔ سلسلہ وار ناول بھی خوب جارہے ہیں۔ سب کیوٹ اور پیاری سی دوستوں کو ڈھیروں دعائیں اور سردیوں سے بچنے کی ڈھیروں تلقین۔ ہاں انجوائے خوب کیجیے۔ سردیاں میرا فیورٹ موسم ہے۔ سردیاں اور آئس کریم اور ڈائجسٹ واہ واہ۔ اوکے جی۔ خیال رکھیے اللہ حافظ۔“

زاہدہ ہاشمی زاہسی ————— کراچی

دل و جان سے عزیز صالحہ آپنی اور تمام ردا اشاف و قارئین کو زاہدہ ہاشمی کا سلام قبول ہو۔ بعد از سلام خیریت کی طالب خود بخیریت! احوال دیگر یہ ہے کہ آپنی ردا بہت لیٹ ملا۔ آج ہی ردا ہاتھ میں آیا تو بس ”گوشہ آگہی“ اور ”سندیے“ پڑھ کر میں خط لکھنے بیٹھ گئی ہوں۔ صالحہ آپنی کیا کمال کا لکھا آپ نے اور بہت پیاری نصیحت کی گوشہ آگہی میں کہ غیبت سے بچنا چاہیے اور حسد تو ایسی وبا ہے کہ جو ہماری نیکیوں کو ایسے کھا جاتی ہے جیسے خشک لکڑی کو آگ۔ اللہ پاک ہم سب کو حسد سے اور حسدوں سے محفوظ رکھے، آمین۔ اور اب سندیے کی باری ہے۔ پیاری افشاں آپ میری صحت کے لیے دعا کرتی ہیں۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے اور آپ کو زندگی کے ہر موڑ پر کامیابیوں سے نوازے آمین۔ اور میری باقی تمام سٹریٹرز نے بھی بہت اچھے سندیے لکھے۔ ثناء ناز، گیتی آراء، افشاں علی اور تمام بہنوں کو جن کے نام نہیں لکھے ان سب کے لیے میری ڈھیروں دعائیں۔ دانیہ آفرین کی امی کا اور فرزانہ حبیب کے ابو کی ڈیٹھ کارٹھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور آپ کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ ہمیشہ کی طرح آپ سب کی دعاؤں کی منتظر رہوں گی۔ 27 نومبر کو میری شادی کو چار سال ہو جائیں گے۔ آپ سب دعا کریں کہ اللہ مجھے صحت کے ساتھ ساتھ اولاد کی نعمت سے سرفراز فرمائے، آمین ثما آمین۔“

..... ☆

دوستوں کے لئے دعا

دوستی قبول ہو۔ بسی ولبی لعلق تو معاشرے کی اساس ہیں ہی ردا کی سر زمین پر آ کر سیکھا کہ قلمی تعلق بھی کم برتا شیر نہیں ہوتا محض چند لائین جو قلم سے کسی کے نام نکلتی ہیں وہ کتنی دلکش و دلچسپ لگتی ہیں اب جانا۔ آپ جانی اور نورین جی کی وساطت سے ردا فیملی کتنی وسیع اور قریب ہوئی جا رہی ہے کہ لفظوں میں بیان مشکل ہے لیکن میں ایک کریڈٹ عانیہ نیازی کو دوں گی۔ اسٹوریز کے ساتھ ساتھ شرکاء رسالہ کا تذکرہ کرنا سب سے پہلے عانیہ جی نے ہی اشارت کیا تھا۔ وہ ہر ایک کی بعزیز اسی لیے ہیں کہ وہ سب کو عزیز رکھتی ہیں اور ردا فیملی میں نئی روح پھونکنے والی پیاری سی افشاں علی کا ذکر تو ہمارا قلم خود بخود کرنے لگتا ہے۔ افشاں جی کا ذکر ہم نہیں ہمارا دل کرتا ہے جس طرح ہر فیملی میں ایک نٹ کھٹ بچہ سارے گھر کی رونق ہوتا ہے ویسے ہی ہماری افشاں ردا فیملی کی رونق ہیں اور پھر جو ذرا سی تناؤ اور دوری کی لکیر تھی اسے توڑ ڈالا ہماری رابعہ افضل اور صبا عبدالغنی نے رابعہ کی معصوم مخاطبت اور پُر حدت پیش قدمی سیدھا ہمارے دل پر آ کر پڑاؤ الٹی ہے۔ رابعہ افضل کے ذکر کی تو جیسے عادت سی ہو گئی ہے۔ نہ دل پر اختیار ہے نہ عادت بدلنے پر قادر ہیں۔ صبا عبدالغنی انتہائی دور بین اور وسیع قلب کی حامل ہماری سکھی ہر ایک سے یکساں پر خلوص روابط روا رکھتی ہیں ہر ایک کا خیال رکھنے والی پیاری سکھی ہمیشہ ہمارے خیال میں رہتی ہیں۔ یونہی ہماری کیتی آراء کو ہر ماہ کسی نہ کسی سلسلے کے زیریں پڑھنا ہمیں اتنا ہی

بہت پیاری صالحہ آپ کی نام

آئی مس یور سکی

فلک پہ جتنے تارے ہیں اتنی زندگی ہو تیری
چاند سے زیادہ زمین پر روشنی ہو تیری
تو خوش رہے دنیا کی ہر خوشی ہو تیری
تو سلامت رہے یہ دعا ہے میری

☆☆☆

تیرے چہرے پہ ہنسی سدا رہے
میرے ہر لفظ میں تیرے لیے دعا رہے
زندگی میں پاؤ خوشی ہر دم
دور تم سے دنیا کی ہر بلا رہے

روشنی فاطمہ فیصل۔ کراچی

فرینڈز کے نام

السلام علیکم! ردا سے وابستہ سبھی لوگوں کو میرا
سلام۔ افشاں علی، صبا عبدالغنی، زاہدہ ہاشمی، ثناء کتول
اللہ دتہ، میرے دل کے بہت قریب کیتی آراء صاحبہ،
فریدہ فرید، رابعہ افضل خان، مصباح مسکان رؤف،
امینہ رؤف۔ آپ سب کی اتنی چاہتوں کا بے حد
شکریہ۔ ہمارا ردا یونہی پروان چڑھتا رہے اور ہمارا
تعلق ردا کے توسط سے مزید گہرا ہوتا رہے۔

جب نہ ہو گا اس دنیا میں میری ہستی کا وجود
تو یاد کر لینا مجھے اس تحریر کے ساتھ

ریمیا نور رضوان۔ کراچی

ہماری ردا فیملی

احباب ردا اور سکھی سہیلیوں کو سلام خلوص اور قلمی

اسٹاپ بولنے کی مزید توفیق دے۔ ہمیشہ یونہی بولگیوں کی طرح چہچہانی رہو (ہاہاہا)۔ انارکلی! کیسی ہو؟ اللہ تمہیں ہمیشہ ٹھیک ٹھاک رکھے۔ 12 دسمبر کو اس دنیا میں تشریف آوری فرما کر اس دنیا کی رونق دو بالا کر دینے کا سہرا سجانے کا مرتبہ حاصل کرنے والی پیاری سی انارکلی کو ہماری طرف سے سالگرہ پر ڈھیروں مبارک باد۔ اللہ تمہیں ہر خوشی دے، آمین۔

نادیہ! 26 دسمبر کو اس دنیا میں آ کر مزید سردی میں اضافہ کرنے کی وجہ مننے کا بہت شکریہ (سردیاں پسند ہیں مجھے یار)۔ سالگرہ مبارک ہو۔ خدا تمہیں کامیاب اور خوشگوار زندگی عطا فرمائے، آمین۔

بنیامین! میرے پیارے سویٹ سویٹ کیوٹ لولی برادرز 26 دسمبر کو ہمارے گھر میں پیدا ہو کر ہمارے گھر کی رونق بڑھانے۔ ماما، پاپا کو بہت خوشی دینے کا بہت شکریہ۔ سولہویں سالگرہ مبارک ہو۔ خدا تمہیں جیسی زندگی دے، آمین۔ سب کو اگین Happy Birth day۔ ٹریٹ کو ہرگز مت بھولے گا۔ وہ تو میں معاف کروں گی نہیں۔

سحر مبین۔ فیصل آباد

ان کے نام جو میری زندگی کی خوشیاں ہیں

السلام علیکم! صالحہ آپی، نورین آپی، میری پیاری بہنوں، دوستوں کیسی ہو۔ امید ہے کہ ٹھیک ٹھاک ہوں گی۔ حمیرا عروش پلیز جلدی سے ردا میں لکھونا آئی مس یو یار کہاں کم ہو پلیز کم بیک ناؤ۔ افشاں علی میری دوست خدا تمہیں خوش رکھے، آمین۔ کیسی ہو یار کیا ہو رہا ہے آج کل، پلیز تم تو باقاعدگی سے ردا میں انٹری دیا کرو یہ میرا حکم ہے کچھ بھی پاگل۔ صبا عبدغنی ہاؤ آر یو میری دوست کیا ہو رہا ہے آج کل ویسے اب تم ردا میں کوئی کہانی لکھو جلدی سے او کے میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں۔ صبا سحر، دھنک ناز، ملالہ اسلم، ریمیل آرزو، صائمہ قریشی، ثناء ملک، اریشہ کیسی ہو تم سب امید ہے کہ فٹ فٹ ہی ہو۔

ردا ڈائجسٹ 220 دسمبر 2015ء

ضروری لگتا ہے۔ جتنا سانس لینا، ہماری مصروف سی سکھی ریما نور کم کم آتی ہیں مگر ہمارے اندر سے گزرے بنا نہیں جاتیں ردا کی تحریر کی مالک ریما ہمیشہ میری دعاؤں کا حصہ رہتی ہیں۔ یونہی کبھی حاضر کبھی غائب مصباح مسکان رؤف کی تحریر کے ہم ہر ماہ منتظر ہوتے ہیں۔ ہماری اداس بلبل ثناء کنول اور قدرے ناراض معلوم ہوتی صبا سحر اور سحر مبین ردا فیملی کا حسین حصہ ہیں۔ آفتاب سسٹرز، سیدہ فرزانہ، فرح ناز ردا کی انگٹھی میں جڑے گئیں ہیں۔ مون شاہ سنا ہے آپ شہباز فرید کی بہن ہیں اور وہ پاکستان کے نعت خواں ہیں تو کیا ہمیں آپ کا پڑوسی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ کیوٹ سی رامین ناز ردا فیملی کسی کی میراث نہیں اس لیے میں آپ کو ویلکم نہیں کہوں گی مگر آپ ہمارے دل کا ٹکڑا ہو۔ یقین کر لو دوستی سے بھی بڑھ کر خلوص آپ پر نچھاور کرتے ہیں۔ شہلا گل سحر انتہائی باغ و بہار اور نٹ کھٹ سی شخصیت آتے ہی چھا گئیں ہیں آپ کا تعارف پڑھ کر حیران رہ گئے کیا کوئی نیچر بھی اتنا شوخ و شنگ ہو سکتا ہے۔ شہلا گل اگر اجازت ہو تو ردا فیملی میں آپ کو گل جی کے نام سے پکارا کریں اچھا لگے گا اور میں واقعی میں ڈیسنٹ ہوں (ہاہاہا)۔ وائی آفرین ردا فیملی میں آپ تنہا نہیں ہو، ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ اسماء، شیریں تبسم، عائشہ اکمل آپ لوگوں سے ملاقات بہت دلچسپ رہی فخر ہوتا ہے کہ اتنے پیارے پیارے لوگ ردا فیملی کا حصہ ہیں اللہ ردا فیملی کو سلامت رکھے۔“

فریدہ فرید۔ پاکستان شریف

پیارے دوستوں کے نام

پیاری اور سویٹ سحرش رانا! 9 دسمبر تمہارا جنم دن ہے۔ بہت بہت مبارک ہو۔ 9 دسمبر کو ایک عدد پٹاخہ پھوٹا تھا جس کے اثرات ہم ابھی تک بھگت رہے ہیں۔ (ہاہاہا)۔ کمال ہے یار! پٹاخہ ہو بالکل خدا تمہیں جیسی اور کامیاب زندگی عطا فرمائے اور تمہیں نان

READING
Section

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

تم زندگی کے ہر لمحے میں ہر پل میں مسکراؤ
 رابعہ افضل خان۔ کراچی

سانحہ پشاور کے لواحقین کے نام

سانحہ پشاور والا واقعہ ہرگز فراموش نہیں کیا
 جاسکتا۔ سانحہ پشاور کے شہید معصوم پھولوں کے
 لواحقین کے نام۔ اللہ انہیں صبر عطا کرے، آمین۔
 پچھڑے ہوئے معصوم لخت جگر کی یاد میں دل اداس ہے
 اسے صبح عید ویران دل کے ساتھ گھر کو سجاؤں تو کس لیے
 ریمانور رضوان۔ کراچی

دوستوں کے نام

دوست وہ ہوتا ہے جو بن بلائے

آئے بے وجہ سر کھائے

آپ ایک بولیں وہ چار سنائے

کبھی روئے کبھی ستائے

تعریف کرو تو منہ چڑائے

گالی دو تو مسکرائے

ہر بات میں کمینا پن دکھائے

بات بتائے بنا آپ کا

بیلنس چڑائے

آپ کی پلیٹ سے ساری بوٹیاں اٹھا کر کھائے

چاٹ کی پلیٹ چھین کر بھاگ جائے

(مگر ہمیشہ ساتھ نبھائے)

میری جان سے پیاری دوستو

جہاں بھی رہو ہمیشہ مسکراتی رہو، آمین

ثناء کنول اللہ دتہ۔ لودھراں

☆.....

ریمل آرزو، صبا سحر، دھنک ناز، اب تم تینوں ردا میں
 جلدی سے اپنی کہانی بھیج جو سدا خوش رہو، آمین۔ ملا لہ
 اسلم و یلکم ہوم ردا میں و یلکم ہر مہینے انٹری مارا کرو۔
 میری پیاری سی دوست ملا لہ اسلم خوش رہو۔ کشف
 ضیاء میری کیوٹ سی دوست ہاؤ آر یو؟ تم مجھے بہت
 عزیز ہو اے کاش میں تم سے مل سکتی بٹ اس او کے
 ملوں نہ ملوں ہم دوست تو ہیں ہی ناں؟ ثناء خادم مجھے
 یقین ہی نہیں آیا کہ تمہاری شادی ہو گئی سے مبارک
 ہو بھئی۔ پر تم نے مجھے اپنی شادی میں بلایا بھئی نہیں تو
 تھوڑا دکھ ضرور ہوا، خیر خوش رہو۔ ایک نام جو میری
 خوشی سے عائشہ عبدالقیوم تم نے مجھے میری دوستی کا
 جواب بھی نہیں دیا تو کوئی بات نہیں بس تم خوش رہو
 اچھا اچھا لکھتی رہو، آمین۔ حناء کنول شہزاد میری پیاری
 بہن سدا خوش رہو۔ تمہارا بیٹا ابراہیم 24 فروری کو پیدا
 ہوا ہے تو میری طرف سے ڈھیڑوں مبارک باد قبول
 ہو، اوکے۔“

ثناء کنول اللہ دتہ۔ لودھراں

اپنی بہنوں کے نام

میری اور انعم کی طرف سے ہماری دونوں
 سوئیٹ، کیوٹ، لٹل سی سسٹرز ماریہ اینڈ کائنات کو
 سالگرہ بہت بہت مبارک ہو دونوں کے اس اہم اور
 خوب صورت دن پر چند الفاظ ان کے اس اہم دن پر
 نذر کرتی ہوں۔

Happy Birth day my little sisters

اس خوب صورت دن کے طلوع ہونے پر

بے ساختہ اک دعا لبوں سے آزاد ہوئی

تم جو ہزاروں سال

سال کے دن ہو پورے پچاس ہزار

تمہیں خوشیاں ملیں بے حساب

کوئی تم کو کبھی نہ ستائے

تمہاری زیست کا ہر لمحہ مسکرائے

تم ہر قدم پر آباد رہو شاد رہو

ردا انجسٹ 221 دسمبر 2015ء

READING
 Section

کچھ

چینی، کچھ ڈالیں ایک اباں آئے تو بند گوبھی، گاجر، ہری پیاز، شملہ مرچ، ادراک، شلجم ڈالیں 5 منٹ پکا کر کارن فلور پانی میں مکس کر کے ڈالیں۔ گاڑھا ہونے پر چولہا بند کر دیں اور انڈے مکس کر دیں۔ ڈھکن ڈھک کر دو منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔ سرنگ باؤل میں نکال کر گرم گرم پیش کریں۔

انڈے والا چکن سوپ

اجزاء

- چکن : ایک کپ
 بیخنی : چار کپ
 سیاہ مرچ پاؤڈر : حسب ذائقہ
 نمک : حسب ذائقہ
 چائینز سالٹ : آدھا چائے کا چمچہ
 انڈے (ابلے ہوئے) : تین چار عدد
 کارن فلور : پون کپ
 پانی : آدھا کپ

ترکیب: چکن کو اباں کر چھوٹے ٹکڑے کر لیں۔ انڈے کاٹ کر رکھیں۔ چکن بیخنی میں نمک، چائینز، نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر اور تھوڑی چکن ڈال کر اباں لیں۔ کارن فلور پانی میں مکس کر کے سوپ میں ڈالیں۔ گاڑھا ہونے پر چولہا بند کر دیں۔ سوپ ڈش میں سوپ نکالیں سوپ کے اوپر باقی بیخنی ہوئی چکن اور انڈے ڈالیں اور گرم گرم پیش کریں۔

چکن ہاٹ اینڈ ساور سوپ

اجزاء

چکن (بون لیس) : ایک کپ (لمبائی میں کاٹ لیں)

بند گوبھی (لمبائی میں کاٹ لیں) : ایک کپ
 گاجر (لمبائی میں کاٹ لیں) : آدھا کپ
 ہری پیاز (آدھا انچ کے : آدھا کپ
 اسٹریپس)

شملہ مرچ (لمبائی میں کاٹ لیں) : آدھا کپ
 ادراک (لمبائی میں کاٹ لیں) : ایک کھانے کا چمچہ
 شلجم (لمبائی میں کاٹ لیں) : ایک عدد

کچھ : ایک کپ
 نمک : حسب ذائقہ

سفید مرچ پاؤڈر : آدھا چائے کا چمچہ
 چلی سوس : ایک کھانے کا چمچہ

سرکہ : دو چائے کے چمچہ
 سویا ساس : ایک کھانے کا چمچہ

چینی : ایک کھانے کا چمچہ
 بیخنی : چھ کپ

انڈے (پھینٹ لیں) : دو عدد
 کارن فلور : آدھا کپ

پانی : آدھا کپ

ترکیب: بیخنی میں چکن ڈال کر 5 منٹ پکائیں اور نمک، سفید مرچ پاؤڈر، چلی سوس، سرکہ، سویا سوس،

چکن نوڈلز سوپ

فریج بینز : آٹھ عدد
ترکیب: سوس پین میں یخنی میں چکن ڈال کر
پکائیں چکن گل جائے تو نمک، سفید مرچ پاؤڈر،
چینی، چائیز، نمک اور فریج بینز ڈالیں۔ پانچ منٹ
پکا کر انڈے ڈالیں۔ سر ونگ ڈش میں نوڈلز ڈالیں
اس پر چکن سوپ ڈالیں۔ ابلے ہوئے انڈوں کے
ساتھ سرو کریں۔

چائیز سوپ

اجزاء:
چکن (بون لیس) : آدھا کلو
کارن فلور : کھانے کے تین چمچے
پیاز : ایک عدد (باریک کٹی ہوئی)
انڈے : دو عدد (صرف سفیدی)
کالی مرچ : چائے کا ایک چمچ
چائیز نمک : کھانے کا ایک چمچ
ہری مرچ : دو عدد
سویا ساس : کھانے کا ایک چمچ
نمک : حسب ذائقہ

ترکیب: مرغی کے پیس اچھی طرح دھولیں۔
ایک ساس پین میں مرغی، باریک کٹی ہوئی پیاز، سیاہ
مرچ، نمک اور پانی ڈال کر یخنی تیار کریں۔ گوشت
گل جائے تو یخنی چھان کر الگ نکال لیں۔ ابلی ہوئی
بوٹیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں۔ ایک
پپالی پانی میں کارن فلور کو اچھی طرح سے حل کریں۔
یخنی میں کارن فلور کا آمیزہ اور چھوٹے چھوٹے
گوشت کے ٹکڑے ڈال کر دھیمی آنچ پر چند منٹ تک
پکائیں۔ جب سوپ آپ کی پسند کے مطابق گاڑھا
ہو جائے تو انڈے کی سفیدی ملا دیں اور چمچے سے
سوپ میں خوب اچھی طرح مکس کریں، مزے دار
چائیز سوپ تیار ہے۔

رداڈ انجسٹ 223 دسمبر 2015ء

اجزاء
چکن (لسبائی میں کاٹ : ایک کپ
لیں)
نوڈلز (ابلے ہوئے) : ایک کپ
چائیز سالٹ : آدھا چائے کا چمچ
سرکہ : ایک چائے کا چمچ
چکن یخنی : چار یا چھ کپ
نمک : حسب ذائقہ
سفید مرچ پاؤڈر : آدھا چائے کا چمچ
کارن فلور : ایک کھانے کا چمچ

ترکیب: چکن کی ہڈیوں میں آٹھ کپ پانی ڈال
کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ چھ کپ یخنی رہ جائے تو یخنی کو
چھان لیں۔ یخنی میں چکن کے ٹکڑے ڈال کر پانچ
منٹ پکائیں اور نمک، سفید مرچ پاؤڈر، سرکہ، چائیز
سالٹ اور نوڈلز ڈال کر دو منٹ پکائیں۔ کارن فلور
تھوڑے پانی میں گھول کر سوپ میں ڈالیں گاڑھا
ہونے پر سوپ کو سر ونگ ڈش میں نکال لیں اور سوسز
کے ساتھ سرو کریں۔

چکن بینز اینڈ نوڈلز سوپ

اجزاء
چکن : ایک کپ (کیوبز،
بون لیس)
انڈے (پھینٹ لیں) : دو عدد
سفید مرچ پاؤڈر : آدھا چائے کا چمچ
چکن یخنی : چار کپ
انڈے : دو عدد (ابلے ہوئے)
چائیز نمک : آدھا چائے کا چمچ
نوڈلز (ابلے ہوئے) : آدھا پیکٹ
نمک : حسب ذائقہ
چینی : ایک چائے کا چمچ

READING
Section

میں پیاز نرم ہونے تک فرائی کریں اور چقندر ڈالیں۔
 فرائی کر کے ایک کپ بیخنی ڈالیں۔ ہلکی آنچ پر پکائیں۔
 چقندر نرم ہو جائیں تو بلینڈر میں پیس لیں اور دوبارہ سوس
 پین میں ڈال کر بیخنی میں شامل کر کے پکائیں۔ نمک،
 سفید مرچ پاؤڈر، کارن فلور ڈالیں گاڑھا ہونے پر آدھی
 کریم مکس کر دیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر بانی کریم
 ڈال کر سرو کریں۔

تھائی سوپ

اجزاء
 چکن (بون لیس) : ایک پاؤ
 چکن ہڈیوں کی بیخنی : پانچ یا چھ کپ
 (ادرک کا ٹکڑا، گاجر
 ڈال کر پکائیں)
 چاول (اُبلے ہوئے) : ایک کپ (فرائی
 کر لیں)
 ہری مرچیں : پانچ چھ عدد (لمبائی
 میں دو کر لیں جج
 نکال لیں)
 نمک : حسب ذائقہ
 لیموں کارس : آدھا کپ
 ادرک (سلائس کر لیں) : پون کپ
 سیاہ مرچیں (کٹی ہوئی) : حسب ضرورت
 ترکیب: چکن کی ہڈیوں میں 8 کپ پانی،
 ادرک کا ٹکڑا اور ایک گاجر ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔
 پانچ چھ کپ بیخنی رہ جائے تو بیخنی چھان لیں اور بیخنی
 میں چکن ڈال کر پکانے رکھ دیں۔ چکن گل جائے تو
 نمک، ہری مرچیں، ادرک، لیموں کارس ڈال کر پانچ
 منٹ پکائیں ابلے چاول کو کرپسی فرائی کر لیں اور ٹشو پر
 نکال لیں۔ سرونگ ڈش میں فرائی کیے ہوئے چاول
 ڈالیں اوپر سے سوپ اور سیاہ مرچ پاؤڈر ڈال کر پیش
 کریں۔

☆.....

عربین سوپ

اجزاء:
 سفید لوبیا : سوا پیالی
 مغز بادام : ایک پیالی
 لہسن : پانچ جوے (پسا ہوا)
 زیتون کا تیل : کھانے کے دو چمچے
 ڈبل روٹی : دو سلائس
 نمک : حسب ذائقہ
 پودینہ : چند پتیوں یا حسب ضرورت
 سفید زیرہ : کھانے کا ایک چمچ
 کالی مرچ : کھانے کا ایک چمچ
 ترکیب: لوبیا کو ابال لیں، جب گل جائے تو
 چھلنی میں ڈال کر پانی نکال کر رکھ لیں۔ پے ہوئے
 باداموں میں پسا ہوا لہسن، اچھی طرح ملا دیں۔ لوبیا
 کے پانی میں زیتون کا تیل ملا لیں۔ لہسن اور بادام والا
 آمیزہ شامل کر کے خوب پکائیں۔ جب گاڑھا ہونے
 لگے تو لوبیا، نمک، پسا ہوا مصالحہ اور پودینے کے پتے
 شامل کر کے پیالی میں ڈالیں اور نوش کریں۔

چقندر کریمی سوپ

اجزاء
 چقندر (چوپ کر لیں) : دو عدد
 کریم : آدھا کپ
 نمک : حسب ذائقہ
 مکھن : ایک چائے کا چمچ
 بیخنی : دو سے تین کپ
 پیاز : دو کھانے کے چمچے
 سفید مرچ پاؤڈر : آدھا چائے کا چمچ
 کارن فلور : ایک کھانے کا چمچ
 ترکیب: ایک سوس پین میں مکھن گرم کریں۔ اس

سنگھار

سے بھی پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ اس طرح جلد پھٹنے اور متاثر ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق چہرے کی صفائی کے لیے بیسن کا لیپ بہترین طریقہ ہے جس سے چہرہ چکنائی سے پاک اور فریش ہو جاتا ہے اگر کسی شخص کی جلد قدرتی طور پر خشک ہو تو اس کے لیے صابن سے پاک موچر انڈر کا استعمال بھی فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ جن لوگوں کی جلد نازک ہوتی ہے سردیوں کے موسم میں ان کے ہاتھوں کی جلد بہت اترتی ہے اس کے لیے ایک گلاس گلاب کے عرق میں دو چمچے گلیسرین ایک بڑے لیموں کا رس ملا کر کسی بوتل میں محفوظ کر لیں رات کو سوتے وقت مساج کریں اور صبح دھولیں اور کوئی اچھا سالوشن لگالیں۔

سردیوں میں جلد کو تروتازہ اور شاداب رکھنے کے لیے رات کو سوتے وقت معیاری کولڈ کریم اور موچر انڈر کا استعمال کرنے سے جلد میں ضروری نمی برقرار رہتی ہے اور یہ طریقہ اسے سرد موسم کے اثرات سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔ ماہرین کے مطابق سرد موسم میں جلد کو تروتازہ رکھنے کے لیے زیادہ پانی پینا چاہیے۔ سردیوں میں مالٹے، سنگترے، گاجر، مولیٰ اور دیگر موسمی پھلوں سے بھی جسم میں پانی کی کمی پوری کی

سردیوں کی آمد کے ساتھ ہی ہوا میں نمی کا تناسب کم ہو جاتا ہے۔ جس کا اثر ہماری جلد پر پڑتا ہے اور جلد کھردری اور خشک ہونے کے ساتھ پھٹنے لگتی ہے۔ ماہرین کے مطابق سرد موسم میں جلد کی حفاظت پر تھوڑی سی توجہ دے کر اس کی خوب صورتی اور نکھار میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ ماہرین امراض جلد کے مطابق زیادہ دیر تک گرم پانی سے نہانا بھی خشکی کا باعث بنتا ہے اس لیے سرد موسم میں غسل کرتے وقت اس بات کا دھیان رکھیے کہ پانی نیم گرم ہو اور غسل کا دورانیہ بھی دس منٹ سے زیادہ نہ ہو اس کے علاوہ جلد کی حفاظت کے لیے نہانے سے پہلے پانی میں بے بی آئل یا کوئی تیل لے کر اس کے چند قطرے ڈال دیں اور سرسوں (کھوپرے کے تیل سے جسم پر مالش کریں یہ طریقہ جلد کو شاداب رکھنے میں انتہائی معاون ہوتا ہے اس کے علاوہ نہانے کے بعد بدن اچھی طرح خشک کر لیں اور کسی اچھے سے ہاڈی لوشن سے مساج کریں روزانہ رات سونے سے قبل منہ دھو کر اچھی سی کولڈ کریم لگانا بھی فائدہ مند ہے۔

سردیوں میں صابن کا استعمال کم کرنا چاہیے کیونکہ اس سے جلد کی قدرتی نمی میں کمی ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ صابن کو جسم پر زیادہ رگڑنے

جاسکتی ہے اور پانی سے ہم اپنی جلد کے لیے ضروری نمی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس طرح جلد کی شادابی برقرار رہتی ہے اور جلد موسم کے اثرات سے محفوظ رہتی ہے۔

موسم کوئی بھی ہو پانی جسمانی درجہ حرارت کو اعتدال میں رکھتا ہے جدید دنیا میں ماحولیاتی آلودگی کی وجہ سے ہماری جلد متاثر ہوتی ہے جسم اور چہرے کی جلد کو تروتازہ رکھنے کے لیے زیادہ پانی پینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پانی پینے سے چہرے پر خاص قسم کی چمک آجاتی ہے جس سے آپ کی جلد تازہ اور خوب صورت نظر آتی ہے اور چہرے کے کیل مہاسوں کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے اور چہرہ نکھرا سا نظر آتا ہے۔ چہرے اور ہاتھوں میں پانی پینے سے نمی برقرار رہنے میں مدد ملتی ہے جس کے لیے اکثر لوگ موچرا نزرنگ لوشن، کریم اور شیپو استعمال کرتے ہیں۔

ماہرین روزانہ 10 سے 12 گلاس پینا لازمی قرار دیتے ہیں۔

جلد کو نرم و ملائم بنانے کے ساتھ ساتھ اچھی غذا بھی ضروری ہے۔ شہد، پھل اور لیموں میں تقریباً وہ تمام اجزاء موجود ہوتے ہیں جو نہ صرف انسانی نشوونما، بلکہ افزائش حسن کے لیے اہم ہیں لہذا اپنی جلد کی حفاظت باقاعدگی سے کریں، تاکہ حسن و صحت برقرار رہ سکے۔

جلد کو نرم و ملائم رکھنے کے لیے روزانہ رات کو روغن زیتون میں لیموں کا رس ملا کر چہرے اور گردن کی مالش کریں اور صبح منہ دھولیں۔

بدن کے داغ دھبوں پر عرق گلاب 100 ملی لیٹر میں لیموں کے رس کے دو چائے کے چمچے

ملا کر چند دن مالش کریں۔ جلد صاف ہو جائے گی۔

کھیرا جلد کے لیے بہترین ہے۔ کھیرے کے پتلے ٹکڑوں کو اپنے چہرے پر لگائیں اور کچھ دیر آرام کریں تاکہ کھیرے میں موجود قدرتی تیل کو جلد اپنے اندر جذب کر لے۔

کچا دودھ رات کو سونے سے پہلے چہرے پر لگائیں اور آدھے گھنٹے کے بعد دھولیں۔ چہرہ نرم اور ملائم ہو جائے گا۔

پے ہوئے بادام لیں، ایک چمچ عرق گلاب شہد ایک چمچ ملا کر چہرے پر لگائیں اور نیم گرم پانی سے چہرہ دھولیں۔

دہی میں لیموں کا پانی ملا کر چہرے پر لگائیں۔ ایک خاص قسم کی چمک، دل کشی اور تازگی محسوس ہوگی۔

دال مسور، گائے کے دودھ اور کیلے کے گودے کے ساتھ پیس کر ابٹن کی طرح تین دن تک لگانے سے مہاسے دور ہو جاتے ہیں۔

گندھک کو دودھ میں بھگو دیں۔ سوتے وقت چہرے پر لگا کر مساج کریں، صبح کچے دودھ میں پانی ڈال کر منہ دھولیں۔

سگترے کے چھلکوں کا ایک چمچ سفوف، عرق گلاب میں ملا کر چہرے پر لگانے سے جھائیاں دور ہو جائیں گی اور جلد ملائم و پرکشش نظر آئے گی۔

عرق گلاب میں چائے کے چار چمچے، گلیسرین اور لیموں کا رس دو دو چمچے ملا لیں، منہ دھونے کے بعد چہرے اور ہاتھوں پر لگائیں۔

☆.....